اسلامی ثقافت

اور

ندوۃ العلماء

مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی

ناشر

مکتبۃ الشباب العلمیۃ، لکھنو

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

طبع دوم

سنہ اشاعت: ۱۴۳۵ھ مطابق ۲۰۱۴ء

سلسلہ اشاعت نمبر ۸۶

نام کتاب:	اسلامی ثقافت اور ندوۃ العلماء
نام مؤلف:	مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی
کمپوزنگ:	محمد اسماعیل، عبدالعلیم رشید
تعداد صفحات:	۲۶۴
تعداد اشاعت:	۱۰۰۰
قیمت:	Rs.180/-

باہتمام

محمد ریان بھٹکلی ندوی

ملنے کے پتے

(۱) مکتبہ فردوس مکارم نگر، لکھنؤ

(۲) مکتبہ ندویہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

(۴) مکتبہ دارین۔ لکھنؤ

(۵) مکتبہ احسان مکارم نگر لکھنؤ

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامِ

''یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے''

(آل عمران: ۱۹)

اسلامی ثقافت

اور

ندوۃ العلماء

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

عناوین	صفحہ
عرض ناشر	۱۱
مقدمہ از: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء	۱۵
تقریظ مولانا سید محمد واضح رشید صاحب حسنی ندوی معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	۱۸
پیش لفظ	۲۲
باب اول اسلامی ثقافت کا بنیادی سرچشمہ: قرآن کریم	
اسلامی ثقافت	۲۹
ثقافت کے لغوی اور اصطلاحی معنی	۲۹
اسلامی ثقافت کا مفہوم	۲۹
اسلامی ثقافت کی بنیاد	۳۰
قرآن کریم اور ہماری ذمہ داریاں	۳۱
قرآن کریم کی چند خصوصیات	۳۲
کچھ اعجاز اور تراجم قرآن کے بارے میں	۳۴
فن شاعری میں عربوں کی بے مثال مہارت	۳۵
شعر جاہلی کے خلاف مستشرقین کی ناتمام کوشش	۳۶
قرآن ایک زندہ جاوید کتاب	۳۷
قرآن کا تربیتی پہلو	۳۸

قرآنی قصوں کی اہمیت اوران کا اسلوب	۳۹
ترجمہ قرآن اوراس کی نزاکتیں	۴۰
قرآن کریم سے استفادے کی بنیادی شرائط	۴۳
تراجم قرآن میں اپنے اپنے دور کا عکس	۴۴
اسلامی قصہ: مقصدیت اور فنی حسن و جمال کا مظہر (سورۂ یوسف کی روشنی میں)	۵۰
باب دوم قرآن کریم کی تعلیمات کا عالمی مرکز: ندوۃ العلماء	
عصرحاضر میں ندوۃ العلماء کا قائدانہ کردار	٦۹
ندوۃ العلماء کے قیام کا پس منظر	٦۹
مقاصد ندوۃ العلماء	٦۹
عربی زبان وادب کی تعلیم	۷۰
عربی صحافت اور ندوۃ العلماء	۷۱
ندوۃ العلماء اوراس کے تعلیمی وانتظامی شعبہ جات:	۷۲
(۱)كلية الشريعة وأصول الدين	۷۲
(۲)كلية اللغة العربية وآدابها	۷۲
(۳)كلية الدعوة والاعلام	۷۲
(۴) المعهد العالي للدعوة والفكر الاسلامي	۷۳
(۵)المعهد العالي للقضاء والافتاء	۷۳
(٦)المجمع العلمي للدراسات القرآنية والحديثية	۷۳
(۷)القسم الدراسي الخاص باللغة العربية	۷۴
(۸)معهد دار العلوم	۷۴

(۹)معهد تحفیظ القرآن	۷۴
(۱۰)شعبۂ تجوید و قرأت	۷۴
(۱۱)عالمی رابطہ ادب اسلامی	۷۵
(۱۲)۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام	۷۵
(۱۳)مجلس صحافت ونشریات	۷۵
(۱۴)شعبۂ دعوت وارشاد	۷۶
(۱۵)شعبۂ اصلاح معاشرہ	۷۶
(۱۶)شعبۂ تعمیر وترقی	۷۶
(۱۷)شعبۂ انٹرنیٹ	۷۶
(۱۸)میڈیا ریسرچ سینٹر	۷۶
ندوۃ العلماء کی عصری معنویت	۷۷
تحریک ندوۃ العلماء اور عقیدۂ ختم نبوت	۷۷
ندوۃ العلماء کا قیام: امداد غیبی	۸۱
باکمال اساتذہ	۸۱
حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ	۸۲
قرآن کریم سے ان کا شغف	۸۳
عربی زبان وادب میں امتیاز	۸۴
علامہ سید سلیمان ندویؒ	۸۵
سید صاحب اور تفسیر قرآن	۸۶
مولانا محمد اویس نگرامی ندویؒ	۸۷
جرمنی مستشرق نولڈیکی کی جہالت اور اس کا جواب	۸۸
دارالعلوم میں مولانا نگرامیؒ کا درس قرآن	۹۰

مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ	۹۰
ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندویؒ	۹۱
حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی ایک گرانقدر تصنیف	۹۲
امانت کا قرآنی تصور	۹۳
قرآن اور علوم قرآن پر فضلائے ندوہ کی تصانیف	۹۴
ابنائے ندوہ کے قرآنی مضامین ومقالات	۹۷
باب سوم اسلامی ثقافت: وسائل وحقائق	
تاریخی معلومات اور فکری رجحانات سے واقفیت	۱۰۳
تاریخ کی اہمیت قرآن کی نظر میں	۱۰۴
چند قابل ذکر نقاط	۱۰۴
موضوع سے متعلق اہم کتابیں	۱۰۶
تاریخی اور فکری معلومات کی اہمیت	۱۰۹
جاہلیت سے اسلام کی طرف منتقلی کا عمل	۱۱۱
زبان وادب ثقافت ودعوت کا مؤثر ترین ذریعہ	۱۱۴
عربی زبان وادب اور ندوۃ العلماء	۱۲۴
ہندوستان کا مقام علوم وفنون کی تاریخ میں	۱۲۴
ہندوستانی مسلمانوں کا عربی زبان سے ربط	۱۲۴
ادبی بیداری کے آثار اور ندوۃ العلماء کی بنیاد	۱۲۵
ندوۃ العلماء کا عربی سے تعلق	۱۲۵
ندوۃ العلماء کا انقلابی اقدام	۱۲۶
ہندوستان میں عربی ادب کا پہلا رجحان	۱۲۶

ندوۃ العلماء میں عرب ادباء کی آمد	۱۲۷
''الضیاء'' میگزین کا اجراء	۱۲۸
''الضیاء'' کے اجراء کے اسباب	۱۲۸
علامہ سید سلیمان ندویؒ کے اداریہ کے بنیادی نکات	۱۳۱
مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور ندوۃ العلماء	۱۳۱
ماہر ادباء اور قابل ذکر شخصیات	۱۳۲
ندوۃ العلماء اور عالم عربی	۱۳۳
قواعد نحو وصرف اور ان کا طریقۂ تدریس	۱۳۹
بلاغت: نظریہ اور فن	۱۵۰
اسلامی ادب اور کچھ غیر اسلامی نظریئے	۱۵۷
مذہب اور ادب	۱۵۷
ادب کا مفہوم اور اس کا مقصد	۱۶۰
ادب نہیں، بلکہ فن	۱۶۰
اسلام اور آداب زندگی	۱۶۱
اسلام ادب کے ہم معنی	۱۶۲
ادب ایک خالص اسلامی اصطلاح ہے	۱۶۳
اسلامی ادب کی ہمہ گیری	۱۶۴
اسلامی ادب کے واضح خدوخال	۱۶۵
اسلامی ادب کے عناصر ترکیبی	۱۶۷
اسلامی ادب کی تقلید	۱۶۸
اسلامی ادب میں التزام	۱۶۹
کچھ مغرب کے ادبی نظریات کے بارے میں	۱۷۱

کلاسیکی ادب	۱۷۱
رومانٹیکی ادب	۱۷۳
رمزیت کا ادب	۱۷۳
سریالزم	۱۷۴
وجودی ادب کا نظریہ	۱۷۴
پرناسی ادب	۱۷۶
جدیدیت کا نظریہ	۱۷۷
جدیدیت کا خاص مقصد	۱۷۷
جدیدیت کے نام پر اباحیت	۱۷۸
عربی اور اردو میں نعتیہ شاعری: چند مثالیں	۱۸۰
باب چہارم اساطین ندوۃ العلماء	
حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ اور ندوۃ العلماء	۱۸۷
علامہ سید عبدالحی حسنیؒ عالم، محقق اور ادیب	۱۹۳
علامہ شبلیؒ اور ندوۃ العلماء	۲۰۹
علامہ سید سلیمان ندویؒ ندوۃ العلماء کے ایک اہم ترین رکن	۲۲۷
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اپنی شخصیت کے آئینہ میں	۲۳۸
حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی بحیثیت ناظم ندوۃ العلماء	۲۵۶
اختتامیہ	۲۶۴

عرض ناشر

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم ، أما بعد:

اسلام ایک مکمل دین اور مستقل تہذیب ہے ،اللہ رب العزت نے اس کو تمام انبیائے کرام کا حقیقی مذہب قرار دیا ہے،اگر چہ ان کی شریعتیں مختلف تھیں،اور احکام وقوانین میں کچھ فرق رہا،لیکن اصول میں تمام انبیاء ایک نقطہ پر متحد رہے،اسی حقیقت کی وضاحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ اس طرح فرمائی ہے:نحن معشر الأنبياء ، اخوة علات ، ديننا واحد۔ہم انبیاء کی جماعت علاتی بھائی ہیں،یعنی شریعتیں مختلف،اور دین ایک ہے۔

اسلام کے معنی اطاعت اور بندگی کے ہیں،نہ اپنا کوئی ارادہ اور نہ اپنی خواہش،بس اللہ رب العزت کا حکم،اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی پیروی،اسی کا نام رب چاہی زندگی ہے،اس کے برخلاف سراسر کفر ہے،تمرد ہے،اور نفاق ہے،حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اشارۂ غیبی پا کر جب اپنے فرزند ارجمند کو قربان کرنے کا تاریخ ساز کردار ادا کیا تو غیب سے ان کو خلیل اللہ کا خطاب ملا،گویا یہ اسلام کا پہلا مظہر تھا جو تاریخ انسانیت میں سامنے آیا۔

دیگر مذاہب کے درمیان اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اعتدال ووسطیت کا مذہب ہے اعتدال سے قوموں کی زندگی کامیابی سے ہم کنار ہوتی ہے،اور بے اعتدالی سے ناکامی ان کے حصہ میں آتی ہے،آسمانی کتابوں کی حامل اقوام نے جب اعتدال کو پس پشت ڈالا تو ان میں سے ایک کو ''گمراہ'' اور دوسرے کو ''لعنت وغضب کا مستحق'' گردانا گیا،یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بہت سی احادیث میں اعتدال کو اختیار کرنے کی طرف

توجہ دلائی ہے، صحیح بخاری کی روایت میں آیا ہے کہ کلفوا من الأعمال ماتطیقون (اتنا ہی عمل کا التزام کرو جتنا کرسکو) اور مسند بزار میں ہے: ماأحسن القصد فی الغنی ، وما أحسن القصد في الفقر ، وما أحسن القصد في العبادة (دولتمندی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے محتاجی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے، عبادت میں درمیانگی کتنی اچھی ہے)، اسلام کا یہ امتیاز اس کی ثقافت کا جزء ہے، جو تہذیب اور معاشرت اس طرز پر قائم ہوگی، وہ متنوع خوبیوں کا مجموعہ ہوگی۔

ہمارے لئے بڑی سعادت کی بات ہے کہ ہمیں مخدوم گرامی قدر حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتہم کی وقیع کتاب ''اسلامی ثقافت اور ندوۃ العلماء'' پر ابتدائیہ لکھنے کی توفیق حاصل ہورہی ہے، پیش نظر کتاب اپنے موضوع پر منفرد ہے، تاریخ ندوہ، اور تعارف ندوہ کے حوالے سے تو کئی چھوٹی، بڑی کتابیں زینت کتب خانہ ہیں، لیکن ندوۃ العلماء کے تعلق سے مستقل اسلامی ثقافت کو موضوع بنا کر پہلی بار اس طرح کی کتاب لکھی گئی ہے، اس میں اسلامی ثقافت کے اصول کا تذکرہ ہے اور ان کے حامل ادارہ ندوۃ العلماء پر مؤلف محترم کا خلاصۂ مطالعہ بھی ہے، اس طرح یہ کتاب نظریہ وعمل کی جامع ہے، اسلام کی آفاقی تعلیمات کی تبلیغ اور ان میں اعتدال کی نشر واشاعت میں تحریک ندوۃ العلماء اور اس کے نمائندہ علماء کو جو امتیاز حاصل ہے وہ تاریخ کا ایک زریں باب ہے ضرورت تھی کہ اس موضوع پر کچھ لکھا جاتا، خوشا نصیب کہ مخدوم گرامی قدر حفظہ اللہ ورعاہ نے اس پر قلم اٹھایا اور حق ادا کردیا۔

مولانا موصوف کا قلم شاداب، نگاہ بلند، فکر ارجمند اور قلب دردمند ہے، وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس پر سیر حاصل بحث کرکے اس کو ذہن سے قریب کردیتے ہیں، تاریخ وادب، تہذیب وثقافت، شعر وشاعری، سیرت وسوانح، اور حالات حاضرہ، ان تمام فنون میں آپ کا انداز نگارش بڑا اچھوتا ہے، نہ مشکل الفاظ اور نہ بیجا تعبیرات کا استعمال، موضوع کیسا ہی ہو، مولانا محترم کے قلم کی سلاست سے اس کے اندر خاص کشش پیدا ہوتی

ہے، مولانا محترم کی اس سے پہلے کئی کتابیں اردو اور عربی میں منظر عام پر آچکی ہیں۔ عربی میں آپ کا اسلوب بقول ایک مشہور ادیب: ''اپنے استاد و مربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی پرسوز زبان'' کے اثر سے متصف ہے، اردو میں آپ کا اسلوب ادبائے اردو ادب کے اسالیب کا مجموعہ اور ان کا چربہ ہے، گویا آپ نے تمام مکاتب و مسالک سے استفادہ کر کے ایک ایسا آمیزہ تیار کیا ہے جو ہر ذوق کے قارئین کیلئے باعث تسکین ہے۔

آج مسلم قوم میں اسلامی ثقافت سے بیزاری کا جو ماحول پیدا ہو گیا ہے اور بعض افراد بالخصوص نوجوان طبقہ مغربی تہذیب کو نمونہ کی تہذیب اور کلچر تصور کرنے لگا ہے، اس تناظر میں مولانا کی یہ کتاب وقت کی ضرورت ہے۔

ندوۃ العلماء کی عالی فکر جن بنیادوں پر قائم ہے اس کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ آج محسوس کی جارہی ہے، اعتدال مسلم معاشرہ سے تقریباً مفقود ہو چکا ہے، اتحاد کا نام ونشان نہیں، ملت کی شیرازہ بندی کرنا ایک مشکل ترین امر ہو گیا ہے۔ ایسے حالات میں ندوۃ العلماء کی تابندہ فکر اور اس کے عالی مقام حاملین کی کوششوں کا تذکرہ اس بگڑے ہوئے ماحول کیلئے خضر راہ ثابت ہوگا۔ مولانا نے اسی ضرورت کے پیش نظر یہ کتاب لکھی ہے۔

مولانا محترم کی تقریر وتحریر کا مرکزی موضوع اسلام کی حقانیت وصداقت ہوتا ہے، آپ اسلام کو معاشرہ کے اندر مجسم شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں، اسی لئے اسلام کے محاسن پر جب آپ کا اشہب قلم چلتا ہے تو اس میں ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کا عنصر نمایاں ہوتا ہے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن حسنی ندویؒ نے مولانا موصوف کی کتاب ''شعراء الرسول في ضوء الواقع والقريض'' کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے کہ: ''موصوف کی یہ کتاب تاریخ وتنقید کی ایک دستاویز ہے، کم سے کم درجہ یہ ہے کہ اس پر موصوف کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی جائے''، آپ کی ایک کتاب ''اسوۂ حسنہ کے آئینہ میں'' ہے، بقول حضرت مولانا عبداللہ عباس ندویؒ ''یہ کتاب مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کے جذبۂ ایمانی اور سرمایۂ محبت کی علامت ہے''، دوسری کتاب ''اسلام اور مغرب'' ہے، اس میں پروفیسر محمد وصی صدیقیؒ

(سابق نائب ناظم ندوۃ العلماء) نے مولانا موصوف کے قلم کی تعریف کی ہے اور آپ کو عالم اسلام کا ایک متبحر عالم، شاندار معلم، مؤرخ اور مفکر قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''مولانا کو تحریر کا جو ملکہ ودیعت ہوا ہے، وہ محض ایک ہنر نہیں، بلکہ ایک وجدانی قوت ہے، یہ مصنف کے علم، روح کی پاکیزگی اور قوت بصیرت کی آئینہ دار ہے''۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالی مولانا موصوف کا سایہ تادیر ہم پر قائم رکھیں اور ان کے فیوض و برکات سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کا موقع ہم کو عنایت فرمائیں۔ آمین۔

مخلص

سید محمد ہاشم ندوی

مکتبہ جمعۃ الماجد للثقافۃ والتراث

دبئی، متحدہ عرب امارات

۲۰/۵۲/۱۴۳۵ھ

۲۴/۱۰/۲۰۱۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین سیدنا محمد الصادق الأمین وعلی آلہ وصحبہ أجمعین ، أما بعد :

ندوۃ العلماء کا قیام اسلامی تعلیمی وتربیتی تحریک کی حیثیت سے آج سے سوا سو سال قبل ۱۳۱۱ھ میں عمل میں آیا تھا، اُس وقت کے حالات دیکھ کر اُس وقت کے مستند علمائے دین اور مسلم دانشور حضرات کو یہ احساس ہوا تھا کہ مغربی استعمار کے سیاسی وحکومتی غلبہ سے مسلمانوں میں احساس شکست وناکامی کی صورت میں مسلمانوں کی سیاسی وحکومتی شکست کے ساتھ ان کے دینی علوم اور اسلامی ثقافت کو بھی خطرہ پیش آ گیا ہے، اس میں مسلمانوں کو سیاسی وحکومتی سطح پر تدارک واصلاح کی صورت تو بہت دشوار ہوگئی ہے، لیکن تعلیمی اور تربیتی سطح پر تدارک کا موقع ابھی ہاتھ سے نہیں گیا ہے، چنانچہ ملک کی صاحب اثر ورسوخ اور دینی وملی درد رکھنے والی شخصیتوں نے جن کا ملت کے مختلف مکاتب فکر سے تعلق تھا اپنے اپنے طور پر تعلیم وتربیت گاہوں کے قیام کا راستہ اختیار کرنے کی کوششیں کیں، اسی ضمن میں پھر دینی علوم کو بچانے اور قائم رکھنے کی بھی فکر کی، اسی سلسلہ میں علوم دینیہ کی تعلیم کے ساتھ اجتماعی زندگی سے گہرا تعلق رکھنے والے علوم سے بھی واقف کرانے کی ضرورت بھی محسوس کی، تاکہ ملت اسلامیہ کی دینی وثقافتی خصوصیات کی بھی حفاظت کی جا سکے، اسی کے ساتھ مسلمانوں میں جو گروہ بندیاں اور مصلحتی ٹکراؤ ہے اس کو دور کرنے کی کوشش کی جائے، اور پوری امت

اسلامیہ اپنی ملی وحدت قائم رکھ سکے، اس کوشش کے لئے ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں لایا گیا تھا، اور تعلیم وتربیت کے لئے ایک تعلیم گاہ دارالعلوم کے نام سے لکھنؤ ہی میں قائم کی گئی، جسے دارالعلوم ندوۃ العلماء کہتے ہیں، گذشتہ سوا سو سالہ مدت میں ندوۃ العلماء نے اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے ممکنہ حد تک کام انجام دیا، دینی علوم کو پوری طرح قائم رکھتے ہوئے نصاب تعلیم میں ضروری اجتماعی مضامین داخل کئے، اور خطرات سے واقف کرانے کے لئے جن معلومات کی ضرورت ہے ان سے واقف کرانے کا بھی انتظام کیا۔

انسان کی اجتماعی زندگی متنوع پہلو رکھتی ہے، اس میں علم کے ساتھ ثقافت کا بھی پہلو آتا ہے، یہ پہلو زندگی گذارنے کے طریقے اور سلیقے سے وابستہ پہلو ہے، ثقافت کا پہلو وقت کے تقاضوں اور انسانی رجحانات اور ذوق سے تعلق رکھتا ہے، جو حالات کے بدلنے اور علاقوں کے فرق سے ایک دوسرے سے فرق رکھتا ہے، ثقافت کا تعلق علم سے اور ذوق سے دونوں سے ہوتا ہے، اس میں علمی معلومات، حسن ذوق، زبان وادب اور زندگی کے طرز عمل جیسی خصوصیات ہوتی ہیں، زندگی گذارنے کے لئے جن امور کی ضرورت ہے ان سے واقفیت اور ان کا خیال رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ ندوۃ العلماء سے فائدہ اٹھانے والوں میں علم کے ساتھ اجتماعی زندگی کے ضروری تقاضوں سے واقفیت کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی صاحب جو ندوۃ العلماء کے عربی ترجمان مجلۃ البعث الاسلامی کے رئیس التحریر اور متعدد اہم اور وقیع کتابوں کے مصنف بھی ہیں، ندوۃ العلماء میں تقریباً ساٹھ سال سے تعلیم کے لئے اپنی آمد کے وقت سے اس وقت تک تعلیمی وانتظامی معاملات سے گذرنے کی وجہ سے ندوۃ العلماء اور اس کی کارگذاری سے اچھی واقفیت کے حامل ہیں، اس لئے ان کی یہ کتاب ''اسلامی ثقافت اور ندوۃ العلماء'' کئی حیثیتوں سے اہم اور وقیع کتاب بن گئی ہے۔

پیش نظر کتاب ایک سمینار میں پیش کئے گئے ان کے مقالات اور بعض دوسرے مضامین جو انہوں نے مختلف موقعوں پر لکھے تھے کا ایک اچھے انداز میں پیش کیا گیا مجموعہ

ہے، جیسا کہ مصنف نے بھی اپنے پیش لفظ میں وضاحت کی ہے، وہ رقم طراز ہیں :

''پیش نظر کتاب ''اسلامی ثقافت اور ندوۃ العلماء'' کے نام سے موسوم ہے، اس کے لکھنے کی تقریب یہ ہے کہ رابطہ عالم اسلامی نے ۱۹۸۷ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ میں علماء، دعاۃ اور ائمہ کی تربیت کے لئے ایک تدریبی کیمپ کا اہتمام کیا۔ اس موقع پر متعدد اساتذہ دارالعلوم کو مختلف موضوعات پر اپنے خیالات پیش کرنے کا موقع ملا، راقم کو بھی ''اسلامی ثقافت'' کے عنوان سے چار قسم کے موضوعات پر اپنے خیالات کے اظہار کا تدریبی جلسوں میں موقع ملا، بعض احباب کے اصرار پر اس کی طباعت کا جب خیال آیا تو موضوع کی مناسبت سے ابھی حال میں لکھا ہوا ایک مضمون بعنوان ''اسلامی ثقافت کا سرچشمہ: قرآن کریم اور ندوۃ العلماء کا اس کے ساتھ خاص اعتناء'' بھی اس میں شامل کر دیا گیا اور نحو وصرف کی تدریس پر لکھا ہوا ایک مضمون نیز بلاغت : نظریہ اور فن، اور اسلامی ادب اور کچھ غیر اسلامی نظریئے اس کتاب میں شامل کرنا مناسب سمجھا گیا اور اسی کے ساتھ ندوۃ العلماء کی تحریک، اس کے اعلی مقاصد وضرورت اور اس کے مؤسسین اور اس کے اساطین علماء کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوا''۔

ان مقالات ومضامین کے جمع کرنے میں عزیزی مولوی محمد فرمان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء) سے انہوں نے تعاون لیا، اور اس طریقے سے مضامین ومقالات کا یہ مجموعہ، کتاب کے طبع جدید میں کچھ مزید اضافوں کے ساتھ قارئین کے سامنے ہے، اور ندوۃ العلماء کی تحریک، اس کے مقاصد اور اس کے کاموں کو سمجھنے کے لئے ایک اچھی پیش کش ہے، اس سے ندوۃ العلماء اور اسلامی ثقافت کی اہمیت اور کاموں کی وضاحت سامنے آتی ہے اور انشاء اللہ یہ سبھی کے لئے ایک معلومات افزا اور مفید پیش کش ثابت ہوگی۔

اللہ تعالی نافع بنائے اور مبارک وقبول فرمائے۔ آمین

جمعرات ۲۱ ربیع الأول ۱۴۳۵ھ — محمد رابع حسنی ندوی

۲۳ جنوری ۲۰۱۴ء — ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

تقریظ

از: مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی صاحب
(معتمد تعلیم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین وبعد.

ثقافت یا تہذیب، علم، فن، ادب، اخلاق، معاملات، عادات اور زندگی کے طور طریقوں پر مشتمل ہوتی ہے، جو کسی خاص فکر، تاریخ اور علاقائی اثرات پر مبنی ہوتی ہے، اس سے قوم کے مزاج اور زندگی کے بارے میں اس کے تصور کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اس میں بعض عناصر دائمی ہوتے ہیں اور بعض متغیر، ثقافت کو عام اور خاص میں بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔

اسلامی ثقافت جس کے اثرات مدت کے اعتبار سے ۱۴ سو سال سے زیادہ قدیم اور وسیع ترین علاقہ پر قائم ہیں، اور مشرق ومغرب میں اسلامی عقیدہ کو ماننے والوں میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں، قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر مشتمل ہے، جو عقیدۂ توحید کے محور پر قائم ہے، اور اس عقیدہ اور اسلام کے زندگی کے بارے میں تصور کا اثر زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

قرآن کریم نے عقیدہ سے لے کر اخلاق ومعاملات اور زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہدایات دی ہیں، جو ایک صالح زندگی اور صالح سماج کے لئے ضروری ہیں، اس میں دین اور عقل، دین اور دنیا کے درمیان متوازن تصور پایا جاتا ہے، دوسرے مذاہب کے برخلاف اسلام نے علم، فکر، اور تدبیر پر بہت زور دیا ہے، قرآن کریم نے بکثرت علم،

شعور، اور فکر وتدبر کی دعوت دی ہے۔ وحی کی ابتداء ہی ''اقرأ'' سے ہوئی ہے، اور اسی طرح انسانی اخلاق ومعاملات کے ایسے اصول بیان کئے ہیں جن سے انسانی زندگی خوشگوار ماحول میں گزرتی ہے اور ایک دوسرے پر اعتماد، ایثار ومحبت اور احترام کا ماحول پیدا ہوتا ہے، اور انفرادی زندگی، ازدواجی زندگی، اجتماعی اور ملی زندگی کے ایسے اصول وضوابط مقرر کئے ہیں جن سے کشمکش، حق تلفی اور ظلم وزیادتی کے امکانات کچھ کم ہو جاتے ہیں۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اسلامی تہذیب کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں:۔

> ''اسلامی تہذیب ایسی تہذیب ہے، جس کا ضمیر وخمیر اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی اور اس کا یقین وایمان ہے، وہ خدائی رنگ (صبغۃ اللہ) میں رنگی ہوئی ہے، اور ایمان واذعان کی بنیادوں پر قائم ہے، اس لئے اس کو دینی رنگ اور ربانی آہنگ اور ایمانی روح سے الگ کرنا ممکن نہیں، اور اس پر جب بھی عصبیت، جاہلی حمیت، نسلی کشمکش، مادی ہوس، اخلاقی زوال، یا معاشرتی انارکی طاری ہوئی ہے، تو عارضی طور پر خارجی اثرات یا اس ماحول ومعاشرہ کی دین رہی ہے، جس سے کوئی اسلامی عنصر ٹکرا ہے، یا اس میں اسلامی ثقافت سے عدم تأثر واستفادہ اور قرآن کریم اور حدیث نبوی اور اسلام کے اولین واساسی مصادر سے عدم اشتغال کو دخل رہا ہے''۔
>
> (تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات، ص:۱۳۴)

پیش نظر کتاب مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء کے مقالات پر مشتمل ہے، جو انہوں نے اسلامی تہذیب کی تعریف اور اس کے مصادر کے تعارف میں لکھے اور مختلف رسالوں میں شائع ہوئے، اس کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب کے مصادر، خاص طور پر قرآن کریم جو اولین مصدر ہے، اس کی تعلیم وتدریس کی اہمیت کا بھی ذکر کیا ہے، اور یہ کہ اس میں دار العلوم ندوۃ العلماء کو اہم مقام حاصل ہے، اس لئے کہ اس نے اپنے نصاب میں قرآن کریم کی تعلیم اور وہ جس زبان میں ہے اس زبان کی

تعلیم اوراس کا ذوق پیدا کرنے کو اہم جگہ دی ہے، انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ان اساتذہ کا بھی ذکر کیا ہے، جنہوں نے قرآن کریم کو اپنا اہم موضوع قرار دیا، جن میں علامہ سید سلیمان ندوی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مولانا اویس صاحب نگرامی ندوی اور مولانا عبداللہ عباس ندوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قرآن فہمی کے لئے عربی زبان وادب جاننا جتنا ضروری ہے، اس سے زیادہ عربی کے قواعد اور اعجاز قرآن اور بلاغت کا علم بھی ضروری ہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنے نصاب میں ان موضوعات کو بہت اہمیت دی ہے، بعض مضامین کا تعلق ان موضوعات سے بھی ہے۔

بنیادی مضمون اسلامی ثقافت، اہمیت اور ضرورت ہے، جو رابطہ عالم اسلامی کے ایک تربیتی کیمپ کے لئے لکھا گیا تھا، اس میں اسلامی تہذیب کی خصوصیات، اس کے بنیادی عناصر، خاص طور پر قرآن کریم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ندوۃ العلماء کو خاص طور سے اسلامی ثقافت کا ایک عظیم مرکز قرار دیتے ہوئے تاریخی حقائق کی روشنی میں اس کے کارہائے نمایاں اور اس کے اساطین علمائے کرام کا تفصیلی تذکرہ اس کتاب کی قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔

مولانا تحریر فرماتے ہیں: ''اسلامی ثقافت کا سرچشمہ قرآن اور حدیث ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ثقافت کو پوری زندگی میں نہ صرف یہ کہ پیش کیا، بلکہ لوگوں کے سامنے اس کی متنوع صورتوں اور شکلوں کو اجاگر بھی کیا''۔

اس دور میں جس میں مغربی ثقافت جو الحاد اور اخلاقی اصول وضوابط سے انحراف اور محض مادی مصالح کی رعایت پر مبنی ہے اور وسائل ابلاغ اور تعلیمی اور تربیتی ماحول کے اثرات سے عام ہوری ہے، اس کی شدید ضروت ہے کہ اسلامی ثقافت کا تعارف کرایا جائے اور اسکی افادیت اور ضرورت کو نمایاں کیا جائے، فساد اور انحراف کے اس دور میں

صرف مسلمانوں کے لئے یہ دینی اخلاقی تہذیب ضروری نہیں ہے بلکہ پوری انسانیت کی فلاح اس میں ہے۔

اس سے قبل ڈاکٹر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی کی ایک کتاب ''اسلام اور مغرب'' شائع ہو چکی ہے جس میں دونوں تہذیبوں کا فرق واضح کیا گیا ہے اور وہ علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔

یہ کتاب اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے، امید ہے یہ بھی مفید اور مقبول ہوگی، مولانا کا اسلوب بیان علمی تحقیقی ہونے کے ساتھ ادبی حلاوت کا حامل ہے اور عام فہم بھی ہے۔

۱۴۳۰/۱۲/۱ھ
۲۰۰۹/۱۱/۱۹ء

محمد واضح رشید حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ

پیش لفظ

الحمد الله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين. وبعد.

اسلامی ثقافت کا موضوع بڑا اہم اور متنوع ہے، اس کے متعدد پہلو ہیں جو ثقافت کے زیر بحث آتے ہیں، تہذیب وتمدن کی سالمیت سے صحیح معاشرہ کی تشکیل عمل میں آتی ہے، تہذیب اور ثقافت اگر چہ ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے ہیں، لیکن ان کے درمیان محققین کے نزدیک بنیادی فرق ہے۔ ثقافت علمی نظریات، خیالات اور تصورات سے عبارت ہے جبکہ تہذیب عملی تجربات اور ترقیات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

اسلامی ثقافت کا سرچشمہ قرآن اور حدیث ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ثقافت کو پوری زندگی میں نہ صرف یہ کہ پیش کیا، بلکہ لوگوں کے سامنے اس کی متنوع صورتوں اور شکلوں کو اجاگر کیا، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نے اسلامی ثقافت کو اپنا جزء زندگی بنالیا اور اس کی تبلیغ وتشریح میں اپنی بے پناہ توانائیاں صرف کیں۔

ندوۃ العلماء اعتدال کی اسی بنیاد پر قائم ہوا، جہاں ایک طرف ٹھوس قدامت پرستی ہے اور دوسری طرف صحیح اور مفید تجدد پسندی جو اسلام کی پائیدار اور کبھی نہ بدلنے والی مذہبیت پر چلنے کے ساتھ اس تغیر پذیر علمیت کا ساتھ بھی نہیں چھوڑتی جو برابر ترقی کرتی رہتی ہے، ندوۃ العلماء کا مقصد صحیح العقیدہ مسلمانوں اور اہل سنت کے مختلف طبقات کے درمیان اتفاق پیدا کرنا ہے، روز اول سے اس کا ایمان ہے کہ اسلامی علوم زندہ اور پائیدار حقیقت ہیں اور نصاب تعلیم اصلاح وتبدیلی کا محتاج ہے، اسلئے ہر زمان ومکان میں اس

کے اندر اصلاح وتجدید ہوسکتی ہے اور زمانہ کے تقاضوں اور مسلمانوں کے حالات وظروف کے مطابق اس میں کمی بیشی ممکن ہے۔

ندوۃ العلماء نے قرآن کریم کو ایک ابدی پیغام اور اس کو ہر زمانہ اور ہر نسل کی کتاب ہونے کی حیثیت سے پڑھایا اور اسکے درس وتدریس کا باقاعدہ اہتمام کیا، چنانچہ قرآن کریم کے متن کی تعلیم کو لغت، ادب، نحو، کلام، معاشرت، ہر اعتبار سے مقرر کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اونچے درجوں میں تفسیر وحدیث کی بڑی بڑی کتابیں بھی مقرر کر کے قرآن وحدیث کی تعلیم کو لازم قرار دیا۔

اسی طرح ندوۃ العلماء نے عربی زبان کی تعلیم کا بھی جو قرآن وحدیث کے خزانوں اور اسلامی کتب خانوں کی شاہ کلید ہے اور جو اسلامی ملکوں کے لئے ایک اہم ادبی رابطہ ہے، بہت خاص اہتمام کیا اور اس زبان کی تعلیم میں جو ایک انسانی اور زندہ زبان ہے اور جس میں لکھنا بولنا ممکن ہے پوری توجہ کی۔ اس نے عربی زبان کو اس کا صحیح مقام عطا کیا اور اس کو پتھروں اور کتبوں کے محدود حلقے سے نکال کر عام تحریروں اور تقریروں میں استعمال کیا، جو ہندوستان کی قدیم روایت کے خلاف تھا، اور اس کیلئے متعدد کتابیں بھی تصنیف کرائیں، جو اس سلسلہ میں معاون ثابت ہوئیں، یہاں تک کہ لوگ ندوہ کے اس شاندار کارنامہ کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے، اسی طرح ندوہ نے عربی ادب کی تعلیم کا خاص اہتمام کیا اور بہت سے ایسے عربی کے ادیب اور انشاء پرداز اور مصنفین پیدا کئے، جن کی عربی دانی کا لوہا عرب علماء کو بھی ماننا پڑا۔

اس عظیم مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے ندوۃ العلماء نے اپنی مثالی اور عملی درسگاہ دارالعلوم کے نام سے قائم کیا، اور اس کے ذریعہ جو نصاب تعلیم تیار کیا گیا، اس میں زمان ومکان کے تقاضوں کے مطابق برابر تصرف کیا اور ان پرانے علوم کا ایک بڑا حصہ اس نے نصاب سے نکال دیا، جن کی ضرورت اب حالات بدل جانے کے بعد اور پرانے عقلی علوم

اوران کے موجدین کے بے نام ونشان ہوجانے کے باعث بالکل باقی نہ رہی تھی، اوران کی جگہ ان نئے علوم کولا کر رکھا، جن سے آج کا عالم جو اپنے دین وقوم کی خدمت کرنا چاہتا ہے مستغنی نہیں ہوسکتا، اوران باتوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہاں سے نکلنے والے فضلاء زمانۂ حاضر کے تقاضوں سے باخبر رہیں اوران جدید آلات سے وہ ہمہ دم لیس رہیں جن سے وہ اپنے دین کا دفاع کرسکیں اور علم وثقافت کے قافلہ میں وہ کسی سے پیچھے نہ رہیں تاکہ وہ اپنی اسلامی سوسائٹی سے کٹ کر کسی بھی غلط ماحول کا شکار نہ ہوں۔

ندوہ نے پوری کوشش کی کہ وہ اپنی درسگاہ سے ایسے افراد نکالے، جو اس بدلتے ہوئے زمانے میں اسلامی دعوت کے طریقۂ کار اوراس کی ذمہ داریوں سے پوری طرح واقف ہوں اوروہ اسلامی شریعت کی مابہ الامتیاز خصوصیتوں، اسلامی تمدن کے حسن وجمال اور اسلامی پیغام کی ابدیت کوایسی زبان اور ایسے اسلوب میں لوگوں کے سامنے پیش کرسکیں، جس کولوگ بخوبی سمجھیں اوراپنے لئے اسلام کی اس ابدی راہ کومنتخب کرکے ایک ایسی اعتدال پسند ملت بن جائیں، جوقدیم وجدید دونوں طریقوں سے باخبر ہو۔

ندوہ نے الحمدللہ اس سلسلہ میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی اورتھوڑی ہی مدت میں اس نے کچھ ایسے افراد پیدا کئے جودور حاضر کے علماء کی بہترین مثال تھے اورجن کی ذات اس نئے زمانے کے تخیل کے خلاف اسلامی علوم کے لئے حجت بن کر دنیا کے سامنے چمکی اورجن کی وجہ سے پڑھے لکھے طبقے میں علمائے دین کا سرفخر سے اونچا ہوگیا، ان ندوی علماء نے اسلامی ادب، علم توحید، علام کلام، سیرۃ النبی ﷺ، تاریخ اسلام پر اہل زمانہ کے لئے ایسے انمٹ نقوش چھوڑے، جو ہندوستان کے اورتمام اسلامی کتب خانوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے، اگر ہم مثال کے طور پر علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ''سیرۃ النبی'' کو لے لیں جو سات ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے تو یقیناً اس کو سیرت النبی کی سب سے بڑی کتاب اور ایک اسلامی انسائیکلوپیڈیا کہا جاسکتا ہے، اسی طرح علامہ موصوف کی کتاب ''خطبات مدارس''

کو لے لیجئے جس میں نبوت محمدی اور رسول اللہ ﷺ کی شخصیت، اسلام کے ابدی پیغام کے متعلق ایسی جامع اور مفصل بحث موجود ہے جو سیرت کے خزانوں کی کنجی اور سیرت محمدی کا عطر ہے، اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی بیش بہا تصنیفات ہیں جو آج کی نئی پود اور پڑھے لکھے طبقے میں انتہائی مقبول ہیں، بلکہ یہ کتابیں درحقیقت مصنفین، انشاء نگار، مقررین اور داعیان اسلام ہر ایک کے لئے ایسے مواد کی حیثیت رکھتی ہیں، جو کبھی ختم نہیں ہوسکیں۔

ان مشہور اور نامور تصنیفات میں سے جو ندوی علماء کی قلمی کاوشوں کا نتیجہ ہیں اور جن سے ایک جدید اسلامی کتب خانہ تیار ہوسکتا ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ مرحوم کی کتاب ''ارض القرآن'' بھی ہے جو قرآن کریم کی جغرافیائی اور تاریخی جگہوں پر مشتمل ایک بے نظیر تصنیف ہے اور مولانا عبدالباری ندوی (سابق پروفیسر فلسفہ جدیدہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) کی کتاب ''مذہب اور عقلیات'' ہے، اور مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم (سابق معتمد دارالعروبہ پاکستان) کی کتاب ''اسلام اور اشتراکیت'' ہے، اسی طرح مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی تصنیفات ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' اور ''تاریخ دعوت وعزیمت'' پانچ ضخیم جلدوں میں اور ان کے علاوہ دوسرے ندوی علماء کی کتابیں جو صحابہ کے حالات وسیرت اور اسلامی تاریخ وادب کے مختلف موضوعات پر ہیں سب اپنی جگہ اہم اور قابل ذکر ہیں۔

ندوہ کے فضلاء کا ایک خاص مانا ہوا علمی ذوق ہے اور ملک کی ثقافتی اور اس کی ادبی اور علمی خدمتوں میں ان کا خاصا حصہ ہے۔ جن کے فضل وقیمت کا اعتراف ہر شخص کے لئے ناگزیر ہے۔

ندوہ ہی کے فضلاء نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی، جو آج ہندوستان کا ایک اہم اور بڑا علمی ادارہ مانا جاتا ہے، دارالمصنفین نے اسلامی، ادبی، علمی، تاریخی ہر موضوع پر ایسی کتابیں شائع کی ہیں، جن سے ہندوستان کے بڑے بڑے کتب خانے

بھی خالی تھے۔

پیش نظر کتاب ''اسلامی ثقافت اور ندوۃ العلماء'' کے نام سے موسوم ہے، اس کے لکھنے کی تقریب یہ ہے کہ رابطہ عالم اسلامی نے ۱۹۸۷ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ میں علماء، دعاۃ اور ائمہ کی تربیت کے لئے ایک تدریبی کیمپ کا اہتمام کیا۔ اس موقع پر متعدد اساتذہ دارالعلوم کو مختلف موضوعات پر اپنے خیالات پیش کرنے کا موقع ملا، راقم کو بھی ''اسلامی ثقافت'' کے عنوان سے چار قسم کے موضوعات پر اپنے خیالات کے اظہار کا تدریبی جلسوں میں موقع ملا، بعض احباب کے اصرار پر اس کی طباعت کا جب خیال آیا تو موضوع کی مناسبت سے ابھی حال میں لکھا ہوا ایک مضمون بعنوان ''اسلامی ثقافت کا سرچشمہ: قرآن کریم اور ندوۃ العلماء کا اس کے ساتھ خاص اعتناء'' بھی اس میں شامل کر دیا گیا اور نحو وصرف کی تدریس پر لکھا ہوا ایک مضمون نیز بلاغت: نظریہ اور فن، اور اسلامی ادب اور کچھ غیر اسلامی نظریئے اس کتاب میں شامل کرنا مناسب سمجھا گیا اور اسی کے ساتھ ندوۃ العلماء کی تحریک، اس کے اعلی مقاصد وضرورت اور اس کے مؤسسین اور اس کے اساطین علماء کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوا، اس سلسلہ میں عزیزی مولانا محمد فرمان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء) کا تعاون رہا، میں ان کا شکر گذار ہوں۔

دعاء ہے اللہ تعالی اس کتاب کو قبولیت سے سرفراز فرمائیں اور ہر اعتبار سے اس کو نافع اور مفید بنائیں۔ وماذلك على الله بعزيز۔

راقم الحروف

سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

مدیر البعث الاسلامی ندوۃ العلماء، لکھنو

۲۷ر شعبان ۱۴۳۰ھ

۱۹ر اگست ۲۰۰۹ء

باب اول

اسلامی ثقافت کا بنیادی سرچشمہ

قرآن کریم

اسلامی ثقافت

الحمد الله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء وامام المرسلين محمد وعلى آله وصحبه أجمعين، أما بعد:

محترم قارئین کرام! ہمارے اس مضمون کا عنوان ہے: اسلامی ثقافت۔

ثقافت کے لغوی اور اصطلاحی معنی

ثقافت کے لغوی معنی مہارت اور بسرعت کسی بات کو سمجھ لینے کے ہیں، لیکن اصطلاح میں ثقافت مختلف علوم وفنون اور آداب وافکار پر دسترس حاصل کرنے کا نام ہے، ہم اثنائے گفتگو اکثر یہ لفظ کسی شخص کی علمی اور تعلیمی وجاہت بیان کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ فلاں صاحب بہت اچھی ثقافت کے مالک ہیں، یعنی مختلف ضروری علوم وفنون اور آداب وافکار پر ان کی نظر بہت گہری اور ہمہ گیر ہے، ثقافت ایک بہت ہی خوبصورت وصف ہے، پڑھے لکھے وسیع النظر اور مہذب انسانوں کی تعریف عام طور سے اسی وصف سے کی جاتی ہے، اور اسلامی ثقافتی ماحول میں لوگ کسی کی تعریف میں مثقف کہنا بھی پسند کرتے ہیں۔

اسلامی ثقافت کا مفہوم

اسلامی ثقافت سے مراد ہے اسلامی علوم وفنون اور اسلامی آداب وافکار، اس ثقافت کا محور اسلام ہے اور اس کا اصل سرچشمہ کتاب وسنت ہے، اس سے علوم وفنون کے سوتے پھوٹتے ہیں، اور اسی سے صحت مند افکار وآداب کا تعین ہوتا ہے، جو لوگ اسلامی علوم وآداب پر پوری گہرائی کے ساتھ دسترس رکھتے ہیں اور اسلامی فکر پر ان کی نظر نہایت وسیع اور ہمہ گیر

ہوتی ہے وہ اسلامی ثقافت کے نمائندے کہے جانے کا پورا حق رکھتے ہیں، ایک ایسے مسلمان عالم یا داعی کا جو دعوت اسلامی اور فکر اسلامی کی خدمت کرنا چاہتا ہو، اسلامی ثقافت سے اس کا تعلق قریبی اور گہرا ہونا از بس ضروری ہے، اور اسلامی علوم وفنون اور اسلامی افکار وآداب پر وہ مہارت بھی رکھتا ہو، اور اس کی اصالت اور اولویت کا قائل ہو، اور نہ صرف یہ کہ وہ اس میدان میں اسلام کا نمائندہ ہو بلکہ وہ دوسری مادی قوموں کے علوم وفنون اور افکار وآداب پر بھی حاوی ہو اور ان پر نظر رکھتا ہو، اور وہ علم وثقافت کے قدیم وجدید حالات اور اسکے مضمرات اور نتائج سے بھی پوری طرح واقف ہو، کسی ایسے فاضل شخص کو ہم وسیع تر ثقافت کا نمائندہ قرار دے سکتے ہیں، اور بلا تردد اسکے لئے مثقف کی صفت استعمال کر سکتے ہیں۔

ایک مسلمان عالم اور داعی کے لئے ایمان واخلاق کی بنیاد پر زندگی کی عمارت اٹھانے کے بعد علم وثقافت کے میدان میں امتیاز حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ وہ اسلامی فکر کی نمائندگی کر سکے، وہ تمام مادی فکروں اور فلسفوں سے واقف ہو، وہ کائناتی علوم کے بارے میں بھی واقفیت رکھتا ہو، وہ مغربی طرز فکر اور مادی نقطۂ نظر کو بھی سمجھتا ہو اور اسکے زندگی پر پڑنے والے نقصان دہ اثرات سے غافل نہ ہو، وہ مادی علوم وافکار اور ثقافت کے نمائندوں سے بھی کسی حد تک باخبر ہو، اور اسلام کے لائے ہوئے اصول وعقائد سے اسکے ٹکراؤ کو بھی بخوبی جانتا ہو، اور یہ یقین رکھتا ہو کہ اسلامی نظام زندگی، اس کے فلسفۂ حیات وموت، اسکے بنیادی ارکان وعقائد کے مقابل میں مادی نظام زندگی اور اس کا فلسفہ بالکل متضاد کیفیت رکھتا ہے، اور ان دونوں طریقہائے زندگی میں اتحاد کا تصور محال ہے۔

اسلامی ثقافت کی بنیاد

اسلامی ثقافت کا بنیادی پتھر قرآن کریم ہے، اس کتاب عظیم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ یہ ایک ایسی طاقتور، برحق اور کھلی ہوئی کتاب منزل ہے کہ اس پر باطل کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہو سکتا "وانه لكتاب عزيز لا يأتيه الباطل من بين يديه ولا من

خلفه تنزیل من حکیم حمید" ،(اور یہ قرآن بڑی باوقعت کتاب ہے، جس میں غیر واقعی بات نہ اس کے آگے سے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے آسکتی ہے، یہ خدائے حکیم محمود کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے) (حم السجدۃ:۴۱۔۴۲)

قرآن کریم اسلامی تعلیمات اور اسلامی ثقافت کا اولین سرچشمہ ہے، یہ کتاب ہدایت ہے، تمام عقائد وتصورات اور اخلاقی قدریں اور پیمانے، اسی طرح عبادات اور اعمال وآداب قوانین شریعت، طریقۂ زندگی اور اسلامی شعار، ان تمام حقائق کا بنیادی تعلق قرآن کریم سے ہے، یہ وہ صحیفۂ آسمانی ہے جو ناسخ ملل ومذاہب ہے، اس کے بعد نہ کسی کتاب یا صحیفے کی ضرورت ہے اور نہ کسی ایسے رہبر اصول کی احتیاج باقی رہتی ہے جس کے بغیر زندگی کامیابی اور سعادت سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔

اس کتاب سے اہل علم ودعوت اور اصحاب فکر وعمل کا غیر معمولی تعلق ہونا ایک ناگزیر ضرورت ہے، زندگی کے تمام شعبوں میں اسی کا اثر انگیز عمل ہمہ دم جاری وساری رہتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے ذریعہ اسلامی ثقافت کی جس قدر نمائندگی ممکن ہے وہ کسی اور طریقے سے ممکن نہیں، قرآن کریم میں ان تمام حقائق ومعارف، اور علوم وافکار کا خزانہ موجود ہے جن کی اسلامی ثقافت کی تعمیر میں اشد ضرورت ہے، اس بنا پر سب سے زیادہ اولین اور اہم حیثیت اسلامی ثقافت کے موضوع پر کچھ گفتگو کرتے وقت قرآن کریم کو حاصل ہے۔

قرآن کریم اور ہماری ذمہ داریاں

اس موقع پر قرآن کریم کے بارے میں چند گذارشات عرض کرنے کے بعد اس کی کچھ بنیادی خصوصیات کا ذکر کرنا بہر حال مناسب ہوگا۔

پہلی گذارش تو یہ ہے کہ ہمیں قرآن کریم کے مکمل حفظ کا اہتمام کرنا چاہئے، اور اگر مکمل حفظ کا اہتمام مشکل ہو تو بقدر استطاعت ایک معتد بہ حصہ ضرور ہمارے سینوں میں محفوظ ہونا چاہیے، تاکہ اس کے نور اور اس کی برکت سے ہم ہر موقع پر رہنمائی حاصل

کرسکیں، اس لئے کہ قرآن دراصل ایک عظیم الشان سرچشمۂ زندگی ہے، اس کی روانی اور شیرینی کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔

دوسری گذارش اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہم کتاب اللہ کی تلاوت کا اہتمام کریں اور غور وفکر کا کوئی گوشہ چھوڑے بغیر ہم اس کے معانی ومفاہیم، اسکی ہدایات وتعلیمات کو اور اس کے حقائق واسرار، اس کے لطائف ورموز کو ممکن حد تک سمجھنے کی پوری کوشش کریں، اس کے ساتھ یہ کہنے کی اجازت بھی دیجئے کہ قرآن کریم کی صحیح قراءت اور اصول تجوید کے مطابق اس کی تلاوت کا زبردست اہتمام کریں، عام طور سے طبقۂ اہل علم اس پہلو کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا، اور اکثر اسلامی مدارس اور اداروں کے فارغین اصول تجوید سے نابلد ہوتے ہیں، اور تلاوت میں قواعد کی بڑی بڑی غلطیاں کر جاتے ہیں۔

قرآن کریم کی چند خصوصیات

اس مختصر گذارش کے بعد اب قرآن کریم کی چند خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے:

یوں تو اس بحر ناپیدا کنار کو عبور کرنے کا تصور بھی کسی حال میں ممکن نہیں ہے، اور اس کے اندر علوم وحقائق کے جو ذخیرے موجود ہیں ان پر احاطہ کرنا کسی بڑی سے بڑی انسانی طاقت کے لئے بھی محال ہے۔

قرآن کریم کی پہلی اور بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کلام الٰہی ہے، اور ہر طرح کے انسانی علم وتخیل کی آمیزش سے پاک اور منزہ ہے، حضرت جبرئیل علیہ السلام اس کے ناقل اور حضرت محمد ﷺ اس کے حامل وحافظ اور اس کے شارح ہیں، ''وانہ لتنزیل رب العالمین، نزل به الروح الأمین علی قلبك لتكون من المنذرین بلسان عربی مبین'' (سورۃ الشعراء:۱۹۲۔۱۹۵) (اور یہ قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا ہے، اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے، آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں، تاکہ آپ بھی منجملہ

ڈرانے والوں کے ہوں) ایک عام مسلمان کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور وہ علم قطعی ہے اس میں کسی درجہ میں بھی ادنیٰ شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

دوسری خصوصیت اس کا خلود و دوام ہے، یہ کسی خاص قوم یا نسل، یا زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب جو نبی آخرالزماں پر نازل ہوئی اور ہمیشہ کے لئے وہ قائم ودائم ہے، اور روشنی کا عظیم الشان مینار ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے، "انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون" ،(حجر:۹)(اور ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم اس کے محافظ ہیں) چودہ صدیاں اس پر گذر جانے کے بعد بھی آج تک اسی طرح تروتازہ اور جدید ہے جس طرح اپنے نزول کے ابتدا میں تھی، اسی طرح محفوظ، اسی طرح مقبول، اسی طرح ہاتھوں ہاتھ لئے جانے والی، تلاوت کرتے وقت ہمیں اس احساس دوام کو اس کے بارے میں برقرار رکھنا ضروری ہے۔

تیسری اہم خصوصیت اس کی ہمہ گیریت ہے، چنانچہ یہ ہر زمانے کی کتاب ہونے کے ساتھ دین اسلام کی ایک مکمل اور جامع کتاب ہے، اس کے سامنے نہ کسی کتاب کی کوئی ضرورت ہے اور نہ اس کا قائم رہنا ممکن ہے، یہ کتاب زمانے پر حاوی ہے، ہر مذہب اور امت کے لئے بالکل کافی وشافی ہے، اور مضامین کے لحاظ سے بھی ہمہ گیر ہے، انسانی ہدایت وضرورت کی کوئی بات یا مضمون نہیں ہے جو اس میں موجود نہ ہو، عقیدے سے لے کر معاشرہ کے حالات اور خاندان کے تعلقات تک اس کتاب میں بہ تفصیل موجود ہیں، اس کے مفاہیم عالیہ پر غور کرنے والوں کو معلوم ہوگا کہ قرض لینے دینے کے سلسلہ میں اس کو نوٹ کر لینے اور لکھ لینے کے بارے میں سب سے لمبی آیت قرآن میں موجود ہے، یہ پہلو بہت نازک ہوتا ہے اور ذرا سی غفلت سے بہت زیادہ برائیوں اور خرابیوں کا باعث ہوتا ہے، اس لئے اس کی اہمیت واضح کرنا ضروری ہے، یہ دراصل اسلام کے مالیاتی نظام کی طرف اشارہ ہے۔

قرآن کریم اپنی ہمہ گیر خصوصیت کی بنیاد پر، پوری انسانیت اور پوری دنیا کی ایک دائمی

کتاب ہے:ان ھو الاذکر للعالمین (تکویر:۲۶) پس یہ تو دنیا جہان والوں کے لئے ایک بڑا نصیحت نامہ ہے۔اسی طرح قرآن کی ہمہ گیری یہ بھی ہے کہ وہ صرف عقل یا صرف قلب کو مخاطب کرنے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ وہ پورے انسانی وجود، اس کے وجدان کو، اس کے ضمیر کو، اس کی روح کو، اس کے جسم کو اس کے حواس کو اسی طرح مخاطب کرتا ہے جس طرح عقل اور قلب کو۔

قرآن کریم کی چوتھی بڑی خصوصیت اس کا اعجاز ہے، رسول کریم ﷺ کے ذریعہ اس نے کفار و مشرکین عرب کو چیلنج کیا کہ وہ افصح الفصحاء اور ابلغ البلغاء ہونے کے باوجود کوئی اس جیسا طرز بیان لاکر دکھائیں، یا دس سورتیں اس جیسی لکھ کر دکھائیں یا اس جیسی ایک ہی سورت پیش کر دیں، لیکن وہ ناکام رہے، اللہ تعالیٰ نے بے بسی اور ناکامی پر کسی افسوس کا اظہار کئے بغیر فرمایا "قل لئن اجتمعت الانس والجن علی أن یأتوا بمثل ھذا القرآن لایأتون بمثلہ ولوکان بعضھم لبعض ظھیرا" (سورۃ الاسراء آیت:۸۸) آپ فرما دیجئے کہ اگر تمام انسان اور جنات اس بات کے لئے جمع ہو جائیں کہ ایسا قرآن بنا لائیں، تب بھی ایسا نہ لاسکیں گے اگر چہ ایک دوسرے کا مددگار بن جائے۔

(۱) قرآن کریم کا اعجاز ہر ناحیہ سے دیکھا جا سکتا ہے، زبان و بیان اور ادب و بلاغت لفظ و نظم ہر اعتبار سے وہ معجز ہے۔

(۲) اپنے موضوعات کے تنوع اور ہمہ گیریت کے لحاظ سے بھی وہ معجز ہے۔

(۳) علمی حقائق اور کائناتی اسرار و حکم کے لحاظ سے بھی وہ معجزہ ہے۔

کچھ اعجاز اور تراجم قرآن کے بارے میں

شعر جاہلی کے ذخیرے پر ایک نظر ڈالنے سے جہاں جاہلی شعراء کے شاعرانہ کمال اور ان کی بلاغت و بیان اور قدرت کلام کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں ان کے اخلاق اور زندگی کی

قدروں کا بھی پتا چلتا ہے۔ اگر چہ جاہلی شاعری زیادہ تر بادیہ عرب میں پیدا ہوئی، اور وہیں پھلی پھولی، لیکن نزاکت خیال اور امتیازی خصوصیات کی حامل زندگی کے تصور سے وہ کسی حال میں خالی نہیں رہی، اسی کے ساتھ جاہلی شعراء کے اندر اپنی بلندی اور اپنی زبان آوری ،فصاحت و بلاغت کا احساس ان کے کلام پر غالب تھا، اور وہ اپنے تفوق اور اپنی عظمت کو ثابت کرنے کے لئے شاعری کو سب سے زیادہ مؤثر اور اہم ذریعہ سمجھتے تھے۔

ان کی نثر کا حصہ بہت کم اور کمزور تھا، اور وہ نثر کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ علمی اور ثقافتی لحاظ سے کمزور تھے، اور نثر کو طاقت ور اور مقبول بنانے میں علم وثقافت کا حصہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اس کے برعکس شعر وشاعری کے ادب کو طاقت ور اور اس کی بلاغتی تاثیر کو زیادہ دیرپا اور اس سے احساسات وجذبات کی ترجمانی کرنے کے لئے علم وثقافت کا پایا جانا ضروری نہیں، یہ بات واضح ہے کہ عصر جاہلی کے شعراء ناخواندگی کے ماحول میں زندگی گزارتے تھے، اور علم وثقافت کے مراکز سے وہ بہت دور اور نا آشنا تھے۔

فن شاعری میں عربوں کی بے مثال مہارت

رہا ان کا بلاغت کلام پر قادر ہونا اور شعری صلاحیت کو پوری طاقت کے ساتھ پیش کرنا تو واقعہ یہ ہے کہ اس امتیازی صفت میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا، اور علم وادب کے لحاظ سے زمانہ خواہ کتنا ہی ترقی کر گیا ہو، لیکن جاہلی شاعری کا تفوق اور اس کا امتیاز اسی طرح قائم ہے، اور نقادان بلاغت وادب نے اس کی فنی عظمت اور بلاغتی طاقت کو ہر اعتبار سے تسلیم کیا ہے، بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ اسی کلام کی روشنی میں انہوں نے نقد کے اصول بنائے ہیں، اور ادبی تنقید کو ایک الگ صنف کے اعتبار سے پیش کیا ہے، اس شاعری کو آج بھی ادب وبلاغت کے لحاظ سے وہی اہمیت حاصل ہے جو عصر جاہلی میں تھی اور آئندہ بھی باقی رہے گی۔

شعر جاہلی کے خلاف مستشرقین کی ناتمام کوشش

بہت سے لوگوں نے جو اسلام مخالف ذہن رکھتے ہیں، ادب جاہلی کی عظمت کو اور اس کی بلاغتی قیمت واہمیت کو نہ صرف یہ کہ کم کرنے کی کوشش کی، بلکہ اس کو سرے سے بے اصل قرار دینے میں اپنا زور قلم صرف کیا، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ادب جاہلی تاریخی اعتبار سے اس زمانہ کا کلام نہیں ہے، بلکہ بعد میں آنے والے شعراء اور ادباء نے اپنے کلام کو اہم بتانے کی غرض سے اسے دور جاہلی کی طرف منسوب کر دیا، لہٰذا جاہلی ادب کی طرف اس کا انتساب صحیح نہیں ہے۔

اس تاریخی حقیقت کو نظر انداز کرنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ قرآن کریم کی ادبی اور بلاغتی حیثیت کو گھٹانا چاہتے تھے اور اس کے اعجاز پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں اپنی توانائیاں صرف کر رہے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی اس ناپاک کوشش میں ناکام رہے، اس لئے کہ جو چیز کھلے ہوئے آفتاب کی طرح روشن اور درخشاں ہو، اس کا انکار کر دینا اور اس کی تابانی کو چھپالینا آسان عمل نہیں تھا، اس غلط کوشش میں جن لوگوں نے حصہ لیا، وہ مستشرقین تھے۔ اور ان کے بعض ہونہار شاگرد اس مہم میں پیش پیش تھے، یہاں تک کہ بعض مصری ادباء نے جاہلی شاعری کے بارے میں وہی منفی رویہ اختیار کیا اور یہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی کہ جاہلی شاعری ایک موہوم ادبی روایت ہے، جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے اس خیال کو ثابت کرنے کے لئے جاہلی شاعری کے موضوع پر کتابیں تصنیف کیں، اور یہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی کہ جاہلی شاعری جو اس وقت ہمارے دسترس میں ہے، وہ بے اصل ہے، لیکن افسوس کہ وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہے۔

تمام اہل نقد و تاریخ اس بات پر پوری طرح متفق ہیں کہ جاہلی شاعری ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار ناممکن ہے، اور وہ عہد جاہلی کی ادبی زندگی کا آئینہ ہے۔ خاص

طور سے معلقات کی شاعری اُس ماحول اور ذہن کی عکاسی کرتی ہے جو واقعتاً زمانہ جاہلیت کی تاریخ کو ایک زندہ قوم کے ساتھ وابستہ کرنے کی شہادت دیتی ہے۔ دراصل اس کا انکار اور اتنے بڑے تاریخی واقعے کی تکذیب کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ قرآن کریم کے اعجازی مرتبے کو گرانے کی کوشش کریں، تاکہ یہ ثابت کرسکیں کہ قرآن کریم کوئی الہامی کتاب نہیں ہے۔

عہد جاہلی کے ادباء وشعراء جو اپنی زبان دانی اور فصاحت وبلاغت کے مدعی تھے، جب انہوں نے قرآن کریم کی عظمت کو کم کرنا چاہا تو قرآن کریم نے ان کو چیلنج کیا کہ تم اس جیسا کوئی کلام بنا کر لاؤ، اگر یہ بھی مشکل ہو تو دس آیتیں پیش کردو، یہ بھی مشکل ہو تو ایک آیت بنا کر لاؤ، مگر اس چیلنج کا کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا، اور پورے ماحول پر سناٹے کی کیفیت طاری ہوگئی۔

قرآن ایک زندہ جاوید معجزہ

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کا انکار ناممکن ہے۔ آپ غور کریں اور قرآن کو ایک انسانی کتاب ثابت کرنے کی کوشش کریں، مگر آپ کی تمام کوششیں ناکام ہوجائیں گی اور ہر حال میں یہ ماننا پڑے گا کہ یہ وہ معجزہ ہے جس نے تمام مدعیان بلاغت کو عاجز کردیا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کے حفظ کو، اس کی تلاوت کو، اور اس کے مفہوم ومعنی کو سمجھنا آسان فرمادیا، ہر زمانے میں قرآن کریم کا مطالعہ کرنے اور اس کے اعجاز کو سمجھنے کی بھرپور کوششیں ہوئیں، کسی نے قرآن کے اعجاز کو اس کے الفاظ میں ڈھونڈھنا چاہا تو کسی نے معانی ومفاہیم کے اندر اس کو تلاش کیا، مگر متاع گمشدہ ان کے ہاتھ نہ لگی، اور انہوں نے پھر ایک دوسرے پہلو سے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی، اور وہ تھا نظم قرآن کا پہلو، کہ الفاظ وہی استعمال کئے گئے جن سے وہ مانوس تھے، اور اسلوب بھی وہی اختیار کیا گیا جو اس زمانے کے ادباء وشعراء کا اسلوب تھا، مگر الفاظ کی بندش، اس کا صحیح جگہ پر صحیح طریقہ سے

استعمال، اوران کا باہمی ربط ایک ایسی نادر حقیقت تھی جس سے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اورغور کرنے سے یہ حقیقت اس قدر نمایاں ہوتی ہے کہ ساری طاقت اس پر جا کر موقوف ہو جاتی ہے، اور اس نظم وربط کے اندر اعجاز کے پہلو کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

قرآن کریم کے اعجازی پہلو کا کسی حد تک سمجھنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک جاہلی شاعری سے پوری واقفیت نہ ہو، اور اسکے زبان وادب اور فصاحت وبلاغت کو سمجھنے کا ملکہ اور کسی حد تک اس پر دسترس نہ حاصل ہو جائے، اور عربی زبان کا ایسا ذوق پیدا ہو جائے کہ زبان کی حلاوت ولذت کا احساس ہونے لگے اور دیر تک یہ احساس قائم رہے۔

قرآن کا تربیتی پہلو

قرآن کریم کا ہر انسان سے مطالبہ ہے کہ وہ اپنی فکر کو علم ومشاہدے کی جولان گاہ میں لے جائے، اور عقیدۂ توحید کی تجدید کرتا رہے، اور اس کی بنیاد پر ایمانی تہذیب کے ایسے قصر باتمکین کی تعمیر کرے جس کے سایے تلے ہر کلمہ گو انسان راحت وآرام کی سانس لے سکے، اور اللہ کے ذکر اور دنیا وآخرت کی خوبیوں کو اعتدال وتوازن کے ساتھ اس طرح جمع کرنے والا ہو کہ غیر مسلم بھی اس کو دیکھ کر بے اختیار اس کی طرف کھنچے، کیونکہ اسلامی تہذیب ایسی بے مثال تہذیب ہے جو تمدن وتہذیب اور فلسفہ ونظریات کی اس دنیا میں اپنی شان رکھتی ہے، مغربی انسان خواہ کتنی ہی ترقی کر لے، کائنات کے انفس وآفاق کو مسخر کر لے، لیکن وہ رات کو دن اور دن کو رات بنانے پر بالکل قادر نہیں ہے۔

وہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے نظام میں خواہ ان کا تعلق انسانی زندگی سے ہو، یا کائنات سے ہو، اپنی زبردست ایجادات اور غیر معمولی پیش رفت کے ذریعہ ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں لاسکتا، اور نہ وہ اس کے اندر ودیعت رکھے ہوئے قوت وایجاد کے سرچشموں تک پہونچ سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں چیلنج کیا ہے کہ کیا اس کے

سوا کوئی ایسا معبود ہے جو اس کے نظام کو چلانے میں اس کا دست و بازو ہو؟ بیسویں پارے کی یہ آیت پڑھئے، اللہ کا ارشاد ہے:

''بھلا بتاؤ تو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ کس نے آسمان سے بارش برسایا؟ پھر ہرے بھرے بارونق باغات اگا دیئے، ان باغوں کے درختوں کو تم ہرگز اُگا نہیں سکتے۔ کیا اللہ کے ساتھ اور کوئی معبود بھی ہے؟ بلکہ یہ لوگ سیدھی راہ سے ہٹ جاتے ہیں، کیا وہ جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا اور اس کے درمیان نہریں جاری کر دیں، اور اس کے لئے پہاڑ بنائے، اور دو سمندروں کے درمیان آڑ بنا دیئے، کیا اللہ کے ساتھ اور کوئی معبود ہے؟ بلکہ ان میں سے اکثر کچھ جانتے ہی نہیں۔ بے کس کی پکار کو جب کہ وہ پکارے، کون قبول کر کے سختی کو دور کرتا ہے؟ اور تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے، کیا اللہ کے علاوہ اور کوئی معبود ہے؟ تم بہت کم نصیحت و عبرت حاصل کرتے ہو؟ کیا وہ جو تمہیں خشکی اور تری کی تاریکی میں راہ دکھاتا ہے، اور جو اپنی رحمت سے پہلے ہی خوشخبری دینے والی ہوائیں چلاتا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ جنہیں یہ شریک کرتے ہیں، ان سب سے اللہ بلند و بالاتر ہے، کیا وہ جو مخلوق کی اول دفعہ پیدائش کرتا ہے، پھر اسے لوٹائے گا، اور جو تمہیں آسمان و زمین سے روزیاں دے رہا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی معبود ہے؟ کہہ دیجئے کہ اگر سچے ہو تو اپنی دلیل لاؤ، کہہ دیجئے کہ آسمان والوں میں سے، زمین والوں میں سے سوائے اللہ کے کوئی غیب نہیں جانتا، انہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ کب دوبارہ زندہ کئے جائیں گے؟'' (سورۂ نمل: آیت ۶۰۔۶۵)

قرآنی قصوں کی اہمیت اور ان کا اسلوب

قرآن کریم نے اپنے دعوتی اسلوب کو مستحکم اور مؤثر بنانے کے لئے انسانی زندگی

کے مختلف پہلوؤں کو قصوں کے پیرایۂ بیان میں پیش کیا ہے، قرآن کریم میں ذکر کردہ قصوں کی سب سے اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سچائی اور فنی تصویر کشی کے ساتھ تعمیری پہلو پوری طرح نمایاں ہوتا ہے، اور بلند اخلاقی قدروں کو ذہنوں کی طرف مائل کرنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قصوں سے صحیح انسانی زندگی کی تعمیر کا جذبہ دل ودماغ میں پیوست ہوجاتا ہے، جس سے نفسیاتی، عقائدی اور تربیتی پہلو کا ایک مکمل نمونہ سامنے آتا ہے، اسی لئے قرآن کریم میں قصوں کے مضامین کی تعداد دیگر اہم اور بنیادی موضوعات کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی ہے، اسی طرح ضرب الامثال کے ذریعے عقیدۂ توحید ورسالت کو پوری وضاحت کے ساتھ دل ودماغ کے آئینے میں منعکس کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔

ترجمہ قرآن اور اس کی نزاکتیں

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کی ترجمانی خواہ وہ کسی زبان میں ہو، عربی زبان وادب کے ذوق اور اس کے بلاغتی پہلوؤں سے واقف ہوئے بغیر ایک دشوار گزار اور غیر طبعی عمل ہے، اردو زبان میں جو تراجم مشہور اور مفید ثابت ہوئے اور زبان وادب کے لحاظ سے بھی طاقتور اسلوب میں کئے گئے ہیں، اس نے معانی ومفاہیم کا سمجھنا بہت آسان کردیا گیا ہے۔

مترجمین حضرات جو عربی زبان کا علم رکھتے ہوئے اس کے ذائقے سے بھی آشنا تھے، وہ اپنی ترجمانی کی کوششوں میں زیادہ کامیاب ہوئے اور ان کے تراجم مقبول خاص وعام ہیں۔

مجھے اس موقعہ پر کسی خاص ترجمے کی طرف اشارہ کرنا مقصود نہیں ہے، لیکن ترجمہ قرآن کے بارے میں مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے خیالات پر مشتمل ایک اقتباس نقل کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ وہ لکھتے ہیں:

''شرح وتفسیر کی بحثوں کو ذرا دیر کے لئے چھوڑ دیئے، محض سادہ ترجمے کو لیجئے، اردو عربی کے درمیان فرق صرفی، نحوی، اسلوبی، انشائی حیثیت سے گویا مشرق ومغرب کا ہے، عربی میں جو اسلوب بیان فصاحت کے اعلیٰ معیار پر ہے، وہ اردو میں کہیں کہیں آکر غیر فصیح ہی نہیں، مہمل بن جاتا ہے۔

عربی میں زور تاکید کے موقع پر ضمیر کو بے تکلف مکرر، بلکہ تین تین بار لے آتے ہیں (انه هو يبدى ويعيد) (انك أنت العزيز الحكيم) (انا سمعنا) (انني أنا الله) (انا نحن نحي الموتى) (نحن نزلنا عليك)۔ اگر لفظی ترجمے کی دھن میں اس قسم کی ترکیبوں میں، اردو میں بھی ضمیر غائب ''وہ'' یا ضمیر حاضر ''تو'' یا ضمیر متکلم ''میں'' یا ''ہم'' دوہرا کر یا تہرا کر لائی جائے تو اردو عبارت تو غارت ہو جائے، لازماً اردو میں اس مفہوم کو لانے کے لئے اردو ہی کے اسلوب سے کام لینا پڑے گا۔ اور ضمیر کے ساتھ کہیں ''ہی'' سے کام لیا جائے گا تو کہیں ''تو'' (بہ واو مجہول) لگا دیا جائے۔

اسی طرح اردو میں حال اور مستقبل کے صیغے مستقل اور علیٰحدہ علیٰحدہ ہیں، عربی میں دونوں کے لئے ایک ہی مضارع کا صیغہ ہے، جسے بجنسہ اردو میں لانے کی کوئی شکل ہی نہیں، اور ترجمے کے لئے ناگزیر ہے کہ دو میں سے کوئی ایک صیغہ حسب مقتضائے مقام اردو کے لئے لفظ ''دو'' یا ''دونوں'' کی تصریح لازمی ہے۔

عربی کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ فقرے میں فعل کو مکرر لے آتے ہیں، کہیں فعل ہی کی کسی حالت میں، اور کہیں اسے اسمی یا مصدری صورت دے کر، اور کہیں موصوف کی صفت خود اسی لفظ سے لے آتے ہیں، جیسے:

(أعذبه عذابا) (فيميلوا ميلا) (فرضتم لهم

فریضة)(مکرا مکرتموہ) (یخرجکم اخراجا)(یفجرونھا تفجیرا)(یخرجکم اخراجا) (قدروھا تقدیرا) (أخرجنی مخرج صدق)(أدخلنی مدخل صدق) ۔وغیرہ پچاسوں ترکیبیں اس قسم کی قرآن مجید میں آتی ہیں،اورعربی میں عین فصاحت کے اعلیٰ معیار پر ہیں،لیکن اردو میں وہی لفظ دہرادینے سے بات بالکل ہی نہ بن سکے گی۔اوراردو میں اس موقعہ کے لئے کوئی دوسرالفظ ہی لاناپڑے گا،کہیں ''بہت'' کہیں ''بڑا'' کہیں ''خوب'' کہیں ''خوب ہی'' کہیں ''مارکے'' وقس علی ھذا۔

اسی طرح ایک خالص عربی ترکیب (فزادھم اللہ مرضا) کی ہے،اب اگر اس کا تحت اللفظ ترجمہ ''بس بڑھادیاان کو اللہ نے ازروئے مرض'' کردیاتواس بیسویں صدی عیسوی والے عام اردوخواں کے پلے کیاپڑے گا،لازم ہے کہ عربی ترکیب سے ہٹ کرسلیس اردو میں 'بس اللہ نے ان کا مرض بڑھادیا'لایاجائے،اورعربی کی ایسی ترکیبیں قرآن مجید میں ایک دوجگہ نہیں،خاصی متعدد موجود ہیں،اورایسی ہی ایک اورالجھن صیغہ مجہول رکھنے میں کبھی کبھی پیش آجاتی ہے،اس کی ایک مثال قرآن مجید کے شروع ہی میں (غیر المغضوب علیھم) میں ملتی ہے،چنانچہ اکثرمترجمین کواس کا ترجمہ صیغہ معروف میں کرناپڑاہے'تو'یا 'تیرا'اضافے کے ساتھ،مثلاً'نہ وہ جن پر تیراغضب نازل ہواہے،'یا'نہ وہ جن پرتو غصہ ہواہے۔

ایک بڑامرحلہ مترجم کے لئے لغات اضداد کا ہے،عربی میں متعدد لفظ ایسے ہیں جومتضاد مفہوموں کے لئے آتے ہیں،مثلاً"شراء"خریدنے کے لئے بھی آتاہےاورفروخت کرنے کے لئے بھی،یا"رجاء"کہ امیدوبیم دونوں موقوں پرآتاہے،"قرء"کہ اس کے مفہوم میں پاکی بھی

داخل ہے اور ناپاکی بھی، چنانچہ عربی میں مستقل کتابیں لغات اضداد پر موجود ہیں، قرآن میں ایسے لفظوں کی بہتات تو نہیں کہی جاسکتی، پھر بھی جہاں کہیں ہیں، وہاں مترجم کو قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوتا ہے اور سہارا سیاق کلام کا لینا ہوتا ہے''۔(۱)

قرآن کریم سے استفادے کی بنیادی شرائط

وہ صفات جن کے بغیر قرآن کریم کے فہم وادراک سے استفادہ کرنے کی راہیں مسدود ہوتی ہیں، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی رائے کے مطابق سات ہیں، قرآن کریم سے استفادے کی پہلی صفت طلب ہے، دوسری صفت ''استماع اور اتباع'' ہے، یعنی اس کو غور سے سننا اور اس کی تعلیمات کی پیروی کرنا، اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ہدایت یاب ہونے اور ان کے ذہین وعقلمند ہونے کی بشارت دی ہے۔ اور تیسری صفت اللہ تعالیٰ کا خوف ہے، اس لئے کہ جو دل اس صفت سے خالی ہو، وہ اللہ کے کلام سے کسی طرح مستفید نہیں ہوسکتا۔ اور چوتھی صفت ایمان بالغیب ہے، یعنی محسوسات اور معلومات کے علاوہ ان تمام باتوں پر ایمان رکھنا جو اس سے ماوراء ہیں، جب تک یہ عقیدہ پوری طرح راسخ نہ ہو، قرآن کریم کی تعلیمات بے اثر ثابت ہوں گی، پانچویں صفت ''تدبر'' ہے، جب تک کہ قرآن کریم کی تلاوت اور اس میں غور وفکر کرنے کا تعلق دل کی گہرائیوں سے نہ ہو، اس کے مضامین کا سمجھنا اور زندگی کو ان کے رنگ میں رنگنا ناممکن ہے۔ چھٹی صفت ''مجاہدہ'' ہے، یعنی قرآن کریم کے سمجھنے اور اس کے معانی ومفاہیم کو دل میں اتارنے کے لئے اپنی توانائیوں کو صرف کرنا، اس کے بغیر قرآن کریم سے استفادہ مشکل ہے، اور ساتویں صفت ''ادب وعظمت'' ہے کہ جب تک دل میں اس کتاب عظیم کی عظمت وتوقیر نہ ہو، اور اس سے غایت درجہ ادب وتعظیم کا معاملہ نہ کیا جائے اور اللہ کے کلام کی محبت ریشہ ریشہ میں سمانہ جائے، اس وقت

---

(۱) تفسیر ماجدی جلد اول: افتتاحیہ

تک اس سے ہدایت اور فیض کا حصول ناممکن ہے۔

ان جملہ صفات پر اگر غور کیا جائے، اور ان کے معنوی پہلو کو پیش نظر رکھا جائے تو قرآن کریم سے استفادہ کرنا آسان ہوسکتا ہے، اور قرآن کریم کی فصاحت کی ترجمانی کرنا اور اس کی آیتوں کا ترجمہ اسی کی روح کے مطابق کرنا سہل اور مفید ہوگا، یہ ہدایت ودعوت کی روح ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز کے اندر سمودی ہے، اور اپنے صاحب ایمان بندوں سے اس روح کو اپنانے کا مطالبہ کیا ہے، اور اسے جزء ایمان بنانے کی دعوت دی ہے، اور تاکید فرمائی ہے۔

تراجم قرآن میں اپنے اپنے دور کا عکس

یوں تو تراجم قرآن کے سلسلہ میں بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، اور ان کو قرآن کریم کی دعوت وہدایت کی روح سے قریب تر ثابت کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے، لیکن اسی کے بالمقابل ایسے ترجمہ اور تفسیر کی مثالیں بھی موجود ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ کے کلام کی صحیح ترجمانی بظاہر مفقود ہے، اس لئے اس نازک عمل پر ہر قسم کے نقد وتبصرہ سے احتیاط برتنا اہل ایمان کی ذمہ داری ہے، اور جہاں تک تراجم قرآن سے زبان وادب کے نمونے اور فکر کو جلا بخشنے کی خدمت کا سوال ہے، اس کا کسی نہ کسی حد تک قرآن کے تمام تراجم میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، اور اس کے نمونے پیش کئے جاسکتے ہیں، اور تقابلی مطالعے کے ذریعے اس کو بیان کرنا ممکن ہے، لیکن یہ ثابت کرنا کہ قرآن کریم کی اس آیت کا ترجمہ ادب وبیان سے زیادہ قریب ہے، اور اور اسی آیت کا ترجمہ کسی دوسرے مترجم کے قلم سے نہ صرف یہ کہ وہ زبان وادب کی چاشنی سے دور ہے، بلکہ وحی کی روح اور اس کی تاثیر سے بہت دور ہے، ایک مشکل امر ہے۔

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تراجم قرآن مجموعی طور پر مفہوم ومعنی کی تشریح وتفسیر کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، اور حضرات مترجمین کا یہ بڑا کارنامہ ہے، بلکہ قرآن کریم کا یہ بھی ایک معجزہ ہے۔

قرآن کریم ایک دائمی معجزہ ہے، جو تا قیامت باقی رہے گا، زمانہ اگر چہ طویل تر ہو، تہذیب وتمدن میں خواہ کتنی وسعت ہو، آلات ووسائل کی کتنی ہی کثرت ہو، نئے نئے علوم اور ایجادات دریافت کئے جائیں، لوگوں کی مشکلات ومصائب میں اضافہ ہو، لیکن اس کی اہمیت وافادیت میں کوئی کمی نہیں آئے گی، جب بھی زندگی متنوع مشکلات کے دائرہ میں آئے گی، قرآن کریم کا گہرا علم ہی ان مشکلات کو حل کرے گا، اور زندگی ومعاشرہ کے مختلف میدانوں میں عروج وترقی کی قندیلیں روشن کرے گا۔

قرآن ہی ایسی کتاب ہے جو انسان کو ہلاکت خیز غلط فہمیوں اور غلط تجاویز، اقدار، اخلاق، اعمال اور معاملات کے کھوٹے پیمانوں سے نکال کر صراط مستقیم پر گامزن کرتی ہے۔

اسلامی دعوت کی بنیاد قرآن کریم ہے، اسلام کے داعی کو ضرورت ہے کہ وہ قرآن ہی کو اپنا رہنما اور رہبر تسلیم کرے، قرآن ہی کی روشنی میں وہ اسلامی عقیدے، عبادات، اخلاقیات اور معاملات کی صحیح ترجمانی کرسکتا ہے، اور انسانی فطرت کو پہچان کر اس کے لئے صحیح غذا فراہم کرسکتا ہے، داعی اسلام کیلئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کے تمام معاملات میں قرآن ہی کو قابل حجت بنائے۔

قرآن میں سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات میں علم کے معانی، اور لکھنے، پڑھنے کے وسائل کا تذکرہ کیا گیا ہے، اسی صفت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اس کا مرتبہ بلند کیا، چنانچہ وہ انسانی خوبیوں کا نمائندہ اور تقرب الی اللہ والے اعمال کا ترجمان ہوا، اس لئے ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کریم کا مطالعہ کرے، اس کی تلاوت کا اہتمام کرے، اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر لعل وگہر کو دریافت کرے، ورنہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے دین کی بنیادوں، عقیدے کے اصول سے بھی واقف نہیں ہوسکے گا، جبکہ یہ بنیادیں ایمان وعمل اور عبادت کی سلامتی کی ضامن ہے، اور دین اسلام پر مکمل انشراح عطا کرنے والی ہے، قرآن کریم میں ہے "ان ھذا القرآن

یھدی للتی ھی اقوم"(۱)(بلاشبہ یہ قرآن سیدھے راستے کی رہنمائی کرتا ہے)۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ قرآن کریم کا نزول رمضان میں ہوا،خود قرآن کریم میں ہے "شھر رمضان الذی أنزل فیه القرآن"(۲)(رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا،رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب نبی بنائے گئے تو آپ کی عمر چالیس سال تھی ،اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاتم النبین بھی بنایا،غارحراء میں عبادت کے دوران آپ پر یہ ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں:"اقرأ باسم ربك الذي خلق، خلق الانسان من علق،اقرأ وربك الأكرم ، الذي علم بالقلم،علم الانسان مالم یعلم"(۳)۔(پڑھئے اللہ کے نام سے جس نے پیدا کیا،جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھئے آپ کا رب بڑی عزت والا ہے،جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا،اور انسان کو ان چیزوں کا علم دیا جن کو وہ نہیں جانتا تھا۔) حضرت عائشہؓ نے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز اچھے خواب سے ہوا،جو رات میں دیکھتے تھے، وہ خواب سپیدۂ صبح کی طرح نمودار ہوتے تھے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خلوت کے عادی ہوگئے،غارحراء میں عبادت کرتے تھے،ساتھ میں زادراہ بھی رکھتے تھے،تاکہ بوقت حاجت ان کو استعمال کر کے عبادت میں تقویت ملے،زادراہ کم پڑنے پر حضرت خدیجہ کے پاس آتے اور زادراہ لے کر غارحراء چلے جاتے، یہاں تک کہ ایک بار حق آپ کے پاس آیا،ایک فرشتہ آیا،اس نے کہا کہ پڑھئے،آپ ﷺ نے فرمایا: میں پڑھا یا ہوا نہیں ہوں،اس نے آپ کو پکڑ کر دبایا،جس سے آپ کو سخت تکلیف ہوئی، پھر چھوڑ دیا اور کہا: پڑھئے،آپ ﷺ نے فرمایا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں،اس نے دوبارہ یہی عمل کیا، پھر چھوڑ دیا اور کہا: پڑھئے،آپ ﷺ نے فرمایا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، پھر اس نے زور سے دبایا اور چھوڑ دیا اور مذکورہ بالا آیتیں پڑھائیں۔(۴)

---

(۱)الاسراء:۹ (۲)البقرۃ:۱۸۵ (۳)العلق:۱۔۵ (۴)سنن ابوداؤد

اس وقت سے وحی کے نزول کا سلسلہ جاری ہوا، اور ۲۳ سال تک رہا، اس مدت میں قرآن حالات اور ضرورت کے لحاظ سے تھوڑا تھوڑا اترتا رہا، علماء کرام کا اتفاق ہے کہ لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر قرآن رمضان کی اہم رات شب قدر میں نازل ہوا، پھر جبرئیل امین ضرورت کے لحاظ سے رسول اکرم ﷺ کے پاس تھوڑا تھوڑا لیکر آتے رہے۔

کیا پہلی وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کے لئے انعام نہیں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ پہلی وحی (جس میں پڑھنے اور لکھنے کا تذکرہ ہے) علم کی بنیاد ہے، علوم ومعارف کا سرچشمہ ہے، اسی سے علم وثقافت کی سبیل لگائی گئی، کیونکہ انسان اسی صفت سے دوسری مخلوقات کے درمیان امتیازی شان رکھتا ہے، اگر علم کا یہ بحر بیکراں نہ ہوتا تو انسانی نظام زندگی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا۔

قرآن کریم اصحاب فہم وبصیرت کو زمین وآسمان کی بے شمار مخلوقات میں غور کرنے کی دعوت دیتے ہوئے کہتا ہے:

"لله ملك السماوات والأرض والله على كل شئ قدير، إن في خلق السماوات والأرض واختلاف الليل والنهار لآيات لأولي الألباب ، الذين يذكرون الله قياما وقعودا وعلى جنوبهم ويتفكرون في خلق السماوات والأرض ربنا ماخلقت هذا باطلا ، سبحانك فقنا عذاب النار" (سورہ آل عمران:۱۸۹۔۱۹۱)

ایک دوسری جگہ کائنات کی متعدد مخلوقات کی تسبیح وتحمید کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے:

"هو الذي يريكم البرق خوفا وطمعا وينشئ السحاب الثقال ويسبح الرعد بحمده والملائكة من خيفته ، ويرسل الصواعق فيصيب بها من يشاء وهم يجادلون في الله ،وهو شديد المحال" (سورہ رعد:۱۲۔۱۳)

سورۂ ابراہیم میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور کائنات کے اندر جو بے شمار نشانیاں ہیں ان کے مسخر کئے جانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آیا ہے:

"اللہ الذی خلق السماوات والأرض ،وأنزل من السماء ماء فأخرج به من الثمرات رزقا لكم، وسخرلكم الفلك،لتجرى في البحر بأمره ،وسخرلكم الأنهار،وسخرلكم الشمس والقمردائبين، وسخرلكم الليل والنهار،وآتاكم من كل ماسألتموه،وان تعدوا نعمة الله لاتحصوها، ان الانسان لظلوم كفار"

(ابراھیم:۳۲۔۳۴)

ان آیتوں میں قرآن کریم کا سائنسی اعجاز پورے طور پر نمایاں ہے، جب کہ بیانی اعجاز اس کے قارئین کو مسحور کررہا ہے، عرب کے فصحاء وبلغاء نے جب اس کلام کو سنا تو وہ یہ کہتے ہوئے سربسجود ہوگئے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔

قرآن کریم کا تاریخی اور قصصی اعجاز اقوام وملل کے قصوں اور انبیاء کے واقعات میں پنہاں ہے، یہ قصے بڑے اچھے پیرایۂ بیان میں ذکر کئے گئے ہیں، تاکہ دعوت کا عمل کامیابی سے ہمکنار ہو، اور سامعین کے دل ان سے متاثر ہوں، سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اور دیگر سورتوں میں موسیٰ علیہ السلام اور فرعون، اصحاب کہف، حضرت خضر اور موسیٰ وغیرہ کے واقعات اسی پس منظر میں ذکر کئے گئے ہیں، بعض قصے مکرر ہیں اور بعض صرف ایک بار ذکر کئے گئے ہیں، سورۂ شعراء میں قصوں کی ایک عجیب وغریب ترتیب ہے، اور سورۂ قصص تو حضرت شعیب اور موسیٰؑ کے واقعہ کو ایسے دلکش انداز میں بیان کرتی ہے جس سے نفس انسانی متاثر ہوکر دم بخود ہوجاتا ہے، سورۂ غافر میں فرعون کے ماننے والوں میں ایک مومن شخص کا واقعہ ہے اس نے کس طرح برملا حقیقت کا اظہار اور موسیٰؑ کی موقف کی ترجمانی کی۔ (غافر:۲۳۔۳۵)

قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والے کو اعجاز کے مختلف اسباب نظر آئیں گے، اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا، امام قرطبیؒ اپنی تفسیر الجامع لاحکام القرآن میں لکھتے ہیں:

قرآن کریم میں اعجاز کی دس شکلیں ہیں۔

۱۔ نظم قرآنی کا اعجاز

۲۔ اسلوب بیان کا اعجاز

۳۔ فصاحت کا اعجاز

۴۔ الفاظ کے حسن استعمال کا اعجاز

۵۔ ماضی کے واقعات کا اعجاز

۶۔ غیبی پیشین گوئیوں کا اعجاز

۷۔ احکام ومسائل کا اعجاز

۸۔ مصلحتوں اور حکمتوں کا اعجاز

۹۔ آیتوں میں ہم آہنگی اور یکسانیت کا اعجاز

۱۰۔ اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے پورا ہونے کا اعجاز

اسلامی قصہ: مقصدیت اور فنی حسن و جمال کا مظہر

(سورۂ یوسف کی روشنی میں)

کسی واقعہ کو دلچسپ اور خوبصورت شکل میں پیش کرنے کے لئے قصہ کی اصطلاح اہل ادب کے نزدیک مقبول و معروف ہے، اس کا بنیادی عنصر، خیال اور وجدان کو قرار دینا بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن اس کے ساتھ مقصدیت کی روح اور فنی خصوصیات کا عکس پوری طرح نمایاں ہونا بھی ضروری ہے، اسلامی ادب میں قصہ کی اہمیت اور اس کے بنیادی کردار سے انکار نہیں کیا جا سکتا، سب سے پہلے خیال کی شیرازہ بندی کچھ اس طرح ہو کہ اس کے پڑھنے اور سننے کے لئے ایک سازگار فضا تیار ہو جائے، اور اس کے مثبت کردار سے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ ادبی اور معنوی فائدہ حاصل ہو سکے۔

اسلامی قصہ کی یہ خصوصیت بھی بہت اہم ہے کہ اس میں سچائی اور فنی افادیت کے ساتھ تعمیری پہلو پوری طرح نمایاں ہوتا ہے، اور بلند اخلاقی قدروں کی طرف ذہنوں کو مائل کرنے اور صحیح انسانی زندگی کی تعمیر کا جذبہ دل و دماغ میں پیوست ہو جاتا ہے، اسی کے ساتھ نفسیاتی، عقائدی اور تربیتی پہلو کا ایک مکمل نمونہ سامنے آتا ہے۔

یوں تو قرآن کریم میں مذکور سبھی قصوں کے اندر ادبی اور فنی خصوصیات نہایت مؤثر انداز میں پائی جاتی ہیں، اور ان کا تربیتی اور دعوتی عنصر پوری طرح نمایاں ہے، لیکن ان تمام مذکورہ قصوں میں حضرت یوسف بن یعقوب علیہ السلام کا قصہ اپنے ادبی اور فنی منہج کے لحاظ سے ایک معجزانہ شان رکھتا ہے، چنانچہ قصہ شروع ہونے سے پہلے کتاب مبین کی نشانیوں اور اس کو عربی زبان میں نازل کئے جانے کا حقیقت پسندانہ تذکرہ کرتے ہوئے تاکید کے ساتھ

فرمایا گیا ہے: إنا أنزلناه قرآنا عربيا لعلكم تعقلون: بلاشبہ ہم نے کتاب مبین کو عربی زبان میں نازل کیا ہے، تاکہ لوگ اسے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں، اور اس کے ساتھ ہی یوسف علیہ السلام کا قصہ شروع ہو جاتا ہے، جس کو نہایت بلیغ پیرایہ میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے قصہ کی ابتدا ہو رہی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت کو اس قصہ کا محور قرار دیا گیا، اور ان کی زندگی کے تمام گوشوں کو شروع سے آخر تک انتہائی بلیغ اور ادب وفن کے ایک نادر و نایاب نمونہ کے طور پر پیش کرنا کسی بھی ادیب وفنان اور کسی بھی قادر الکلام صاحب قلم یا فن نگارش میں یکتائے روزگار کی استطاعت وطاقت سے باہر ہے۔

یوسف علیہ السلام کی شخصیت ہر طرح کے انسانی پہلوؤں سے عبارت ہے، اس میں غم بھی ہے اور خوشی بھی ہے، نا امیدی اور آزمائشوں کے سخت سے سخت تر حالات بھی ہیں، اور بھائیوں کی آزمائش، تاریک کنویں میں پھینکے جانے کی آزمائش اور ایک تجارتی قافلہ کے ذریعہ کنویں سے نکالکر بازار مصر میں غلام کی حیثیت سے کوڑیوں کے مول بیچے جانے کی آزمائش، عزیز مصر کی بیوی کے حسن یوسف پر فدا ہونے کی آزمائش، جیل خانہ میں زندگی گذارنے کی آزمائش، اسی طرح وزیر خزانہ ہونے کی آزمائش جو دیگر آزمائشوں سے زیادہ سخت تھی، اس لئے کہ مالیات کی ذمہ داری اور اس کو صحیح طریقہ سے انجام دینا انسان کے لئے ایک بڑی آزمائش ہے، اسی کے ساتھ حکومت کی ذمہ داریوں کو نباہنا، قحط سالی کا سامنا کرنا، بھائیوں کا مدد حاصل کرنے کے لئے آنا وغیرہ، لیکن انہیں مسلسل آزمائشوں کے درمیان سے نکل کر بلند درجات کے حصول اور ان کے تقرب إلی اللہ کا ذریعہ بننا، بھائیوں کا اپنے قصور کی معافی طلب کرنا، اور ان کا ممنون کرم ہونا، والد عمزدہ کی آنکھوں کا تارا بننا، اور اس خواب کی تعبیر عملی طور پر دیکھنے کی سعادت حاصل ہونا، جس میں شروع ہی سے ان کی بلند زندگی اور عزت وعظمت کا اشارہ پنہاں تھا، اور نبوی زندگی کے خط وخال کی بشارت ان کے اس کلام میں جو امتنان وتشکر اور دعاء کا مظہر ہے موجود ہے:

"رب قد آتيتني من الملك، و علمتني من تأويل

الأحاديث، فاطر السموات والأرض أنت وليي في الدنيا والآخرة، توفني مسلما وألحقني بالصالحين"

''اے میرے پروردگا تو نے مجھے سلطنت عطا کی ہے اور تو نے مجھے خواب کا علم دیا ہے، اے آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا وآخرت میں میرا ولی اور کارساز ہے۔ تو مجھے اسلام کی حالت میں اٹھا، اور نیکوں کی جماعت میں ملادے۔'' (سورہ یوسف:۱۰۱)

اور تمام آزمائشوں میں کامیابی کی کلید ان الفاظ میں ظاہر ہوتی ہے۔: "إنه من يتق و يصبر، فإن الله لا يضيع أجر المحسنين"۔ (بات یہ ہے کہ جو بھی پرہیز گاری اور صبر کرے تو اللہ تعالیٰ کسی نیکوکار کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔) (یوسف:۹۰)

اب اس قصہ کو مختصراً قرآن کریم کے بیان کی روشنی میں سپرد قلم کرنے کی اجازت دیں:

حضرت یوسف علیہ السلام نے بچپن کے تقریباً سات سال گذرنے پر ایک عجیب وغریب خواب دیکھا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ۱۱ ستارے اور چاند اور سورج ان کو سجدہ کررہے ہیں، یہاں پر یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے عمر میں بڑے ۱۱ ر بھائی تھے، حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے چھوٹے بھائی بنیامین دوسری ماں سے تھے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس خواب کی اہمیت کو سمجھ لیا، اور اپنے محبوب بیٹے یوسف علیہ السلام سے اس کو راز رکھنے کا حکم دیا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ راز کسی طرح افشاء (LEAK) ہوگیا، اور بھائیوں کے دل میں سخت حسد اور غیظ وغضب کے جذبات پیدا ہوئے، انہوں نے بہتر سمجھا کہ کسی طرح یوسف علیہ السلام کو راستہ سے ہٹادیں، اور یہ قصہ ہمیشہ کے لئے پاک ہوجائے، انہوں نے اس ارادہ پر عمل درآمد کرنے کے لئے ایک ایسی سازش تیار کی، جو ان کو اپنے ارادہ میں کامیاب کرسکے۔

بھائیوں کی جماعت اپنے والد یعقوب علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئی، اور نہایت معصومی کے ساتھ انہوں نے عرض کیا کہ ابا جان! ہم نے کل آئندہ ایک کھیل کا

پروگرام جنگل کے قریب میدان میں بنایا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ یوسف (علیہ السلام) بھی اس میں شریک ہوں، اور ہمارے ساتھ چلیں، آپ اجازت دے دیں، حضرت یعقوب علیہ السلام نے بادل ناخواستہ اجازت تو دے دی، لیکن فرمایا کہ یوسفؑ کی جدائیگی مجھے بہت شاق ہے، اور مجھے یہ بھی خطرہ ہے کہ اس بچے کو جنگل کے قریب کہیں بیٹھا کر تم کھیل میں مشغول ہو جاؤ، اور بھیڑیا اس کا شکار کر لے، صاحبزادگان نے عرض کیا کہ ابا جان! ہم اتنی بڑی جماعت ہیں، اگر یوسف کو ہمارے ہوتے ہوئے بھیڑیا کھا جائے تو ہم سے زیادہ ناکام کون ہوسکتا ہے؟ آخر کار حضرت یعقوب علیہ السلام نے ڈرتے ڈرتے اجازت دی، بھائیوں نے پہلے ہی سے طے کر رکھا تھا کہ یوسف کو اپنے غیظ وغضب اور حسد کی آگ بجھانے کے لئے قتل کر دیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: و أوحينا اليه لتنبئنهم بأمرهم هذا وهم لا يشعرون۔ ہم نے یوسف کے دل میں یہ بات ڈالی کہ گھبراؤ نہیں، تم ان کی اس حقیقت کی خبر مستقبل میں دو گے، جبکہ وہ اس سے بے خبر ہوں گے، اور یوسف علیہ السلام کے خلاف سازش میں اپنے آپ کو کامیابی سے ہم کنار سمجھ چکے ہوں گے۔ (سورہ یوسف: ۱۵)

رات ہوتے ہوتے روتے دھوتے اپنے والد کے پاس پہونچے، اور کہنے لگے: ابا جان! ہم دوڑ میں مقابلہ کر رہے تھے، اور یوسف کو اپنے سامانوں کے پاس بیٹھا دیا تھا، اتنے میں بھیڑیا آیا اور اس نے یوسف کو اپنا نوالہ بنالیا، اس خبر پر یقین دلانے کے لئے ان کے کرتے کو کسی اور جانور کے خون سے تر بتر کر کے لائے، اور اپنے والد کے سامنے اس کو پیش کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ہم کتنے ہی سچے ہوں، آپ ہماری بات پر یقین نہیں کر سکتے، انہوں نے کہا کہ یہ واقعہ غلط ہے، تمہارے نفسانی جذبات نے اس بات پر تمہیں آمادہ کیا کہ تم مجھ کو مطمئن کرنے کے لئے ایک جھوٹے واقعہ کو سچائی کا لباس پہنانے کی کوشش کرو، بہر حال صبر جمیل کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں، اور جو خبر تم دے رہے ہو اس پر اللہ تعالیٰ ہی سے مدد کی درخواست ہے۔ فصبر جميل والله المستعان على ما تصفون۔ (سورہ یوسف: ۱۸)

ادھر یوسف علیہ السلام کو "قتل" کرنے کے مشورہ کے بعد بعض بھائیوں کے مشورہ سے انھیں زندہ رکھا گیا، لیکن ان کو ایک تاریک اور بڑے کنویں میں ڈال دیا گیا، صبح کو جب ادھر سے ایک تجارتی قافلہ گذرا، اور انہوں نے پانی لینے کے لئے کنویں میں ڈول لٹکایا تو ان کو اچانک کنویں کی نچلی کگار پر ایک بچہ بیٹھا ہوا نظر آیا، انہوں نے آواز لگائی، مبارک ہو یہ خوشخبری، کنویں میں ایک خوبصورت بچہ بیٹھا ہوا ہے، اور اس کو ایک قیمتی سامان تجارت سمجھ کر چھپا دیا، ان کی ان حرکتوں کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہے تھے۔

آخر کار بازارِ مصر میں لے جا کر دوسرے سامان تجارت کی طرح اس بچہ کو بھی چند ٹکوں میں بیچ دیا، ان کو بچے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، خریدار اس قدر سستا مال پا کر اپنی بیگم سے مخاطب ہوا، اور کہا کہ یہ بچہ شریف النسل معلوم ہوتا ہے، اس کی دیکھ ریکھ کرو، امید ہے کہ وہ تمہارے لئے سودمند ہوگا، یا ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں گے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وكذلك مكّنا ليوسف في الأرض ولنعلمه من تأويل الأحاديث والله غالب على أمره ولكن أكثر الناس لا يعلمون (یوسف:۲۱)

"آخر کار اسی طرح رفتہ رفتہ ہم نے سرزمین مصر میں یوسف کو جگہ دی، اور اس لئے بھی تاکہ ہم ان کو خوابوں اور واقعات کی تعبیر کا علم عطا کریں، اور اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا، وہ اپنے تمام معاملات (امر و نہی) پر پوری طرح قادر ہے، اگر چہ بہت سے لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔"

اب حضرت یوسف علیہ السلام جسم و عقل دونوں اعتبار سے پختہ ہو چکے ہیں، اور علم و حکمت، یعنی شریعت و نبوت کا علم حاصل کرنے اور اس کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے طریقے سے پوری طرح باخبر ہیں، یہ انعام تھا ان کی نیکیوں اور آزمائشوں سے صبر و تحمل کے ساتھ گذر جانے کا، لیکن ابھی ان کے تقویٰ کا امتحان باقی تھا، عزیز مصر کی بیوی (زلیخا)

نے موقع پا کر ان کو بہکانا چاہا، اور کمرے کے سارے دروازے بند کر کے ان کو اپنی طرف بلانے لگی، قریب تھا کہ حضرت یوسف کے پائے استقامت میں لغزش پیدا ہو جاتی، اگر انہوں نے اپنے رب کی نشانی نہ دیکھ لی ہوتی، جس کی وجہ سے وہ ہر طرح کی لغزش سے بچ گئے، اور ایسا کیوں نہ ہوتا، جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کے سچے اور برگزیدہ بندے تھے، حضرت یوسف مین دروازہ (Main Door) کی طرف لپکے، زلیخا عزیز مصر کی بیوی ان کے پیچھے دوڑی، اور پیچھے سے ان کا کرتا پھاڑ دیا، دروازہ جوں ہی کھولا، تو عزیز مصر سامنے کھڑے ہوئے نظر آئے، ان کو دیکھتے ہی زلیخا نے دریافت کیا کہ: ایسے آدمی کی کیا سزا ہو سکتی ہے، جو آپ کی عزت وحرمت پر بری نیت سے حملہ آور ہو، اس سوال کا جواب خود ہی پیش کرتے ہوئے کہنے لگی کہ یا تو ان کو جیل کی ہوا کھلائی جائے یا کوئی تکلیف دہ سزا تجویز کی جائے۔

نہیں، نہیں، میں نے کچھ نہیں کیا، بلکہ خود انہیں نے مجھ سے بری خواہش کا اظہار کیا، حضرت یوسف نے کہا۔

اور لگے ہاتھوں ایک خاندانی گواہ بھی سامنے آ گیا، اور فیصلہ کن انداز میں اس نے کہا کہ اگر ان کا کرتا آگے سے پھٹا ہو تو زلیخا اپنے قول میں سچی ہے، اور یوسف جھوٹے ہیں، لیکن اگر کرتا پیچھے سے پھٹا ہو تو زلیخا جھوٹی ہے اور یوسف کی بات سچی ہے، اسی وقت عزیز خاوند نے چیک کیا تو کرتا پیچھے سے پھٹا پایا تھا، اور وہ بے ساختہ بول اٹھے کہ یہ تم عورتوں کی شرارت ہے، اور عورتوں کی شرارت۔ الامان الحفیظ۔

پھر یوسف کی طرف متوجہ کر ہو کر بولے! یوسف! اس قصہ کو نظر انداز کرو، اور اے زلیخا! اپنے گناہوں کی معافی مانگو، بلاشبہ تمہیں قصوروار ہو۔

ادھر شہر میں عورتوں کے ماحول میں اس واقعہ کا بڑا چرچا ہوا، ہر ایک نے دوسرے سے کہا: بہن! تمہیں معلوم ہے کہ عزیز مصر کی بیوی اپنے غلام کے محبت میں فریفتہ ہو کر اور خواہش نفس سے مغلوب ہو کر کس طرح اس کو کمرہ میں بند کیا، یہ کتنی بے حیائی اور بے شرمی بات ہے۔

جب زلیخا نے ان کی اس بیباکانہ گفتگو کو سنا تو ایک ترکیب ان کے ذہن میں آئی، ان سب عورتوں کو اپنے گھر بلا بھیجا، اور ان کے لئے ایک محفل آراستہ کی اور دعوت طعام دی، اور ہر ایک کے سامنے پھلوں کی پلیٹیں (پیش کیں) اور سب کے ہاتھ میں ایک ایک چاقو دے دیا، اور یوسف علیہ السلام کو ان کے سامنے آنے کا حکم دیا، عورتیں ان کے حسن و جمال کو دیکھنے میں اس طرح بے خود ہوئیں کہ پھل کاٹنے کے بجائے انہوں نے اپنے ہاتھوں کو کاٹ لیا، اور سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ سبحان اللہ! یہ تو ایک عظیم و کریم فرشتہ ہے۔

یہی وہ مرکز ثقل ہے، جس کے لئے تم نے میری طرف ملامت کے تیر پھینکے تھے، زلیخا نے کہا، بلاشبہ میں نے اس فرشتہ کو بہلانے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ بچ گیا، اگر اس نے میرے حکم کی تابعداری نہیں کی، تو جیل میں ڈالا جایا جائے گا، اور بے عزت ہوگا، حضرت یوسف نے دعا کی کہ اے میرے مولیٰ! جیل میرے لئے زیادہ پسندیدہ جگہ ہے، بنسبت اس فعل کے جس کی مجھے دعوت دی جارہی ہے، میرے اللہ! اگر آپ نے ان کے مکر و فریب سے مجھ کو دور نہیں کیا، تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا، اور میرا شمار جہالت کے علمبرداروں میں ہوگا، اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی، ان کی فریب کاریوں کو ان سے دور کر دیا، اور بیشک وہ دعاؤں کو سننے والا، اور دل کی باتوں کو جاننے والا ہے۔ دعا قبول ہو چکی ہے۔ لیکن زلیخا کا مکر و فریب جاری ہے، اس عشق ناگہانی سے بچنے کے لئے ان کے خاندان کے لوگوں کو بہتر معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام کو گھر کے اندر قیام کرنے کے بجائے کچھ دنوں کے لئے جیل میں منتقل کر دیا جائے۔

اب یوسف علیہ السلام جیل جارہے ہیں، ان کے ساتھ دو نوجوان اور بھی جیل کی سزا کاٹنے کے لئے ان کے ساتھ داخل ہوئے، جیل کی زندگی میں اپنے علم و حکمت کی بنا پر جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو عطا ہوتھا، سب کی نظروں میں محبوب اور معزز ہو گئے، ان دونوں نوجوانوں نے خواب دیکھا، ایک نے یہ دیکھا کہ میں انگور کی شراب بنا رہا ہوں،

دوسرے نے یہ خواب دیکھا کہ میں اپنے سر کے اوپر روٹیاں رکھے ہوا ہوں، اور پرندے اس کو کھا رہے ہیں، دونوں نے یوسف (علیہ السلام) سے عرض کیا: آپ براہ کرام اس کی تعبیر ہم کو بتایئے، اس لئے کہ ہم آپ کو تعبیر دینے کا اہل سمجھتے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے اس موقع کو عقیدۂ توحید و رسالت کو پیش کرنے کے لئے غنیمت سمجھا، کہا کہ جیل سے تمہارا کھانا آنے سے پہلے میں تم کو تمہارے خواب کی تعبیر بتادوں گا۔ اس کا علم مجھ کو میرے پروردگار نے عطا کیا ہے، سنو! میں نے اس قوم کی ملت کو ترک کر دیا ہے، جو اللہ تعالیٰ پر ایمان، آخرت پر یقین نہیں رکھتے، میں تو اپنے آباء و اجداد کی ملت پر قائم ہوں، ان کا شمار انبیائے کرام میں تھا، ابراہیم، اسحاق، یعقوب، ہم کو اجازت نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کریں، یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل تھا ہم پر اور سبھی لوگوں پر، اور ناشکروں کی تعداد تو بے شمار ہے۔

اے میرے جیل کے ساتھیو! یہ بتاؤ کہ کیا بہت سے معبود بہتر ہیں یا ایک اللہ جو خالق و غالب ہے؟ اللہ کو چھوڑ کر جو لوگ مصنوعی خداؤں کو پوجتے ہیں، وہ صرف نام کے خدا ہیں، جن کو تم نے اور تمہارے آباو اجداد نے خدا بنالیا ہے، اور اللہ کی طرف سے اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا حکم نہیں چل سکتا۔ ان کا حکم ہے کہ صرف تم انہیں کی عبادت کرو، اور یہی متوازن دین اور سیدھا مذہب ہے، خواہ اس سے بہت سے لوگ واقف نہ ہوں۔

میرے جیل کے دونوں ساتھیو! اپنے خوابوں کی تعبیر سن لو! تم میں سے ایک اپنے آقا کو شراب پلائے گا، اور دوسرے کو سولی پر چڑھا دیا جائے گا، اور پرندے اس کے سر کو نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ تم دونوں کے خواب کی یہی تعبیر ہے۔

ان دونوں ساتھیوں میں سے ایک جس کے بارے میں ان کو یہ اندازہ ہوا کہ وہ جلد ہی جیل سے رہا ہو جائے گا، حضرت یوسف نے اس سے کہا: یہاں سے نکلنے کے بعد

اپنے آقا سے میرا ذکر کرنا، لیکن نکلنے کے بعد اس کو شیطان نے یہ بات بھلا دی کہ وہ اپنے آقا سے یوسف علیہ السلام کا ذکر کر کے قید سے نجات دلائے، اس طرح وہ کئی سال تک جیل میں رہ گئے۔

دوسری جانب بادشاہ نے خواب دیکھا کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں، اور سات بالیاں سرسبز ہیں اور بقیہ خشک ہیں، اے درباریو! مجھے اس خواب کی تعبیر بتاؤ، اگر تم تعبیر کا علم رکھتے ہو، سب نے کہا کہ یہ پریشان خیالی ہے، اور ہم پریشان خیالی کے تعبیر سے واقف نہیں ہیں، جیل کے دونوں ساتھیوں میں سے جو چھوٹ کر آیا تھا اور دربار میں بیٹھا ہوا تھا ایک عرصہ کے بعد اس کو اپنے خواب کی تعبیر یاد آئی، اس نے کہا کہ میں اس خواب کی تعبیر تم کو بتاؤں گا، مگر شرط ہے کہ تم مجھے جیل میں یوسف (علیہ السلام) سے ملنے کی اجازت دو۔

اجازت مل جاتی ہے، اور جیل میں پہونچ کر وہ حضرت یوسف سے ملاقات کرتا ہے، سلام وتعارف کے بعد وہ اس طرح گویا ہوتا ہے: اے سچے یوسف! ذرا اس خواب کی تعبیر بتاؤ، سات موٹی گائیں ان کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سبز بالیاں ہیں، اور بقیہ خشک ہیں، ممکن ہے کہ میں اس خواب کی تعبیر لیکر بادشاہ اور درباریوں کے پاس جاؤں اور ان کو وہ تعبیر معلوم ہو جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام خواب کی تعبیر اس طرح بتا رہے ہیں: سات سال تک تم مسلسل زراعت کرتے رہو گے، فصل تیار ہونے کے بعد جب اسے کاٹو تو اس کو بالیوں ہی کے اندر چھوڑ دو، اور اپنے کھانے کے لئے مناسب مقدار میں نکال لو، پھر اس کے بعد قحط کے سات سال سخت ہوں گے، اور جو کچھ تم نے بچا کر رکھا ہوگا وہ سب کھا جاؤ گے، سوائے ایک قلیل مقدار کے جس کو تم نے بچا کر رکھا ہے، پھر اس کے بعد خوشحالی کا ایک سال ایسا آئے گا کہ اس میں لوگوں کی من جانب اللہ مدد کی جائے گی، اور اس سال

میں لوگ انگور کا شیرہ نچوڑیں گے۔

اب بفضل خداوندی یوسف علیہ السلام کے عروج کا دور شروع ہوتا ہے، بادشاہ مصر ریان بن الولید، اپنے خواب کی تعبیر براہ راست معلوم کرنا چاہتا ہے، جیل سے رہائی اور دربار میں حاضری کی امید پیدا ہو چلی، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام اس رہائی کو اس وقت تک قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جب تک ان کو زلیخا کی سہیلیوں کے ہاتھ کاٹنے کی حقیقت نہ معلوم ہو جائے، بادشاہ نے ان سہیلیوں سے یوسف علیہ السلام کو ورغلانے کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کی کیا حقیقت ہے،'' حاشاوکلا! ہم نے یوسف کے اندر کوئی برائی نہیں دیکھی'' سہیلیوں نے جواب دیا، اور اسی وقت عزیز مصر کی بیوی نے بات صاف کر دی اور کہا: اب سچائی کھل گئی، میں نے خود ان کو ورغلایا تھا، وہ بالکل سچے ہیں، حضرت یوسفؑ نے کہا کہ یہ بات میں نے صرف اس غرض سے کہی کہ عزیز مصر کو معلوم ہو جائے کہ میں نے ان کے ساتھ کوئی خیانت نہیں کی ہے، اور ظاہر ہے کہ خیانت کا فریب کبھی کارآمد نہیں ہوتا، میں یہ دعوی بھی نہیں کرتا کہ میں نفس کے عیب سے پاک ہوں، نفس تو برائی کا سب سے بڑا داعی ہے، ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے خزانے میں رحم ومغفرت کی کوئی کمی نہیں ہے۔

بادشاہ گویا ہوئے: یوسف کو میرے پاس لاؤ، میں ان کو اپنا خاص آدمی بنالوں گا، حضرت یوسفؑ آئے، بادشاہ نے ان سے بات کی اور کہا کہ تم یقینی طور پر آج سے میرے خاص مددگار اور معتبر ہو گئے، حضرت یوسفؑ نے کہا کہ مجھے ملک کے خزانوں کا پاسبان بنا دیجئے، میں انشاء اللہ تعالیٰ ان کی خوب حفاظت کرنے کے فن سے واقف ہوں۔

ان تمام مرحلوں کے بعد یوسف علیہ السلام کو ملک کے خزانوں پر پورا قابو حاصل ہو گیا، جہاں چاہتے اپنا ٹھکانا بناتے، اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے جس کو جو چاہیں عطا کر دیں، احسان کا بدلہ کبھی ضائع نہیں ہوتا، اسی کے ساتھ اہل ایمان وتقویٰ کے

لئے آخرت کا اجر بہت قیمتی اور بہتر چیز ہے۔

پھر قحط کی شدت ہوتی ہے، حضرت یوسفؑ کے بھائی وزیر خزانہ کے پاس طالب مدد ہو کر آتے ہیں، ان کو وہ خوب پہچان لیتے ہیں، لیکن بھائیوں کو اس کا ادراک نہیں ہو پاتا کہ وزیر خزانہ یوسف علیہ السلام ہیں، انہوں نے درخواست منظور کر لی اور ان کی بھرپور مدد کی، اور یہ بھی کہا کہ تم اپنے سوتیلے بھائی کو بھی لاؤ، تاکہ مزید تمہارے لئے سامان زندگی کا انتظام ہو سکے، اگر تم یہ نہ کر سکو تو پھر آنے کی ضرورت نہیں ہے، بھائیوں نے کہا کہ ہم ان کے والد سے درخواست کریں گے اور ان کی اجازت کے بعد ہم ضرور ان کو لے کر آئیں گے۔ اس کے لئے ایک ترکیب حضرت یوسفؑ کے ذہن میں آئی، انہوں نے غلے کی جو قیمت ادا کی تھی چپکے سے ان کے سامانوں میں رکھوادی، تاکہ گھر پہونچ کر جب وہ دیکھیں تو پھر یقیناً اپنے ساتھ لانے کی کوشش کریں گے..... آخر کار حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کو بھائیوں کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی، اور وصیت کر دی کہ شہر میں تم لوگ الگ الگ دروازوں اور راستوں سے داخل ہونا۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو پا کر بے حد خوش ہوئے اور ان کو بتا دیا کہ میں یوسف ہوں، تم ذرا بھی غم نہ کھانا اور نہ ان لوگوں کی حرکتوں سے متاثر ہونا انہوں نے اپنے بھائی بنیامین کو روکنے کے لئے ایک دوسری ترکیب کی، ایک قیمتی پیالہ جس سے پانی پینے کا کام لیا جاتا تھا، ان کے سامانوں میں رکھوادیا، اور جب بھائیوں کا قافلہ روانہ ہوا تو ان کے راستے میں آواز لگائی گئی: اے قافلے والو! تم نے چوری کی ہے، انہوں نے تعجب سے پوچھا: کون سی چیز چوری ہوئی ہے: آواز آئی کہ بادشاہ کا پیالہ جو پیمانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا، جو کوئی اس کو لائے گا اس کو مزید ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر غلہ دیا جائے گا، بھائیوں نے کہا کہ آپ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم زمین میں فساد پھیلانے کے لئے نہیں آئے ہیں اور نہ ہمارا چوروں سے کوئی تعلق ہے۔

لیکن سامان کی جانچ کی گئی تو بالآخر بنیامین کے اسباب میں وہ پیالہ ملا، بادشاہ کے خدمت گذاروں نے بنیامین کو واپس لانے کی یہ ترتیب کی، ورنہ بادشاہ کو قانونی اعتبار سے ان کو روکنے کا کوئی حق نہیں تھا، یہ تدبیر منجانب اللہ تھی، اور رفع درجات کا ذریعہ بھی، اسی کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نرفع درجات من نشاء، جس کا مرتبہ ہم بلند کرنا چاہتے ہیں بلند کرتے ہیں، اور ہر ذی علم سے اوپر ایک دوسرا جاننے والا بھی ہے، پھر ایک موقع ملا اور اب بھائیوں نے کہنا شروع کیا کہ اگر انہوں نے چوری کی، تو اس سے پہلے ان کے ایک بھائی نے چوری کی تھی، اس بات کو سن کر حضرت یوسف علیہ السلام نے صبر کر لیا، اور ان کے سامنے کوئی اشارہ و کنایہ بھی نہیں کیا، صرف یہ کہا کہ تم اپنے منصب کو پہچان نہ سکے، اور تمہاری باتوں سے اللہ تعالیٰ خوب واقف ہے۔

پھر کہنے لگے: عزیز مصر! اس بھائی کے ایک بوڑھے باپ ہیں، اس لئے ہم میں سے کسی کو آپ اس کی جگہ پر روک لیجئے، ہم یقین رکھتے ہیں کہ آپ احسان کرنے والوں میں شمار ہوتے ہیں، حضرت یوسفؑ نے کہا: اللہ کی پناہ! ہم تو اسی کو پکڑیں گے، جس کے پاس ہمارا سامان ملا ہے، ورنہ اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں ہوسکتا، جب ان سے امیدیں منقطع ہوگئیں آپس میں بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے، ان کے بڑے بھائی نے کہا کہ کیا تم کو معلوم نہیں ہے کہ تمہارے والد نے تم سے عہد لیا ہے اللہ کے نام سے، اس سے پہلے جو قصور یوسف کے بارے میں کر چکے ہو، وہ سب کو معلوم ہے، میں یہاں سے ہرگز ٹلوں گا نہیں، جب تک کہ میرے والد کی طرف سے مجھے اجازت نہ مل جائے، یا، اللہ تعالیٰ اُحکم الحاکمین کی طرف سے تمہارے لئے کوئی فیصلہ ہو جائے، فوراً واپس جاؤ، اور اپنے والد کو بتاؤ کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی، ہم کو اس کا کچھ پتہ نہیں تھا، اور نہ ہم غیب کی باتوں سے واقفیت رکھتے ہیں، اگر وہ چاہیں تو اس بستی سے پوچھ سکتے ہیں، اور اس قافلہ سے بھی دریافت کر سکتے ہیں، جس میں ہم شریک تھے، ہم بیشک سچ بولنے والے اور سچ کی پیروی

کرنے والے ہیں، والد نے کہا: تم نے ایک بات اپنی طبیعت سے گھڑلی ہے، تو سوائے صبر کے اب کوئی چارۂ کار نہیں، مجھے پوری امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو مجھ تک پہونچائیں گے، ان سے زیادہ واقف اور باحکمت کوئی نہیں۔

اور ان سے رخ پھیر کر کچھ اس طرح گویا ہوئے: ہائے افسوس: یوسف، یہ دوسری چوٹ تھی جو دل پر اثر انداز ہوئی، اور بقول شاعر: ع

بیت گئی جو دل پہ نہ پوچھ

اس کے ساتھ ہی یوسف علیہ السلام کی جدائی کا غم بھی تازہ ہوگیا، اور رنج وغم اور حزن وملال سے رو رو کر حضرت یعقوب کی آنکھیں سفید ہوگئیں، اس روح فرسا صدمے نے یعقوب علیہ السلام کو بے حال کر دیا تھا، اس کے باوجود کوئی حرف شکایت ان کی زبان پر نہیں آیا، بلکہ سارا غم آنکھوں کی راہ سے آنسوؤں کی شکل میں گر کر گریبان تر کرتا رہا، اور ایسا بھی نہیں تھا کہ یوسف علیہ السلام کے فراق میں رو رو کر زندگی نہ گذارتے ہوں، اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں گڑگڑا کر یوسف علیہ السلام کی واپسی کی دعائیں نہ مانگتے ہوں، رنج وغم کی یہی وہ حالت تھی، جس نے ان کی بصارت کو کمزور کر دیا، لیکن نور بصیرت میں برابر اضافہ ہوتا رہا، بنیامین کی جدائی کی نئی مصیبت ان کے سامنے آئی تو بے اختیار ''ہائے یوسف'' ان کی زبان سے نکل کر رہ گیا، اتنی طویل مدت تک درد دل کو دبا کر رکھنا، کہیں اس کا ذکر وتذکرہ اور اشارہ بھی نہ کرنا اور اس نئی مصیبت پر ہائے افسوس کر کے رہ جانا اور یوسف علیہ السلام کے واقعہ کی یاد آجانا، کسی عام انسان کے بس کا کام نہیں ہے، یہ امتیاز تو انہیں برگزیدہ ہستیوں کو حاصل ہے، جن کو انبیاء ورسل کے منصب عظیم سے نوازا گیا تھا۔

یہی وہ موقع تھا جب صاحبزادوں نے کہنا شروع کیا: بخدا آپ یوسفؑ کو برابر یاد کرتے رہیں گے، اور اپنے جسم وجان کو گھلاتے رہیں گے، یا انہیں یاد کرتے کرتے زندگی کی نعمت سے محروم ہوجائیں گے، جواب میں حضرت یعقوبؑ نے کہا: عزیزو! تمہیں کیا معلوم،

میں تو اپنا درد وغم اللہ ہی کے سامنے پیش کرتا ہوں، مجھے اللہ نے جو علم دیا ہے تم اس سے محروم ہو، ابھی امید کی چنگاری حضرت یعقوبؑ کے دل کے ایک گوشے میں روشن تھی، اور ناامیدی کے دامن کو جھٹکتے ہوئے، بیٹوں کی طرف مخاطب ہوئے: جاؤ، تلاش کرو، یوسف اور ان کے بھائی کا کھوج لگاؤ، اور اللہ کے فیض رحمت سے مایوس ہونا ہمیں زیب نہیں دیتا، مایوسی کفر کے دامن کے ساتھ وابستہ ہے، جاؤ، کوشش کرو، یوسف اور ان کے بھائی کا کھوج لگاؤ، کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو ایک ساتھ پردۂ غیب سے نکال دے۔

اب بیٹوں کا یہ قافلہ عزیز مصر کے دربار میں حاضر ہوا، اور کہنا شروع کیا: اے عزیز! ہمارے اور ہمارے گھر کے لوگوں پر بڑا سخت وقت آیا ہے، ہم ایک معمولی پونجی لے کر آئے ہیں، اس امید میں کہ آپ ہمیں خیرات کے ذریعہ سے بھرپور غلہ عطا فرما دیجئے، خیرات کرنے والوں کا اللہ کی نظر میں بلند مقام ہے، خیرات کا نام لیتے ہی عزیز مصر جو یوسف علیہ السلام تھے، کھلے اور کہنے لگے کہ: تم کو کچھ خبر بھی ہے کہ تم نے یوسف اور ان کے بھائی بنیامین کے ساتھ کیا کیا کیا، تم سمجھ رہے تھے کہ دونوں بھائیوں کا مستقبل تاریک ہو گیا، لیکن تم کو اس روشن مستقبل کا علم نہ تھا، بھائیوں نے کہنا شروع کیا: اوہ ہو! کیا آپ ہی یوسف ہیں؟! جی ہاں! میں ہی یوسف ہوں، یہ میرا بھائی ہے، یوسف علیہ السلام نے جواب دیا، اللہ نے ہمارے اوپر زبردست احسان فرمایا، جان لو! جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے، اور صبر سے کام لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے، بھائی بے اختیار بول اٹھے: واللہ العظیم! اللہ نے تم کو اپنا بنالیا، اور ہم پر تم کو ترجیح دی، حالانکہ ہمیں قصوروار تھے، حضرت یوسفؑ نے جواب میں کہا: تم لوگوں پر آج کوئی الزام نہیں، اللہ تمہاری خطاؤں کو بخش دیں اور وہ ارحم الراحمین ہیں، دیکھو یہ میرا کرتا لے جاؤ اور اس کو میرے والد کے چہرے پر ڈال دو، انشاء اللہ ان کی بصارت لوٹ آئے گی، اور اب میری تم سے ایک درخواست ہے کہ اپنے گھر کے تمام افراد کو یہاں لے کر آؤ۔

ادھر یہ لوگ خوشیاں مناتے ہوئے اپنے قافلے کو لیکر اپنے گھر کی طرف لوٹے، ادھر یعقوب علیہ السلام نے کہا: مجھے یوسف کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے اگر تم مجھے بہکا ہوا نہ سمجھو، گھر والوں نے کہا: قسم اللہ کی آپ اپنے اسی پرانے غم میں مبتلا ہیں، لیکن خوشخبری آنے کے ساتھ ہی اور یوسف علیہ السلام کی کرتے کی خوشبوناک میں پہونچتے ہی بلا تاخیر ان کی آنکھیں روشن ہوگئیں، اس وقت انہوں نے اپنی سابقہ بات یاد دلائی کہ مجھے اللہ کی طرف سے وہ علم حاصل ہے، جس سے تم محروم ہو، بیٹوں نے بے اختیار اپنے قصوروں کی معافی مانگنی شروع کردی، اور اقرار کرتے رہے کہ ہم سے خطا ہوئی، یعقوب علیہ السلام نے ان کی درخواست قبول کرلی، اور کہا کہ یقیناً میں تمہارے لئے اپنے رب سے معافی کی درخواست کروں گا، وہ بلاشبہ بڑا ہی بخشنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔

اب مرحلہ شروع ہوتا ہے یوسف علیہ السلام کے والدین اور ان کے افراد خاندان کے مصر کی طرف روانگی، اور وہاں عزیز مصر کے ساتھ قیام کرنے اور امن وامان کی زندگی گذارنے کا، یوسف علیہ السلام کے کرتے کی خوشبو سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بصارت اللہ کے حکم سے واپس آچکی ہے، بھائیوں نے بھی اس بات پر نکیر کی اور کہنے لگے کہ آپ اپنے اسی پرانی روش پر ابھی بھی چل رہے ہیں، یعنی یوسف علیہ السلام کی محبت، ان کے زندہ رہنے اور دوبارہ ملنے کا یقین آپ کے دل میں رچ بس گیا ہے، ادھر حال یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام کی کرتے کی خوشبو جونہی ان کے مشام جاں سے ٹکرائی، بینائی واپس آگئی، یہ دیکھ کر سبھی حیران وششدر رہ گئے، اس وقت حضرت یعقوبؑ بول اٹھے: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ مجھے اللہ کی طرف سے جو بات معلوم ہے، اس کا علم تم کو نہیں ہے، اب سوائے غلطی کا اعتراف کرنے اور معافی مانگنے کے کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا، یعقوب علیہ السلام نے بلا تاخیر کہا کہ میں اپنے رب سے تمہارے گناہوں کی معافی طلب کروں گا، اس لئے کہ وہ بہت زیادہ معاف کرنے والا اور بڑا مہربان ہے۔

جب والدین اور اہل خاندان حضرت یوسفؑ کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے مصر پہونچے تو وہاں یوسف علیہ السلام نے ان کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا، اور ان لوگوں کو نہایت اعزاز کے ساتھ ٹھہرایا، اور اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: نہایت امن و امان اور دلجمعی کے ساتھ مصر میں قیام کیجئے، اسی موقع پر یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر عملی طور پر ظاہر ہوتی ہے، جب وہ اپنے والدین کو تخت کی بلندیوں پر بٹھاتے ہیں اور سب کے سب ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں، یہ رمز تھا والدین اور ان کے ساتھ آنے والوں کی تکریم و تعظیم کا، اور اس پیشین گوئی کے پوری ہونے کی ساعت تھی، جو حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کو سن کر انہوں نے کی تھی کہ تمہارے رب تم کو برگزیدہ کرلیں گے، یعنی اپنی بارہ گاہ قرب میں تم کو خصوصی مقام عطا فرمائیں گے، چنانچہ یہ پیشین گوئی آج پوری ہو رہی ہے، یوسف علیہ السلام نہ صرف برگزیدہ نبی ہوئے، بلکہ مصر کے پایۂ تخت کے مالک بھی ہوئے، اس وقت ان کو والد مکرم کی یہ بات یاد آئی، کہنے لگے: ابا جان! اس قدیم خواب کی تعبیر آج ظاہر ہو رہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو سچ کر دکھایا، اور میرے اوپر انعامات کی بارش کی، مجھے قید سے نکالا، آپ کے یہاں آنے کی راہ ہموار ہوئی اور گاؤں کی فضا سے آپ نکلے، شیطان نے ہمارے اور بھائیوں کے درمیان جھگڑا پیدا کر دیا تھا، آج وہ ہماری مسرت میں شانہ بہ شانہ شریک ہیں، اللہ تعالیٰ کی تدبیر کو کون سمجھ سکتا ہے، وہ جو چاہتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے، ان جیسا باخبر اور حکمت والا کون ہو سکتا ہے۔

اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے بے اختیار اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر ان کے احسانات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ دعا پڑھی، اے میرے رب! آپ ہی نے مجھ کو سلطنت عطا کی، آپ ہی نے خوابوں کی تعبیر کا علم عطا کیا، اے آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے! آپ ہی میرے مددگار و کارساز ہیں، دنیا و آخرت میں ہر جگہ بس آپ سے یہی التجا ہے کہ حالت اسلام میں میری موت ہو، اور صالحین کی رفاقت عطا کی جائے۔

شکر و امتنان کے جذبات سے لبریز یوسف علیہ السلام کی اس دعا ، پر قصہ کا اختتام ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں: اس واقعہ کو پردۂ غیب سے باہر نکال کر ہم نے آپ کو اس سے باخبر کیا، جب اس واقعہ کے سلسلے میں بھائیوں کا اتفاق رائے ہوا تو آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہیں تھے، ظاہر ہے کہ مشورے اور تدبیروں میں آپ ان کے پاس موجود نہیں تھے کہ ان کی باتیں سنتے اور حالات کا بچشم خود معائنہ کرتے، اور جائزہ لیتے۔

یوسف علیہ السلام کا قصہ نہ صرف ان کے بچپن سے لیکر اخیر تک کے احوال وکوائف پر مشتمل ہے اور نہ وہ صرف ایک انسان کی زندگی کے حالات سے تعلق رکھتا ہے ، بلکہ یہ قصہ اخلاقی عظمت اور علوم و معارف کا ایک عظیم باب ہے، اس میں حکمت و بلاغت اور فنی اسلوب کا ایک دریا موجزن ہے، عفت وصداقت کا کردار اور صبر واستقامت کا ایک پہاڑ ہے، جو عداوت وحسد اور بغض وعناد کے جراثیم کو مٹا کر محبت والفت اور اعتماد واعتبار کا سلیقہ عطا کرتا ہے، اور حیات انسانی کے لئے اس میں درس عبرت کے ساتھ کامیابی اور بہتر سے بہتر انجام کی راہ ہموار کرتا ہے۔

سلام ہو ان پاک روحوں پر جو اس قرآنی قصے کے ہیرو بنے اور درود وصلاۃ ہو اس نبی برحق پر جن کو اللہ تعالیٰ نے براہ وحی یہ عبرتناک اور عقیدہ وایمان سے لبریز قصہ سنایا۔

باب دوم

قرآن کریم کی تعلیمات کا عالمی مرکز

ندوۃ العلماء

عصر حاضر میں ندوۃ العلماء کا قائدانہ کردار

ندوۃ العلماء کے قیام کا پس منظر

اکثر تعلیم یافتہ حضرات ندوۃ العلماء کے بارے میں صرف یہی جانتے ہیں کہ ہندوستان کے دیگر مدارس کی طرح یہ بھی ایک مدرسہ ہے، ندوۃ العلماء کے تعلق سے یہ نقطۂ نگاہ بے بنیاد باتوں کی ترویج کے نتیجہ میں سامنے آیا، ندوہ کے سرکردہ علماء بالخصوص مولانا محمد علی مونگیریؒ نے جو تخیل پیش کیا تھا وہ وسیع وعمیق اور دوررس تھا، انہوں نے اپنی ایمانی بصیرت سے اندازہ لگایا تھا کہ انگریزی سامراج کے دور اقتدار نے پورے عالم اسلام خاص طور سے ہندوستان میں ناپسندیدہ حالات پیدا کردیئے ہیں، جن سے وہاں کے افراد کا یقین متزلزل اوران کی روحانی طاقت مضمحل ہوکر رہ گئی ہے، انہوں نے محسوس کیا کہ اگر ان مسموم تھپیڑوں کے سامنے سد سکندری نہیں قائم کیا گیا تو دین کی صلابت اور عقیدہ کی طہارت متاثر ہوکر رہ جائے گی، اور مسلمان صراط مستقیم سے کنارہ کش ہوکر اپنی متاع گرانمایہ کھو بیٹھیں گے، ضرورت ہے کہ ایسے پرآشوب ماحول میں اسلامی شریعت اوراس کے طرز معاشرت پر ہر طبقہ کا اعتماد بحال کیا جائے اوران کو اسلام کی ابدیت اوراس کے انسانی مزاج سے ہم آہنگ ہونے پر مطمئن کیا جائے۔

مقاصد ندوۃ العلماء

انیسویں صدی عیسوی کے اختتام اور چودھویں صدی ہجری کے آغاز پر ندوۃ العلماء نے اس معتدل اصول کی صدا لگائی جس کی طرف یہ آیت کریمہ اشارہ کررہی ہے، **وکذلک جعلناکم امة وسطا لتکونوا شهدآء علی الناس ویکون الرسول علیکم**

شھیدا ،(اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا، تا کہ تم تمام لوگوں پر گواہ بنو، اور رسول تمہارے اوپر گواہ رہیں)(بقرہ:۱۴۳)

تحریک ندوۃ العلماء جن مقاصد کے لئے سرگرم عمل ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں بنیادی اصلاحات اور ہر دور میں تمدنی حالات کے تقاضے کے مطابق نئے نصاب کی تیاری۔

(۲) ایسے علماء تیار کرنا جو کتاب وسنت کے وسیع وعمیق علم کیساتھ جدید حالات سے بخوبی واقف اور زمانہ کے نبض شناس ہوں۔

(۳) اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا، اور باہمی نزاع کو ختم کرنا۔

(۴) اسلامی تعلیمات کی اشاعت بالخصوص برادرانِ وطن کو اس کی خوبیوں سے واقف کرانا، ان کے سامنے اس کی ہمہ گیری اور پوری انسانی برادری کے لئے باعث رحمت قرار دینا اور اسلام کے بارے میں ان کی وحشت کو دور کرنا۔

مذکورہ بالا مقاصد پر ندوۃ العلماء نے غیر معمولی توجہ دی اور بہت حد تک کامیابی اس کے حصے میں آئی، لیکن اب بھی بعض حلقوں میں اس کی تصویر بہت دھندلی اور اس کے نقوش غیر واضح ہیں، زمانہ کے تقاضوں کے پیش نظر اس وقت ندوۃ العلماء کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے، موجودہ ذمہ داران اس مشن کو لے کر سرگرم عمل ہیں اور حقائق وواقعات کے تناظر میں اس کی افادیت کو عالم آشکار کر رہے ہیں۔

عربی زبان وادب کی تعلیم

ندوہ نے عربی زبان کو ایک زندہ، متحرک اور حرارت سے لبریز زبان کی حیثیت سے پڑھنے اور لکھنے پر زور دیا، اس مقصد کے حصول کے لئے ذمہ داران نے ایک ایسا جامع نصاب تعلیم تیار کیا، جس سے نہ صرف یہ کہ یہ صلاحیت پروان چڑھے، بلکہ اس سے فطری طور پر لگاؤ پیدا ہو جائے، یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی زبان صحیح طور پر اسی وقت سیکھی جاسکتی ہے جب سیکھنے والے کا مقصد بلند ہو اور وہ اس راستہ میں اپنی پوری

توانائی صرف کرنے کا مزاج رکھتا ہو، عربی زبان تو تمام زبانوں میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے، اس لئے اس کے حصول کی خاطر جانفشانی اور سخت محنت کوشی کی ضرورت ہے، ندوۃ العلماء نے اسی آفاقی تصور کے ساتھ عربی زبان کی تحصیل پر توجہ دی، ہندوستان کے مروجہ قدیم نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کے اندر اس کی صلاحیت تو تھی کہ طالب علم عربی عبارتوں کو سمجھ لے، لیکن مختلف شعبہائے زندگی میں بے تکلف استعمال کرنے اور بولنے کی استعداد بالکل نہیں پیدا ہوتی تھی۔

چنانچہ ندوہ نے اس کو گوشۂ عافیت سے نکال کر رواں دواں زندگی کا جز بنایا، اس نصاب کو پڑھ کر ایسے عربی داں افراد پیدا ہوئے جو خطابت وانشاء پردازی میں اپنی مثال آپ تھے، اس سلسلہ میں ان عرب اساتذہ کا بھی بڑا دخل تھا جو صالح ذوق کی تشکیل کے لئے خاص طور سے بلائے گئے تھے، ان میں شیخ محمد طیب مکی، شیخ خلیل عرب، شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی، شیخ محمد العربی مغربی وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ان مہمان اساتذہ نے جو نسل تیار کی وہ اسی نہج پر عربی زبان وادب کی ترویج میں مشغول رہی، اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔

عربی صحافت اور ندوۃ العلماء

عربی اسلامی صحافت ندوۃ العلماء کے فکری تخیل کی آئینہ دار تھی، چنانچہ اس نے اس پہلو کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا، ۱۹۳۲ء میں ایک ایسا شاندار علمی، ادبی اور ثقافتی مجلہ بنام ''الضیاء'' بزبان عربی نکالا جو بعض اعتبار سے عرب ممالک کے علمی وادبی رسالوں اور تحقیقی میگزین سے بھی فائق تھا، یہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا، لیکن اس نے مختصر سی مدت میں قارئین کے لوح قلب پر اچھے نقوش ثبت کئے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے دور معتمدی میں ۱۹۵۵ء میں ایک عربی ماہنامہ بنام ''البعث الاسلامی'' اور ۱۹۵۹ء میں ایک پندرہ روزہ رسالہ بنام ''الرائد'' جاری کیا گیا، ان دونوں کی علمی اور دینی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی، یہ دونوں رسالے اب

بھی پورے آب وتاب کے ساتھ نکل رہے ہیں اور مقبول خاص وعام ہیں۔

ندوۃ العلماء اور اس کے تعلیمی وانتظامی شعبہ جات

ندوۃ العلماء کے قیام کے چار سال بعد دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی، ندوہ کے علمی، ادبی، دعوتی اور فکری منصوبوں کو پائے تکمیل تک پہونچانے کے لئے دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا، مرور زمانہ کے ساتھ اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا، اور دیگر شعبے بھی قائم ہوتے رہے، دارالعلوم کے تحت جو شعبے قائم ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱)كلية الشريعة و أصول الدين

اس شعبہ کے تحت علوم شرعیہ (تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول) پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے، اس کا باضابطہ ایک دفتر ہے، شرعی علوم سے متعلق کتابوں پر مشتمل اس کا ایک کتب خانہ بھی ہے، اس کے دو عہدیداران (عمید اور وکیل) ہوتے ہیں، یہ مرحلہ چار سال پر مشتمل ہے اس کے بعد دراسات علیا یعنی اختصاص فی التفسیر، اختصاص فی الحدیث، اختصاص فی الفقہ دو سال پر مشتمل ہے، اس کو فضیلت فی الشریعۃ الاسلامیۃ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

(۲)كلية اللغة العربية و آدابها

عربی زبان وادب کی تحصیل کے لئے یہ شعبہ قائم ہے، اس کے مقررہ نصاب میں نصوص ادبیہ کے علاوہ تاریخ ادب، بلاغت اور نقد جیسے موضوعات ہیں، اس کا بھی ایک کتب خانہ ہے، اس کے بھی دو عہدیدار (عمید اور وکیل) ہوتے ہیں، یہ مرحلہ دو سال کا ہے، عالیہ ثالثہ ادب، عالیہ رابعہ ادب، اس کے بعد دراسات علیا فی الأدب کا مرحلہ ہے جس میں اختصاص فی الادب العربی کے دو سال ہیں۔

(۳)كلية الدعوة والاعلام

یہ شعبۂ عالمیت کا ایک مرحلہ ہے، عالیہ کے چار سال اور علیا کے دو سال پر یہ شعبہ

ممتد ہے، کار دعوت کا مزاج رکھنے والے طلبہ اس میں زیر تعلیم ہوتے ہیں، اس کے تحت ان کو دعوت اور فکر اسلامی کے مختلف موضوعات پر تعلیم دی جاتی ہے، اس میں تجربہ کار اساتذہ کے ذریعہ صحافت ولسانیات کے بھی دروس اور محاضرات ہوتے ہیں، کارِ دعوت کے لئے رائج زبان و بیان کے سیکھنے پر خاص توجہ دی جاتی ہے، عملی طور پر قرب و جوار کے علاقوں میں دعوتی دوروں کا اہتمام ہوتا ہے، اس شعبہ کا بھی ایک عہدیدار (عمید) ہوتا ہے۔

(۴-۵-۶) المعهد العالی للدعوة والفكر الاسلامی ، المعهد العالی للقضاء و الافتاء اور المجمع العلمی للدراسات القرآنية والحديثية:

ندوۃ العلماء قدیم صالح اور جدید نافع اور دین و دنیا کو توازن کے ساتھ جمع کرنے کے اصول پر قائم ہوا، اس کے فضلاء اس صفت سے متصف رہے، انفرادی ملاقاتوں، تقریروں، مقالات، سیمیناروں اور کانفرنسوں کے ذریعہ دعوت الی اللہ جیسے مہتم بالشان فریضہ کو ادا کیا، اپنے زیر تربیت طلبہ کی بھی اس رخ پر چلنے کا مزاج بنایا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنی زندگی کا وتیرہ بنانے پر زور دیا۔

۱۴۰۰ھ میں ندوۃ العلماء نے دعوت کے پہلو پر فکری اور نظریاتی بلکہ عملی طور پر توجہ دی اور ایک شعبہ المعهد العالی للدعوة والفكر الاسلامی کے نام سے قائم کیا تھا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اس شعبہ کے افتتاح کے موقع پر توسیعی خطبات دئے جو عربی میں "روائع من أدب الدعوة" اور اردو میں "دعوت وتبلیغ کا معجزانہ اسلوب" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، یہ شعبہ کئی سال تک سرگرم عمل رہا، چند سالوں کے لئے موقوف کر دیا گیا تھا، اب پھر شروع کر دیا گیا، یہ ایک سالہ نصاب تعلیم رکھتا ہے۔

دوسرا شعبہ المعہد العالی للقضاء والافتاء ہے، ایک میں افتاء اور قضا سے متعلق خصوصی تعلیم کا نظم ہے، طالب علم مشرف کی رہنمائی میں رہنما کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے، فتوی نویسی کی بھی مشق کرتا ہے۔ ایک سال میں سند فراغت ملتی ہے۔

جبکہ تیسرا شعبہ (المجمع العلمي للدراسات القرآنية و الحديثية) دوسال پر مشتمل ہے، پہلا سال اساتذہ کی رہنمائی میں مطالعہ کے لئے خاص ہے، جبکہ دوسرے سال متعینہ موضوع پر مشرف کی رہنمائی میں وقیع مفصل مقالہ تیار کرایا جاتا ہے، اس سے طلبہ کے اندر تحقیق وتصنیف کا ذوق پروان چڑھتا ہے، یہ تینوں شعبے عالمیت اور فضیلت کی تکمیل کے بعد ہیں۔

(۷)القسم الدراسی الخاص باللغة العربية

یہ تعلیمی شعبہ پانچ سالہ کورس پر مشتمل ہے ،اس میں فارن کنٹریز FOREIGN CUNTRIES کے طلباء کا داخلہ ہوتا ہے، اس میں عربی زبان میں تعلیم ہوتی ہے، اس طرح عربی میڈیم کا یہ شعبہ بیرون ہند کے طلباء کے لئے بالخصوص قائم کیا گیا ہے۔

(۸)معہد دار العلوم

ابتدائی اور ثانوی مراحل کی تعلیم کے لئے یہ شعبہ قائم ہے، ابتدائی تعلیم تو ندوۃ العلماء کے زیر انتظام متعدد مکاتب میں ہوتی ہے، لیکن ثانوی تعلیم کا خصوصی طور پر معہد دار العلوم میں نظم ہے، یہ چھ سال پر مشتمل ہے۔

(۹)معہد تحفیظ القرآن الکریم

قرآن کریم کی حفظ وتجوید کے لئے دار العلوم میں یہ شعبہ سرگرم ہے، صحت مخارج کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت پر توجہ دی جاتی ہے، زیادہ سے زیادہ تین سال میں طلبہ حفظ قرآن مکمل کر لیتے ہیں اس کے بعد دور کرایا جاتا ہے، اس کے بھی دوسال رکھے گئے ہیں۔

(۱۰)شعبہ تجوید وقرأت

دار العلوم کے عربی درجات کے لئے خاص طور سے یہ شعبہ قائم کیا گیا ہے، مختلف اوقات میں فجر اور ظہر کے بعد طلباء ماہر اساتذہ کی رہنمائی میں روایت حفص وقراءت سبعہ کی تعلیم

حاصل کرتے ہیں، روایت حفص کے لئے دوسال اور سبعہ کے لئے دوسال متعین کئے گئے ہیں۔

(۱۱) عالمی رابطہ ادب اسلامی

چونکہ ندوۃ العلماء نے اپنے نصاب تعلیم میں زبان وادب کو خاص اہمیت دی ہے اور اس کو قرآن وحدیث کے سمجھنے کا زینہ قرار دیا ہے، اس لئے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ نے اس کے دائرہ کو وسیع کرتے ہوئے رابطہ ادب اسلامی کی بنیاد رکھی، ممالک عربیہ کے ادباء نے اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور تائید کی، حضرت مولانا تاحیات اس کے صدر رہے، اس کے دو آفس ہیں، ممالک عربیہ کا دفتر ریاض میں ہے، اس کے ذمہ دار ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح پروفیسر جامعۃ الامام محمد بن سعود ہیں، برصغیر اور ممالک شرقیہ کا دفتر ندوہ میں ہے، اور اس کے صدر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی ہیں۔

رابطہ ادب اسلامی اپنے روز قیام ہی سے متعینہ دائرہ کار میں سرگرم عمل ہے، اس نے مختصر سی مدت میں وسیع پیمانہ پر ادب اسلامی کے آفاقی مفہوم کو واضح کیا اور اسلامی تہذیب کی تعمیر نیز بے اعتماد انسانی معاشرہ میں خود اعتمادی کی دولت عطا کی، اس سلسلہ میں اسے متعدد ذرائع استعمال کرنے پڑے، سیمیناروں کا انعقاد، کانفرنسوں کا اہتمام، مفید کتابچے اور کتابوں کی اشاعت اور مختلف زبانوں میں رسالوں کا اجراء۔

یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ رابطہ کے بہی خواہوں کی تعداد بہت ہے۔ ادباء، پروفیسر حضرات، دانشوران قوم اور مدارس کے ذمہ داران اس سے وابستہ ہیں، سب اس کی افادیت کے قائل ہیں اور اس کو وقت کی ضرورت اور زمانہ کی پکار تصور کرتے ہیں۔

(۱۲۔۱۳) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ومجلس صحافت ونشریات

ندوۃ العلماء کی مطبوعات پر دو رنگ غالب ہیں، ایک علمی اور ثقافتی، دوسرا دعوتی اور فکری، نصابیات کی کتابیں خاص نقطۂ نظر کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہیں،، اس لئے ان میں علمی، ثقافتی اور تربیتی عنصر نمایاں ہے، اور وہ مجلس صحافت ونشریات سے شائع ہوتی ہیں، اسی

مجلس صحافت سے ندوۃ العلماء کے ترجمان جرائد ومجلّات (البعث الاسلامی، الرائد، تعمیر حیات، سچاراہی، فریگرینس آف ایسٹ) شائع کئے جاتے ہیں۔

دوسری قسم ان کتابوں کی ہے جو دعوتی مقاصد کے پیش نظر تصنیف کی گئیں، وہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے شائع ہوتی ہیں، مجلس نے کئی زبانوں میں اس کام کا بیڑا اٹھایا اور بحمداللہ ان زبانوں میں اس کی مطبوعات زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں، مجلس ۱۹۵۹ء میں قائم ہوئی، اس وقت اس کی مطبوعات کی تعداد ۳۲۴ ہوچکی ہے۔

شعبۂ دعوت وارشاد اور شعبہ اصلاح معاشرہ

یہ شعبہ ندوۃ العلماء کے زیر انتظام قائم ہے، اس کے تحت کئی مکاتب چل رہے ہیں، مختلف مواقع پر دعوتی دوروں کا بھی اہتمام ہوتا ہے، فکر اسلامی کی اشاعت اور اسلام مخالف فتنوں کے سد باب کے لئے یہ شعبہ سرگرم عمل ہے، اس شعبہ کی طرف سے سال میں ایک سہ روزہ تربیتی کیمپ کا انعقاد کیا جاتا ہے، اور مختلف موضوعات پر کتابچے، رسائل اور پمفلٹس بھی شائع کئے جاتے ہیں، شعبہ اصلاح معاشرہ کے تحت معاشرہ کی خرابیوں کے ازالہ کا ایک مستقل پروگرام ہے جو اپنی سطح سے انجام پارہا ہے۔

شعبۂ تعمیر وترقی

یہ شعبہ تعمیراتی امور سے متعلق ہے، اس کے زیر اہتمام متعدد منصوبوں کی تکمیل ہوتی ہے، چونکہ ندوۃ العلماء اور دار العلوم عوام کے تعاون ہی سے سوئے منزل رواں دواں ہیں، اس لئے اس شعبہ کے تحت اس کا مستقل نظام ہے۔

شعبہ انٹرنیٹ اور میڈیا ریسرچ سینٹر

یہ دو شعبے ہیں، شعبۂ انٹرنیٹ میں ندوہ کا ویب سائٹ ہے، اس میں ندوہ سے متعلق پوری معلومات فراہم ہیں، ماشاء اللہ اس کے ذریعہ ای میل کے ذریعہ کئے گئے سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ میڈیا ریسرچ میں اسلام سے متعلق گرم اور سلگتے موضوعات پر بحث

کر کے حتمی اور فیصلہ کن رائے دی جاتی ہے، اس طرح اشکالات کے جوابات فراہم ہوتے ہیں

ندوۃ العلماء کی عصری معنویت

فرزندانِ ندوہ قدیم زمانہ ہی سے ہندو بیرونِ ہند عملی طور پر دعوت سے وابستہ رہے، بعض یونیورسٹیوں میں اسلامیات کا شعبہ ان کے ذمہ کیا گیا، بفضلہ تعالیٰ جدید طبقہ میں ان کی کوششوں سے اچھے نتائج برآمد ہوئے، مفکر اسلام کا دعوتی کارنامہ عالم آشکار ہے، ۱۹۸۳ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز سینٹر کے افتتاح کے لئے آپ کو مدعو کیا گیا تھا، تاحیات آپ اس کے صدر رہے، آپ نے اس کے سالانہ پروگراموں میں جو محاضرات دئے اور تقریریں کیں، ان کو ''حدیث مع الغرب'' نامی مجموعہ میں جمع کیا گیا ہے۔

ماشاء اللہ اس وقت ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کی افادیت کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھ رہا ہے، اور وسیع پیمانہ پر ہند اور بیرونِ ہند اس سے ملحق ادارے بھی قائم ہو رہے ہیں، اور معاشرے پر ہر لحاظ سے اس کے اچھے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

ندوۃ العلماء نے اپنے قیام کے روزِ اول ہی سے نصابِ تعلیم میں حسبِ ضرورت اصلاح و ترمیم کو اپنے مقاصد میں شامل رکھا، اور جن لوگوں نے اس مقصد سے اتفاق کیا، انہوں نے اس کو بنظرِ استحسان دیکھا، اور زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر اس اقدام کو سراہا اور اس کی پرزور تائید کی اور بہت سے مدارس نے اس سے روشنی حاصل کی، اور اپنے نصاب میں اصلاح و ترمیم کے متعلق غور کیا، بعض مدارس نے ندوہ کے نصاب کو حرف بحرف قبول کر کے اس کو اپنے یہاں رائج کیا، ہمیں اس بات کا اظہار کرنے میں مسرت ہے کہ دارالعلوم کی نصابی کتب کی مانگ مدارسِ عربیہ میں الحمدللہ ادھر بہت بڑھ گئی ہے، اور اہلِ مدارس اور علماء ان کو بڑی تعداد میں طلب کر رہے ہیں۔

تحریک ندوۃ العلماء اور عقیدۂ ختم نبوت

تحریک ندوۃ العلماء نے اپنے قیام کے روز اول ہی سے مسلمانوں کے اہم مسائل

کوملحوظ رکھا اور اس نے بین الاقوامی سطح پر اسلامی مخالف چیلنجوں کی مقابلہ آرائی کے لئے مستحکم بنیادوں کو اختیار کیا، ان سے نبرد آزمائی کے لئے اس نے ہمیشہ دلائل و براہین کا سہارا لیا۔ قیام ندوۃ العلماء کے وقت ہندوستان میں دو فتنوں نے خاص طور سے سر اٹھار کھا تھا، یہ مسلمانوں کے لئے ایمان وعقیدہ کو متزلزل کرنے اور اسلام کی صداقت و پائیداری کے سلسلہ میں ان کے اندر شکوک پیدا کرنے میں نمایاں طور پر خطرناک رخ اختیار کر رہے تھے، چنانچہ ندوۃ العلماء نے اس جانب بطور خاص اپنی توجہ مرکوز کی اور انہیں اپنے ان مقاصد میں سرفہرست رکھا جن کی تردید اور سدباب اس کا ہدف اولین قرار پایا تھا۔

ان فتنوں میں سرفہرست عیسائی مذہب کی تبلیغ واشاعت کا فتنہ تھا جس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عنوان سے ہندوستان کے اندر اپنے قدم رکھنے کی راہ ہموار کی اور اس طرح اس نے رفتہ رفتہ تجارتی اداروں اور سیاسی محاذ پر اپنی بالادستی قائم کرنی شروع کردی، پھر برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستانی مسلمانوں کو عیسائی بنائے جانے کی قرارداد پاس ہونے کے بعد اس مشن میں مزید زور پیدا ہوگیا، اس قرارداد میں یہ منظور کیا گیا تھا کہ مسیحی پادری ومبلغین ہندوستان جاکر وہاں کے مسلمانوں میں عیسائیت کے فروغ کی جدوجہد کریں، قرارداد کے پاس ہوتے ہی تبلیغی واشاعتی وفود اپنے مشن کو لے کر ہندوستان آنے لگے، اور انیسویں صدی کے اختتام تک عیسائیت کے پاس اس سرزمین پر ۴۲ تبلیغی ادارے قائم ہوگئے۔ یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی تعداد ڈھائی سو تک پہونچ گئی، یہ سرگرمیاں اس قدر تیزی سے بڑھیں کہ انہوں نے یہاں نرسری اسکول اور تعلیمی ادارے کھولنے شروع کردیئے۔ ہاسپٹل اور نرسنگ ہوم قائم کرنے لگے اور عیسائیت سے دلچسپی رکھنے والوں کا ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا۔ صرف اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ اپنے مذہب کی اشاعت کا مفید ذریعہ سمجھتے ہوئے ہندوستانی زبانوں میں اخبارات ورسائل بھی شائع کرنے لگے، اس میدان میں اپنی تگ وتاز سے وہ اس قدر اطمینان اور خوش اعتقادی میں مبتلا ہوگئے کہ انہوں نے اس کی پیشن گوئی شروع کردی کہ ہندوستان جلد ہی عیسائیت میں تبدیل

ہو جائے گا اور یہ کہ ہندوستان میں عیسائیت کا مستقبل بہت ہی روشن و تابناک ہے۔ دوسری طرف ملک کے علماء اور داعیان اسلام ان اسلام مخالف سرگرمیوں سے بے پروا ہو کر غفلت کی زندگی بسر کر رہے تھے، اور انہیں اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔

ان سرگرمیوں کے ضمن میں ایک مبلغ ''ہنری ایلیٹ'' نے دو اہم نکتوں کی طرف توجہ مرکوز کی، ایک نبوت محمدی کے سلسلہ میں مسلمان نوجوانوں کے اندر مختلف طرح سے شکوک وشبہات پیدا کرنا، اور دوسرے مسلم بادشاہوں کی تاریخ کو مسخ کرنا اور ان پر ظلم وسرکشی اور خونریزی، عصبیت وشہوانیت اور نفس پرستی کے الزامات عائد کرنا، دوسرے مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے خاص کر صالح اور انصاف پسند مغل بادشاہ اورنگ زیب کو نشانہ بنایا، جس نے بادشاہت وحکمرانی سے کہیں زیادہ ایک مسلم، مصلح، عادل اور مخلص داعی کا کردار ادا کیا تھا۔

اس فتنہ نے مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء کے قلب ودماغ کو بے چین کر دیا، یہ فتنہ انیسویں صدی کے نصف میں پنجاب کے اندر رونما ہوا لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں یہ فتنہ کینسر کے مرض کی طرح تکلیف دہ حد تک بڑھتا گیا۔ اور ۱۹۰۲ء میں مرزا غلام احمد قادیانی نے ندوہ کے علماء کو ''تحفۃ الندوہ'' نامی رسالہ میں چیلنج کیا۔ اس میں اس نے ندوۃ العلماء کے اراکین اور ذمہ داروں کو ہدف ملامت بنایا اور اپنی نبوت کو مؤکد کر کے اس نے اپنا آخری حربہ استعمال کیا اور کہا کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے، جبکہ اس سے قبل وہ مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر چکا تھا۔ یہ ایک عامی شخص تھا جو اس سے پہلے فقر وتنگ دستی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ لیکن انگریز سامراج کے دست شفقت نے اس کی تنگی کو فراخی وخوشحالی سے بدل دیا۔ اور اس کو دین اسلام پر حملہ کرنے اور اسے کمزور کرنے کے لئے اچھی طرح سے استعمال کیا۔

فتنہ قادیانیت روز بروز بڑھتا گیا اور اپنی جڑیں مضبوط کرتا گیا، اسے برطانوی حکومت کی مکمل پشت پناہی حاصل رہی، کیونکہ برطانوی حکومت نے قادیانیت کا جال پھیلانے کے لئے بڑی حکمت عملی اور باریک بینی سے پلاننگ کر رکھی تھی، اس کی یہ منصوبہ بندی ہندوستان کے ساتھ ساتھ تمام مشرقی ومغربی ملکوں اور مسلم سوسائٹیوں کے اندر ہو چکی

تھی، قادیانیت کے داعی سادہ لوح عوام کے سامنے اس کی ''حقانیت'' کو ثابت کرنے میں مصروف ہیں۔ اور علمائے اسلام کی طرف سے نبوت محمدی کے خلاف اس بغاوت کی آگ کو بجھانے کی ہر سطح پر کوشش جاری ہے۔

آج مسلمانوں کو فریب دینے والی اور اسلام کو نیست و نابود کرنے والی تحریکوں میں قادیانیت سرفہرست ہے، یہ تحریک ہمیشہ ہمیش باقی رہنے والی نبوت کے خاتمہ اور اسلامی شریعت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے خود مذہب اسلام کی آڑ لے کر مہم جو ہے، اس وجہ سے اسلام اور امت مسلمہ کے سر پر منڈلانے والے تمام خطروں میں یہ اولین خطرہ ہے۔ چنانچہ اس سے دفاع اور مقابلہ کے لئے ہر میدان میں کوشش و سرگرمی کی ضرورت ہے۔ اور اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کو زائل کرنے اور اس کے زہریلے بیخ و بن کے تن آور درخت کی شکل اختیار کرنے سے قبل اس کے خلاف ہر طرح کے وسائل و ذرائع کو اپنانے کی ضرورت ہے (وقل اعملوا فسیری اللّٰہ عملکم ورسولہ والمومنون) (آپ فرمادیجئے کہ تم عمل کئے جاؤ، سو تمہارے عمل کو اللہ خود دیکھ لے گا اور اس کا رسول اور ایمان والے بھی دیکھ لیں گے) (توبہ:۱۰۵)

اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو جس سیادت و قیادت کا منصب عطا فرمایا ہے اس کے لئے اللہ کے راستہ میں جہاد اور جہد نفسانی کا حکم فرمایا ہے اور یہ کہ اس امت سے اس کی باز پرس ہوگی۔ اور وہ جواب دہ ہے'' (وجاھدوا فی اللہ حق جھادہ ، ھو اجتباکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ، ملة أبیکم ابراھیم ، ھوسماکم المسلمین ،من قبل ، وفی ھذا لیکون الرسول شھیداً علیکم وتکونوا شھداء علی الناس فأقیموا الصلاة وآتوا الزکوة واعتصموا باللہ ، ھومولاکم ، فنعم المولی ونعم النصیر) (سورہ حج:۷۸)

اللہ کی راہ میں ویسا ہی جہاد کرو جیسے جہاد کا حق ہے، اسی نے تمہیں برگزیدہ بنایا ہے اور تم پر دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں ڈالی۔ دین اپنے باپ ابراہیمؑ کا قائم رکھو، اسی اللہ نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔ اس قران سے پہلے اور اس میں بھی، تا کہ پیغمبر تم

پر گواہ ہو جائے اور تم تمام لوگوں کے گواہ بن جاؤ۔ پس تمہیں چاہئے کہ نمازیں قائم رکھو اور زکوۃ ادا کرتے رہو اور اللہ کو مضبوط تھام لو، وہی تمہارا ولی اور مالک ہے۔ پس کیا ہی اچھا مالک ہے اور کتنا ہی بہتر مددگار ہے۔

ندوۃ العلماء کا قیام: امداد غیبی

انیسویں صدی کے آخری دہے میں ندوۃ العلماء کا قیام ایک امدادِ غیبی سمجھا گیا، شیخ وقت حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے ندوۃ العلماء کے قیام کو امداد غیبی سے تعبیر کیا تھا، یہ تعبیر اس قدر سچ ثابت ہوئی کہ آج سے تقریباً سوا سو سال گذر جانے کے باوجود امدادِ غیبی کا ظہور ہوتا رہا، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ندوۃ العلماء کے ذمہ جو خدمت سپرد کی گئی تھی اس کو انجام دینے کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور خاص طور سے عربی زبان کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے پیش کرنا اس کا ایک اہم ترین مقصد قرار دیا گیا، اور کتاب وسنت کے ساتھ جملہ علوم اسلامیہ کی زبان عربی ہونے کی وجہ سے ایک مسلمان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ کتاب وسنت کے مفہوم ومعانی کو براہِ راست سمجھنے کی پوری کوشش کرے، اور اس سے مستفید ہو کر مذہب اسلام کی خوبیوں اور اس کی تعلیمات کی باریکیوں کو بخوبی سمجھ سکے۔

باکمال اساتذہ

ندوۃ العلماء نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ایک نصاب تعلیم مرتب کیا، اور اس کو اپنے تعلیمی شعبہ میں جاری کیا، اسکو پڑھانے کے لئے نہ صرف ہندوستان کے باکمال اساتذہ کا انتظام کیا، بلکہ عرب اساتذہ کو جو اپنے فن میں اور عربی زبان کا ذوق پیدا کرنے میں مہارت کے آخری درجہ پر فائز تھے، اس ضمن میں علامہ خلیل عرب یمانی، اور علامہ محمد تقی الدین ہلالی، ان کے بھائی شیخ محمد ہلالی، شیخ محمد بن حسین خزرجی یمانی، شیخ محمد طیب مکی کا تذکرہ کرنا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان حضرات نے زندگی سے بھرپور اور طاقت کے خزانے سے معمور عربی زبان کو پڑھانے اور اس کا ذوق پیدا کرنے میں اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کیا،

اس کے نتیجہ میں عربی زبان اور اس کے علوم سے آراستہ حضرات کی ایک نسل وجود میں آئی، اور اس نے عربی زبان وادب کی بہترین نمائندگی کا فرض انجام دیا، اور قرآن کریم سے استفادہ کرنے کی راہ ہموار کی۔

اس نسل کے اولین نمائندے جنہوں نے عربی زبان کی طاقت کو براہِ راست قرآن کے سمجھنے اور اس کے نکات اور باریکیوں پر غور کرنے کی راہ ہموار کی، ان میں مولانا علی میاں صاحب اور مولانا مسعود عالم صاحب کا نام سرفہرست رکھنا انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہوگا، ان دونوں حضرات نے عربی زبان وادب کی اپنی امتیازی صلاحیتوں کو قرآن کریم کی تدریس وتفہیم میں صرف کیا، اس نسل کے دیگر افراد میں مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا ابواللیث ندوی، مولانا عمران خان ندوی، مولانا عبد السلام قدوائی ندوی، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی، اور ان کے بعد کی نسلوں میں مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا مجیب اللہ ندوی، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا عبدالماجد ندوی، مولانا واضح رشید ندوی، مولانا محمود الحسن ندوی، اور مولانا محمد الحسنی ندوی، مولانا محمد راشد ندوی، اور کچھ دوسرے حضرات قابل ذکر ہیں۔

حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کریم کی باریکیوں اور اس میں غور وفکر کرنے کا ایک خاص ماحول ندوہ میں قائم کرنے کی پوری کوشش کی اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے، مولانا کا تقرر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ۱۹۳۴ء میں تفسیر وادب کے استاد کی حیثیت سے ہوا، اس وقت مولانا نے سب سے پہلے قرآن کریم کی تدریس وتفہیم پر عربی صلاحیتوں کو صرف کرنے کا قصہ اپنی کتاب ''مطالعہ قرآن'' میں اس طرح بیان کیا ہے:

> ''۱۹۳۴ء میں اس ہیچمداں کا تقرر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد تفسیر وادب کی حیثیت سے ہوا، اور انہی دونوں مضامین کے اسباق اس کے سپرد ہوئے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر کی قدیم ومستند کتابیں

(جلالین، بیضاوی اور کشاف) داخل نصاب تھیں، لیکن اس کا شروع سے اہتمام کیا گیا تھا کہ قرآن مجید کا مکمل متن درجوں کے معیار اور طلباء کی استعداد کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف درجوں میں پڑھا دیا جائے، اور قرآن مجید کا کوئی حصہ چھوٹنے نہ پائے، مکمل قرآن کی تدریس وتفہیم کا انتظام غالباً دارالعلوم ندوۃ العلماء کی اولیات وخصوصیات میں ہے، میرے سپرد بھی مختلف درجوں میں قرآنی اسباق ہوئے، جن میں درجہ ششم میں ابتدا کے دس پارے بھی تھے، بعض دوسرے درجوں میں طلباء کی استعداد اور درجوں کے معیار کے مطابق قرآن مجید کے دوسرے حصے تھے، مجھے اس مبارک خدمت اور مشغولیت کے دوران یہ محسوس ہوا کہ طلباء کو قرآن مجید سے متعارف کرانے، اس کے اصل مقاصد اور مرکزی مضامین سے آشنا بنانے، ان میں اس سے صحیح طور پر استفادہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے اور اس کے لئے ان کو تیار کرنے، اور ان غلطیوں، کمزوریوں اور ان بیماریوں سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے، جو قرآن سے استفادہ کی راہ میں حجاب بنتی اور اس کے اثرات وبرکات سے محروم رکھتی ہیں، اور جن کی خود قرآن مجید نے نشان دہی کی ہے، یہ مضامین گویا قرآن مجید کے مطالعہ اور ان کے انتفاع واستفادہ کے اصول ومبادی کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اس کے لئے ایک رفیق ورہبر اور مشیر وخادم کا کام انجام دیتے ہیں، اور ان کی مدد سے قرآنی علوم ومعارف (جن کی کوئی انتہا نہیں) کا یہ سفر کسی قدر آسان ومامون ہوجاتا ہے'' (۱)

قرآن کریم سے شغف

حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اگر چاہتے تو قرآنِ کریم کی ایک ضخیم تفسیر قرآن لکھ کر اہل علم کے حلقوں میں پیش کردیتے اور قرآن فہمی کے سلسلہ میں نہایت واضح ہدایات پر مشتمل پورا کتب خانہ تیار کردیتے، لیکن انہوں نے اس نازک ترین کام کو انجام دینے

(۱) مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی ص: ۱۰۔۱۱

کی ہمت اپنے اندر نہیں پائی، اور مطالعۂ قرآن اور اس کے اصول ومبادی پر ایک مختصر کتاب لکھی، اور سورۂ کہف کی روشنی میں ایک اہم موضوع کو کتابی شکل میں ''معرکہ ایمان و مادیت'' کے نام سے شائع کیا، وہ دراصل عربی زبان میں لکھی گئی ہے، اسی طرح "تأملات في السور" اور "النبوة والأنبياء في ضوء القرآن" کے نام سے عربی زبان میں حضرت مولانا کی دو کتابیں شائع ہوئیں، اور اپنے خطبوں اور تقریروں میں قرآن کریم کی آیتوں پر عام فہم گفتگو اور سہل انداز بیان اختیار کیا، اس طرح کے تفسیری خطبات اور تقریروں کو اگر جمع کیا جائے تو اس کی کئی جلدیں تیار ہوسکتی ہیں، پھر بھی ایک فاضلِ ندوہ رسال الدین ندوی صاحب نے اپنے انتخاب سے تفسیری مضامین کو ایک ضخیم کتاب میں ''قرآنی افادات'' کے نام سے جمع کردیا ہے، جب بھی حضرت مولانا کسی دینی پروگرام میں شرکت فرماتے اور تلاوت قرآن سے اس کی ابتدا ہوتی تو قاری صاحب کی پڑھی ہوئی آیات کو سُن کر مولانا پر ایک وجد طاری ہوجاتا تھا، اور اسی حالت میں ان آیتوں کی تفسیر اور ان کے مفہوم ومطالب بیان کرنے کے لئے ایسا انداز بیان اختیار کرتے جس کو ہم الہامی انداز سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

عربی زبان وادب میں امتیاز

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کا مطالعہ اور اس کی آیات میں غور وتدبر سے جو نتائج نکالے ان کو انتہائی قابل استفادہ اور ایک گہری ایمانی سوچ کا نچوڑ کہا جاسکتا ہے، عربی زبان وادب کا درس عرب اساتذہ سے لیا، اور ان کی خدمت میں ایک بڑا وقت گذارا تھا، اس لئے وہ عربی زبان پر اس طرح قادر تھے، جیسے عربی زبان کے عرب ادباء بلکہ وہاں کے انتہائی معتبر زبان دانوں سے آپ کا قدم آگے تھا، عربی زبان میں آپ کی تقریریں جو عرب ادباء، علماء اور اہل زبان کے سامنے ہوتی تھیں اس کا ایسا بے مثال اثر ان کے دلوں پر ہوتا تھا کہ وہ بے ساختہ پکار اٹھتے تھے کہ آپ کی خاندانی اصل عربی کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی، مولانا نے مدینہ منورہ کی جامعہ اسلامیہ میں وہاں کے ''مؤتمر الدعوۃ والدعاۃ'' میں شرکت فرمائی، اس مؤتمر میں پوری دنیا کے منتخب علماء اور دعاۃ اور عربی زبان وادب کے رمز آشنا شریک ہوئے

تھے، حضرت مولانا نے جس نشست کی صدارت کی، اس میں درخواست کی گئی کہ آپ ''کلمۃ الوفود'' پیش فرمادیں، حضرت مولانا نے منظور کرلیا، اور ''کلمۃ الوفود'' کی مناسبت سے تمام شرکاء کو مخاطب کر کے اپنے خاص لہجہ اور اسلوب میں عربی زبان میں نہایت فصیح و بلیغ تقریر کی، اور جونہی تقریر سے فارغ ہوئے؛ دنیا بھر کے خصوصی مہمانوں کا ایک مجمع امنڈ آیا اور آپ کی تقریر پر مبارکباد دینے اور شکریہ ادا کرنے کا سلسلہ دیر تک جاری رہا، لوگ آپ کی پیشانی اور ہاتھ چومتے اور قسم کھا کھا کر آپ کے جذبۂ ایمانی کی داد دیتے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ

مولانا علی میاں صاحب علامہ سید سلیمان ندوی کے شاگرد تھے، انھیں سے مطالعہ کی گہرائی، عالی ہمتی اور مسلسل علم کی جستجو میں رہنا اور اس کی گہرائیوں سے موتیوں اور جواہرات کو نکالنا اور اپنے علمی مقصد کو پورا کرنے کے لئے کتب خانوں کی چہار دیواریوں میں محصور ہونا، اور تصنیف و تالیف میں اس طرح غرق ہوجانا کہ اپنے گرد و پیش کی کوئی خبر نہ رہ جائے اپنے استاذ علامہ سید سلیمان ندویؒ سے سیکھا تھا، سید صاحب کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میرے خیال میں ان کے معاصرین علماء میں اور کم از کم ہندوستان کی حد تک فضلائے مدارس عربیہ میں کوئی ایسا نہیں ہے، جو عقل و قلب، قدیم و جدید، مشرقیت و مغربیت، دین و ادب یا دین و فلسفہ کے درمیان جامعیت میں ان کا ہمسر ہو، وہ ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل، سیرۃ النبی کے مؤلف، سیاست کے پیچ و خم سے واقف اور ایک صاحب بصیرت ادیب تھے، انہوں نے یورپ کا سفر کیا، اور اپنے چشم فیاض سے ایک مدت تک شجرہ علم کی آبیاری کی، اور اس کی گھنی چھاؤں میں رہے، تاریخ کو موضوع بنایا اور علم کے فلسفہ انقلاب اور اس کے عروج و زوال پر بحث کی مگر تحقیق کی ان وادیوں کو پار کرنے کے باوجود ان کے دل میں یہ خلش

باقی تھی کہ ان کو مزید کسی روحانی چشمۂ صافی سے استفادہ کی ضرورت ہے، باوجود یکہ ان کے تلامذہ اور شناسایان علم یہ محسوس کرتے تھے کہ اب ان کو مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، اور ان کے قلم سے خطبات مدراس، سیرۃ النبی اور سیرت عائشہ جیسی کتابیں نکل چکی تھیں، جنہوں نے ہزاروں دلوں میں جذبہ ایمانی کو چمکایا تھا اور ان کو حلاوت ایمانی کی دولت سے مالا مال کیا تھا، مگر ان کی اولوالعزمی اور بلند ہمتی نے بالآخر ان کو اس مقام پر پہنچایا جس کو حدیث میں لفظ احسان اور قرآن مجید میں تزکیہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے''۔(۱)

سید صاحبؒ اور تفسیر قرآن

جیسا کہ معلوم ہے کہ سید صاحب نے قرآن کی کوئی مستقل تفسیر تیار نہیں کی، لیکن ان کے مضامین اور کتابوں میں جا بجا پھیلے ہوئے تفسیری نکات اور اعجاز قرآنی کی مثالیں اور نہایت گہرائی کے ساتھ کتاب اللہ کا مطالعہ اور خالص عربوں کے درمیان انھیں کی زبان میں قرآن کا نزول اور اس کی زبان و بلاغت کا اچانک ظہور، ان کا حیرت میں مبتلا ہونا اور قرآن کریم کی آیتوں کو پڑھ کر ان سے مسحور ہو جانا اور اس کا ان کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر جانا پھر ان کا یہ کہنا کہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا، اور اگر ہوتا تو ہماری فصاحت و بلاغت سے بہت کم تر ہوتا، لیکن یہ کلام فصاحت و بلاغت کی آخری چوٹی سے تجاوز کر کے اس سے بہت زیادہ بلندی پر پہونچا ہوا ہے۔

یہ ساری باتیں بلکہ ان سے بہت زیادہ سید صاحب کے مطالعۂ قرآن کے ضمن میں موجود ہیں، اگر ان سب کو جمع کر دیا جائے تو ایک مستقل تفسیر تیار ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے پر خاص انعام ہے کہ ان کی قرآن فہمی اور اس کی بلاغت و اعجاز پر جو تحریریں

(۱) مضمون بعنوان: علامہ سید سلیمان ندوی: از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی افکار سلیمانی: مرتبہ مولانا مجیب اللہ ندوی ۱۲۔۱۳

موجود ہیں خاص طور سے سیرۃ النبی اور معارف کے شذرات میں یہ نمونے موجود ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ ان تفسیری نکات کو جمع کرنے کا کام شروع ہو چکا ہے اور اس کے کچھ نمونے البعث الاسلامی میں ''مفاهيم تفسيرية للعلامة السيد سليمان الندوي'' کے عنوان سے ندوۃ العلماء کے نوجوان استاذ مولوی محمد فرمان ندوی کے قلم سے شائع ہو چکے ہیں، اور ''مفردات القرآن للعلامة السيد سليمان الندوي'' کے نام سے ۵۰/ قسطیں البعث میں شائع ہو چکی ہیں، نیز تفسير القرآن بالقرآن از علامہ سید سلیمان ندوی کے نام سے ایک دوسرا سلسلہ جاری ہے۔

مولانا محمد اویس نگرامی ندویؒ

سید صاحب اپنے شاگردوں کی تربیت کا اور ان کی علمی ترقی کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے، ان کے شاگردوں میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے شیخ التفسیر مولانا محمد اویس ندوی نگرامیؒ تھے، انہوں نے دار المصنفین میں سید صاحب کی خدمت میں رہ کر قرآن کے مضامین اور ان کی بلاغت و اعجاز پر گہرا مطالعہ کیا، اور قرآن کریم کے تفسیری ذوق سے بہرہ اندوز ہوئے، پھر سید صاحب کے مشورہ سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر کے استاد کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا، پھر شیخ التفسیر کے منصب پر فائز ہوئے، سید صاحب کی خدمت میں رہ کر انہوں نے ابن تیمیہ و ابن قیم کے افکار علمیہ کا بغائر نظر مطالعہ کیا اور ابن تیمیہ پر تنقید اور ان کی فکر کی مخالفت کے جواب میں ایک پر مغز مضمون لکھکر مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے رسالہ ''الفرقان'' میں شائع کرایا، وہ ان دونوں حضرات کی کتابوں کو مطالعہ کرنے کی طلباء کو ترغیب دلایا کرتے تھے، حضرت مولانا علی میاں صاحب نے اپنی کتاب ''پرانے چراغ'' میں مولانا محمد اویس ندوی نگرامی کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے تفسیری ذوق کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''تفسیر ان کا خاص موضوع تھا، اور ان کی نگاہ اس میں روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی جارہی تھی، کتب خانہ ندوۃ العلماء کے ذخیرہ تفسیر

میں سے مشکل سے کوئی اہم کتاب نظر سے بچی ہوگی، ایک زمانہ میں تفسیر قرطبی کا ان کو بڑا شوق اور اس کی طباعت کا بڑا انتظار تھا، بالآخران کو اس کے مطالعہ کا موقع ملا، بعض ایسی تفاسیر جو ابھی ہندوستان میں عام اور متداول نہیں ہوئی ہیں، انہوں نے بڑے اہتمام سے حاصل کیں اور بڑے شغف سے ان کا مطالعہ کیا، مثلاً علامہ جمال الدین قاسمی دمشقی کی ''تفسیر قاسمی''، اردو میں تفسیر پر جو کام ہوا ہے، اس میں وہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ کی ''تفسیر ماجدی'' کے بڑے قائل اور معترف تھے، اور اپنے شاگردوں کو اس کے مطالعہ کا مشورہ دیا کرتے تھے۔

وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ''الفوز الکبیر فی اُصول التفسیر'' کے بڑے قدرشناس اور اس کے داعی ومبلغ تھے، انہوں نے اس پر بڑے مفید اور قیمتی حواشی لکھے جس کو پاکستان کے مشہور عالم مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب نے مکتبہ سلفیہ لاہور کی طرف سے بڑے قدر واہتمام کے ساتھ شائع کیا، میرے خیال میں ''الفوز الکبیر'' کی توضیح وتشریح اور اس کے نہایت مختصر ہونے کی بنا پر اس کے اجمال کی تفسیر پر بہت کم لوگ ایسے قادر ہوں گے جیسے مولانا اپنے وسیع مطالعہ اور طویل درس وتدریس کی وجہ سے ہو گئے تھے، الفوز الکبیر کے علاوہ انہوں نے شاہ صاحب کی دوسری کتاب ''العقیدۃ الحسنۃ'' جو عقائد اہل سنت میں ایک مختصر متن ہے، پر بھی مفید حواشی اور توضیحات کا اضافہ کیا، جو ''العقیدۃ السنیۃ'' کے نام سے مطبع ندوۃ العلماء کی طرف سے شائع ہوا اور ندوہ کے نصاب میں داخل ہوا''۔(۱)

جرمنی مستشرق نولڈیکی کی جہالت اور اس کا جواب

مولانا محمد اویس نگرامی ندویؒ نے مستشرقین یورپ کی ناانصافیوں اور ان کی جہالت

(۱) پرانے چراغ ج۳ص:۲۵۵۔۲۵۶

کا پردہ فاش کرتے ہوئے جرمنی مستشرق نولدیکی کے بارے میں اس کی علمی بے مائیگی کا ذکر کرتے ہوئے اس کی جاہلانہ معلومات میں اس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ قرآن کریم محمد ﷺ کی تصنیف ہے، اس نے (Encyclopaedia of Britanica) میں قرآن کریم پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ چونکہ محمد (ﷺ) صرف عربوں کے حالات سے واقف تھے، اور ان کو کسی اور چیز کی خبر نہیں تھی، اس کی جہالت کا پتہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے سرزمین مصر کی سرسبزی وشادابی کا سبب دریائے نیل کی جولانی کو قرار دیا ہے، حالانکہ اس کی شادابی کا سبب بارش ہے،، اس کا قصہ یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام جب جیل میں تھے، شہنشاہ مصر نے کہلا بھیجا کہ اس نے خواب میں سات موٹی موٹی گائیں دیکھی ہیں، جن کو سات دبلی سی گائیں کھائے جاتی ہیں، اور سات بالیاں سبز دیکھی ہیں، اور کئی خشک دیکھا ہے، لہٰذا میں اس خواب سے بہت پریشان ہوں، حضرت یوسف علیہ السلام نے اس خواب کی تعبیر بتائی اور فرمایا کہ: سات سال تک بدستور کاشتکاری کرتے رہنا، پھر جو فصل تم کاٹو اس کو بالیوں ہی میں رہنے دینا، مگر تھوڑا سا کھانے کے بقدر صاف کر لینا، آیت میں تعبیر کے ضمن میں یہ بھی آیا کہ پھر اس کے بعد ایسا سال آئے گا جس میں بارش کی مدد حاصل ہوگی اور اس سال وہ شیرہ نچوڑیں گے، آیت کے اندر لفظ ''یغاث'' نولدیکی کے اعتراض کرنے کی بنیاد ہے، وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ سرزمین مصر کے لئے بارش کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ محمد ﷺ دوسرے ملکوں کے حالات سے واقف نہیں تھے، یہ اعتراض نولدیکی کی کھلی ہوئی جہالت پر دلالت کرتا ہے، اس لئے کہ مفسرین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہاں پر ''یغاث'' غیث سے مشتق نہیں، بلکہ غوث سے ہے جس کے معنی مدد کے ہیں۔

لیکن عام مفسرین کا خیال ہے کہ یہ غیث سے ہے، اور اس کے معنی بارش کے ہیں، اور ظاہر ہے کہ دریائے نیل میں پانی کی فراوانی صرف بارش کے پانی سے ہے۔(۱)

انہوں نے ابن القیم کی تصنیفات اور کتابوں سے تفسیری مضامین کو مرتب کیا اور یہ

---

(۱) البعث الاسلامی ج ۳۔۴

''التفسیر القیم'' کے نام سے مطبع السنۃ المحمدیۃ سے خوبصورت انداز میں شائع ہوئی اور ممالک عربیہ میں بالخصوص سعودی عرب حجاز ونجد میں مقبول ہوئی، اور تعارف کا ذریعہ بنی، ان کا ارادہ تھا کہ وہ تفسیر ابن تیمیہ کے نام سے علامہ ابن تیمیہ کی کتابوں میں جہاں کہیں بھی کوئی تفسیری مواد موجود ہے اس کو وہ اسی نہج پر جمع کر کے شائع کراتے، مگر افسوس کہ عمر نے وفا نہیں کی۔

دار العلوم میں مولانا کا درس قرآن

مولانا محمد اویس نگرامی رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے اونچے درجات میں قرآن کریم کی تفسیر کا درس دیتے تھے، اور بڑے انہماک کے ساتھ اپنے طلباء کو قرآن کریم کی بلاغت واعجاز کی طرف توجہ دلاتے، اور ان کو غور وتدبر کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کا مشورہ دیتے تھے، اسی کے ساتھ ان کا ہفتہ وار درسِ قرآن لکھنؤ شہر کے ایک بڑے سرکاری افسر جناب سید صدیق حسن صاحب مرحوم کی درخواست پر ان کی کوٹھی میں ہوا کرتا تھا، جہاں لکھنؤ شہر کے معزز حضرات جمع ہوتے تھے، اور مولانا کے درس سے پوری طرح مستفید ہوتے تھے۔

مولانا عبد السلام قدوائی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا عبد السلام قدوائی ندوی رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم میں ۱۹۳۴ء میں منصب تدریس پر فائز ہوئے، اور تاریخ ومعاشیات کے مضامین کے ساتھ وہ دینیات کی کتابیں بھی پڑھانے لگے اور اور اس وقت قرآن کا درس بھی دیتے تھے، اس سے قرآن کریم سے ان کی خاص وابستگی کا پتہ چلا، وہ اپنی خاکساری اور تواضع میں بے مثال حیثیت کے مالک تھے، اور اپنے طلباء سے بے تکلف باتیں کرتے تھے، جنوری ۱۹۴۰ء میں جب علامہ سید سلیمان ندوی کے حکم سے الندوہ کا تیسری بار اجراء ہوا تو اس کی ادارت میں مولانا قدوائی کا نام سرفہرست تھا، یہ رسالہ نہایت آب وتاب کے ساتھ شائع ہونا شروع ہوا، انہوں نے عربی وادب کو پڑھانے کے لئے امین آباد میں ایک کوچنگ سنٹر بھی قائم کیا تھا اور بہت سے نوجوانوں نے وہاں عربی زبان سیکھنے کی غرض سے داخلہ لیا تھا۔

ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندویؒ

ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندویؒ نے ''قرآن کریم تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا معجزہ'' کے نام سے بہت ہی مفصل علمی اور تاریخی کتاب تحریر فرمائی ہے، مولانا دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اپنے تدریسی عہد میں شعبہ عربی ادب کے سربراہ رہے، اور ادب کی کتابوں کے ساتھ قرآن کریم کا درس دینے کا موقع بھی ملا، وہ حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب'' مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی'' جو''مضامین قرآن'' کے نام سے لوگوں میں معروف تھی، ایک عرصہ تک درجات عالیہ میں پڑھاتے رہے، اور ایک ادیب اریب ولبیب ہونے کی وجہ سے قرآن کریم کی بلاغت اور اس کے اعجاز سے پوری طرح لذت آشنا تھے، اور قرآن کریم کے حقائق ودقائق اور اس کے اسرار ومعارف پر ہمیشہ غور وتدبر کیا کرتے تھے، انہوں نے عہد آخر میں قرآن کریم کے اعجاز اور اس کو تاریخ انسانی کا سب سے بڑا معجزہ ہونے پر اپنی مدلل اور مفصل گفتگو کی ہے، ہم اس کتاب کی ابتدائی پیراگراف کو اس کتاب کے تعارف میں پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

> ''قرآنِ کریم ایک معجزہ ہے جو اپنے نزول کے وقت سے لے کر آج تک قائم اور قابلِ مشاہدہ ہے، جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ''عصا'' اور ''یدِ بیضا'' کا معجزہ دیا گیا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ معجزہ دیا گیا تھا کہ آپ اللہ کے حکم سے مردہ جسم میں جان ڈالدیا کرتے تھے، اور پیدائشی نابینا اور کوڑھ کے مریض کو بحکم خداوندی تندرست کردیا کرتے تھے مگر یہ معجزے سب کے سب اسی وقت تک قابل مشاہدہ تھے جب تک یہ پیغمبرانِ برحق اس دنیا میں موجود تھے، آج اگر آپ ایک یہودی سے دریافت کریں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کیا معجزہ تھا، جواب بھی باقی ہو، یا کسی عیسائی سے دریافت کریں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کون سا معجزہ باقی ہے جو انہوں نے اپنی نبوت کی دلیل میں پیش کیا تھا تو وہ ان معجزات کو

دکھانے سے قاصر رہے گا، لیکن رسول اللہ ﷺ کو جو معجزہ عنایت ہوا وہ قرآن ہے جو آج بھی ہے اور انشاء اللہ رہتی دنیا تک رہے گا، اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہر نبی کو ایسا معجزہ دیا گیا جو اس کے عرصۂ نبوت میں کام آسکے اور اسی قدر روئے زمین کا احاطہ کر سکے جس قدر رقبہ کے لئے ان کی بعثت ہوئی تھی، حضرت سیدنا محمد بن عبداللہ رسولِ عربی ﷺ کی بعثت سارے عالم اور ہر زمانہ کے لئے ہوئی اس لئے آپ کو معجزہ بھی ایسا دیا گیا جس کا ہر جگہ اور ہر زمانہ میں مشاہدہ کیا جا سکے اس حقیقت کے بیان میں اللہ کے کسی پیغمبر (علیہ السلام) کی خدانخواستہ اہانت نہیں ہے، ہر نبی نے اپنا فرض ادا کیا اس کو جس زمان ومکان کے اعتبار سے مبعوث کیا گیا اس میں وہ کامیاب رہا۔

معجزۂ قرآنی کا اہم ترین پہلو قرآن کی لسانی خوبیاں اور فصاحت وبلاغت ہے، جس کو سن کر بہت سے سچے دل کے انسان ایمان لے آئے، اور جو ایمان نہیں لائے انہوں نے آپ کو ''ساحر'' کہا، قرآن کا دلوں پر جو اثر پڑتا ہے اس کو جادو کہا، یہی نہیں بلکہ آپ ﷺ کو ''مجنوں'' کہا، مگر یہ سب نے تسلیم کیا کہ اس کے اندر ایک طاقت ہے جو سخت سے سخت دل کو پگھلا دے۔

اسی طرح قرآن نے کفار ومشرکین کو چیلنج کیا اور کہا کہ پورا قرآن لاؤ پھر کہا اگر پورا قرآن نہیں لا سکتے تو دس آیتیں لا کر دکھلاؤ، اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو ایک ہی سورہ بنا کر دکھلاؤ، اور قرآن کریم نے پیشن گوئی بھی کر دی کہ تم قیامت تک ایک آیت بھی وضع نہیں کر سکتے۔(۱)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی ایک گرانقدر تصنیف:

قرآنیات کے موضوع پر ابھی حال ہی میں دار الرشید لکھنؤ کی طرف سے منظر

(۱) قرآن کریم تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا معجزہ: ۳۹-۴۰-۴۱

عام پر آنے والی کتاب: قرآن کریم انسانی زندگی کا رہبر کامل مؤلفہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ہے، یہ کتاب قرآن اور علوم قرآن کے اکثر موضوعات پر مشتمل ہے، گیارہ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں ایسے لعل و جواہر موجود ہیں جو قرآن کو الہی کتاب ہونے پر دلیل فراہم کرنے کے ساتھ انسانی زندگی کو صحیح رخ پر گامزن کرنے کا ذریعہ ہیں، اس کتاب پر مقدمہ جناب مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی نے لکھا ہے، یہ کتاب ۳۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

امانت کا قرآنی تصور

اس سلسلہ میں ''امانت کا قرآنی تصور'' مولانا سید سلمان حسینی ندوی کی کتاب ہے، چونکہ وہ بھی قرآن کریم کا درس دیتے ہیں، اور دار العلوم کے سینیئر اساتذہ میں شمار کئے جاتے ہیں اور کلیۃ الدعوۃ کے عمید بھی ہیں، اس لئے ان کی کتاب کا ایک پیراگراف پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

''قرآن میں امانت کا استعمال

قرآن کریم میں لفظ ''امانت'' چھ مقامات پر استعمال ہوا ہے، دو مرتبہ مفرد کے صیغہ کے ساتھ، اور چار مرتبہ جمع کے ساتھ، دو مکی سورتوں ''سورۂ مومنون، سورہ معارج، اور چار مدنی سورتوں ''سورۂ بقرہ، سورۂ نساء، سورۂ انفال، سورۂ احزاب میں۔ ان سورتوں کی نزولی ترتیب بظاہر مندرجہ ذیل معلوم ہوتی ہے:

۱۔المعارج	۲۔المؤمنون	۳۔البقرہ
۴۔النساء	۵۔الأنفال	۶۔الأحزاب

سورۂ بقرہ میں ''امانت'' کا لفظ مفرد طور پر ایک خاص تشریعی سیاق میں آیا ہے، اور ایک دوسری جگہ مفرد ہی ایک خاص تکوینی سیاق میں استعمال ہوا ہے، ان دو جگہوں کے علاوہ دوسرے مقامات پر تشریعی معنی یا

آداب واخلاق اور صفات وخصوصیات کے سیاق میں وارد ہوا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ مکی سورتیں مدنی سورتوں سے مختلف ہیں، ان کا خاص امتیاز یہ ہے کہ ان میں عقائد، بہترین انسانی اخلاق اور ایمانی اوصاف وخصوصیات کے بیان پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

(اخلاق کے باب میں) مکی سورتوں میں اس طریقۂ زندگی سے کی گئی ہے جس کی بنیاد صحیح اسلامی عقیدہ پر قائم ہو، یعنی: ربوبیت الوہیت اور حاکمیت میں اللہ کو ایک اور یکتا مانا جائے، لیکن ان سورتوں میں ان متعین امور واحکام اور تشریعات وقوانین کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے جو بعد کے مدنی دور میں نازل ہوئے"۔(۱)

اس مختصر تذکرہ کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ندوی فضلاء اور علماء کے قلم سے قرآن کریم کے موضوع پر جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان کا ایک سرسری جائزہ پیش کر دیا جائے، مضمون کے موضوع سے پوری مطابقت رکھنے والے مضامین اور فضلائے ندوہ نے قرآن کریم کے تعلق سے جو کتابیں لکھی ہیں ان کو ذکر کر دیا جائے، اسی طرح اس موضوع سے متعلق مضامین لکھنے کا شرف جن لوگوں کو حاصل ہوا ہے، ان کے نام مع موضوع کے عنوان کے اس مختصر مضمون میں پیش کر دیا جائے۔

قرآن اور علوم قرآن پر فضلائے ندوہ کی تصانیف

ارض القرآن	علامہ سید سلیمان ندوی
مقالات سلیمان	علامہ سید سلیمان ندوی
التفسیر القیم	مولانا محمد اویس نگرامی ندوی
تفسیر ابن تیمیۃ	مولانا اقبال احمد اعظمی ندوی
تعلیم القرآن	مولانا محمد اویس نگرامی ندوی

(۱) امانت کا قرآنی تصور: ۳۳-۳۴

الخیر الکثیر فی شرح الفوز الکبیر	مولانا محمد اویس نگرامی ندوی
روح القرآن	مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی
قرآن مجید کی پہلی کتاب تا چوتھی	مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی
مطالعۂ قرآن	مولانا محمد حنیف ندوی
لسان القرآن	مولانا محمد حنیف ندوی
قرآن اور اس کی تعلیمات	مولانا عبدالقیوم ندوی
قرآن اور محمد ﷺ	مولانا عبدالقیوم ندوی
اللہ کی قرآنی نشانیاں	مولانا عبدالقیوم ندوی
تفسیر سورۂ عصر	مولانا عبدالباری ندوی
تبیان القرآن اول، دوم	مولانا احمد حسن ندوی
تفسیر آیات الاحکام	مولانا احمد حسن ندوی
مطالعۂ قرآن کے اصول مبادی	
(المدخل الی الدراسات القرآنیة)	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
قرآنی افادات	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
روائع من أدب الدعوة (دعوت وتبلیغ کا معجزانہ اسلوب)	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
تأملات فی سورۃ الکہف (معرکہ ایمان ومادیت)	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
تأملات في السور	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
النبوة والأنبياء في ضوء القرآن	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
قرآن کا مطالبہ مکمل اطاعت وسپردگی	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
أعلام القرآن	مولانا ابوالجلال ندوی
تنویر العینین بتفسیر المعوذتین	مولانا محمد اسحاق سندیلوی

الفوائد فی مشکل القرآن	ڈاکٹر رضوان علی ندوی
قرآنی مباحث	ڈاکٹر رضوان علی ندوی
تفسیر سورۂ فاتحہ	مولانا محمد ناظم ندوی
کتاب الناسخ والمنسوخ	مولانا ریاست علی ندوی
کتاب النکت للرمانی دراسۃ تحقیقۃ	مولانا عبداللہ عباس ندوی
قرآن کریم انسانیت کے لئے ایک معجزہ	مولانا عبداللہ عباس ندوی
المذاہب المحرفۃ فی التفسیر	مولانا عبداللہ عباس ندوی
تعلم لغۃ القرآن	مولانا عبداللہ عباس ندوی
اسباب التکرار فی القرآن	مولانا عبداللہ عباس ندوی
قاموس الفاظ القرآن	مولانا عبداللہ عباس ندوی
ترجمات معانی القرآن وتصور فہمہ عند الغرب	مولانا عبداللہ عباس ندوی
قرآن کریم انسانی زندگی کا رہبر کامل	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
قرآنِ پاک کی تعلیم اور اس کی عظمت	مولانا مجیب اللہ ندوی
ثبوتِ رجم	مولانا مجیب اللہ ندوی
القرآن یتحدث الیکم مؤلفہ مولانا محمد منظور نعمانی	عربی ترجمہ سعید الرحمٰن اعظمی ندوی
الفوز الکبیر فی اصول التفسیر (عربی ترجمہ)	مولانا سید سلمان حسینی ندوی
الأمانۃ فی ضوء القرآن (قرآن کا تصورِ امانت)	مولانا سید سلمان حسینی ندوی
آسان معانی قرآن	مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
مباحث فی ترجمۃ معانی القرآن	ڈاکٹر راشد نسیم ندوی
لمعات من الاعجاز القرآنی	مولانا محمد اسجد ندوی
الآثار البینات فی فضائل الآیات	مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی

علوم القرآن ازمولانا محمد تقی عثمانی	عربی ترجمہ محمد اسجد ندوی
مبادئ في أصول التفسير	محمد اکرم ندوی
الموجز في أصول التفسير اور نور التفسير	محمد فرمان ندوی

ابنائے ندوہ کے قرآنی وتفسیری مضامین ومقالات

مطبوعہ ماہنامہ ''معارف'' دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

معجزۂ قرآن کی نوعیت: معنوی پہلو	مولانا عبدالسلام ندوی	ج۶۶ شمارہ۵۔۶
نزول القرآن علی سبعۃ احرف	مولانا عبدالسلام ندوی	ج۲۵ شمارہ۵
خصائص قرآن مجید	مولانا عبدالسلام ندوی	ج۴۵ شمارہ۱
سورۂ قیامہ کے چند نکات (علامہ حمید الدین فراہی)	ترجمہ مولانا عبدالسلام ندوی	ج۷ شمارہ۱
قرآن مجید اور شاعری	مولانا عبدالسلام ندوی	ج۵ شمارہ۵
حکمت اللہ	علامہ سید سلیمان ندوی	ج۴۶ شمارہ۴۔۶
قرآن پاک تاریخی اعجاز	علامہ سید سلیمان ندوی	ج۴۳ شمارہ۲
معیار تاویل: لفظ صلاۃ قرآن شریف میں	علامہ سید سلیمان ندوی	ج۲۰ شمارہ۴
جواہر تفسیر	علامہ سید سلیمان ندوی	ج۴۱ شمارہ۲
احکام القرآن بحیثیت ایک مستقل فن	علامہ سید سلیمان ندوی	ج۱۷ شمارہ۴
کیا قرآن کا رسول کلام ہے؟	علامہ سید سلیمان ندوی	ج۴۶ شمارہ۴۔۶
فہم قرآن کے اصول وشرائط	شاہ معین الدین ندوی	ج۴۵ شمارہ۳
تدوین قرآن	شاہ معین الدین ندوی	ج۶۳ شمارہ۶

السامری	مولانا ابوالجلال ندوی	ج ۶۴ شمارہ ۱
حضرت ایوب	مولانا ابوالجلال ندوی	ج ۶۴ شمارہ ۲۔۳
تاریخ یمن ایک ورق	مولانا ابوالجلال ندوی	ج ۶۶ شمارہ ۴۔۵
داستانِ خلیل بائبل سے قدیم تر ایک صحیفہ کی روایت	مولانا ابوالجلال ندوی	ج ۶۷ شمارہ ۳
اصحاب الاخدود	مولانا ابوالجلال ندوی	ج ۶۸ شمارہ ۱
اصحاب الفیل کا واقعہ اور تاریخ	مولانا ابوالجلال ندوی	ج ۶۸ شمارہ ۴۔۵
تاریخ بابل	مولانا ابوالجلال ندوی	ج ۶۵ شمارہ ۱
الروم	مولانا ابوالجلال ندوی	ج ۶۳ شمارہ ۲
ہاروت ماروت	مولانا ابوالجلال ندوی	ج ۶۶ شمارہ ۲
سنگِ شیام یہود اور حمیر کی تاریخ	مولانا ابوالجلال ندوی	ج ۶۴ شمارہ ۴
آزر: قرآنِ مجید پر تاریخی اعتراضات	مولانا ابوالجلال ندوی	ج ۶۱ شمارہ ۲
اعمال وعبادت کی حیثیت	مولانا ریاست علی ندوی	ج ۵۲ شمارہ ۱
الناسخ والمنسوخ فی القرآن	مولانا ریاست علی ندوی	ج ۴۷ شمارہ ۳۔۴
مستشرق نولدیکی اور قرآن	مولانا محمد اویس نگرامی ندوی	ج ۵۰ شمارہ ۶
کچھ تفسیر رازی کے بارے میں	مولانا محمد اویس نگرامی ندوی	ج ۵۳ شمارہ ۶
تواضع اور قرآن	مولانا مجیب اللہ ندوی	ج ۶۵ شمارہ ۵
قرآنِ کریم کی ایک آیت کا مفہوم (موسیٰ اور طور والی آیت)	مولانا مجیب اللہ ندوی	ج ۸۷ شمارہ ۶
قرآن کریم زبان وادب کی کسوٹی	ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی	ج ۱۲۶/ ۵
سراجاً منیراً	مولانا شہاب الدین ندوی	ج ۱۰۹/ ۳

چند ناسخ ومنسوخ آیات	مولوی محمد اسماعیل ندوی	ج ۴/۸۲
زیتون کی کرشمہ سازیاں اور قرآن کی ایک عظیم پیشن گوئی	مولانا انیس الرحمٰن ندوی	ج ۶/۱۷۵
من موہن کی باتیں	ڈاکٹر سید غیاث الدین ندوی	ج ۵/۱۵
تفسیر ماجدی کے مراسلاتی مآخذ	مولانا عمیر الصدیق ندوی	ج ۱/۷۳
سورۂ تکویر کے اسرار وعجائب	مولانا شہاب الدین ندوی	ج ۲/۱/۱۷۲-۲
تجرباتی علوم اور قرآن کا نظریۂ وحی	مولانا شہاب الدین ندوی	ج ۴/۱۶۸

قرآن کریم سے تعلق رکھنے والے بندوں پر رحمت الٰہی کی بارش ہوتی ہے اور ان کو دنیا ہی میں زندگی کا حقیقی لطف حاصل ہونے لگتا ہے، انفرادی واجتماعی زندگی کے تمام حالات اور ضروریات اور مسائل میں اس کتاب ہدایت کی رہنمائی پوری وضاحت اور اعتماد کے ساتھ نظروں کے سامنے متمثل ہوجاتی ہے، اور صراط مستقیم کو اختیار کرنے اور تمام امور میں اسی کو راہ نجات تصور کرنے کا یقین دلوں میں راسخ ہوجاتا ہے، اور اھد نا الصراط المستقیم کی عملی تعبیر اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے، اور صراط مستقیم کا مفہوم خود بخود واضح ہوجاتا ہے۔

اس کے علاوہ کچھ عربی مضامین قرآن کریم کے سلسلہ میں ندوۃ العلماء کے عربی ترجمان ماہنامہ البعث الاسلامی میں ناچیز کے قلم سے شائع ہوئے، جن کے چند عناوین حسب ذیل ہیں:

(۱) من حضارة القرآن الى حضارة الأوهام ج ۵۰ شماره ۸
(۲) تأملات في القرآن الكريم ج ۵۶ شماره ۷
(۳) قراءة في القرآن الكريم ج ۵۷ شماره ۲
(٤) مكانة المرأة في القرآن الكريم ج ۵۹ شماره ٤
(٦) ماذا تعني الخلافة في الأرض ج ۵۹ شماره ۵

باب سوم

اسلامی ثقافت: وسائل وحقائق

تاریخی معلومات اور فکری رجحانات سے واقفیت

تاریخی معلومات اور ان کے ذریعہ فکری رجحانات سے واقفیت، ہماری اسلامی ثقافت کا ایک اہم ترین عنصر ہے، اس کے بغیر ہم اسلامی ثقافت کو مکمل نہیں کہہ سکتے۔

تاریخ دراصل زندگی کے واقعات وحالات اور اس کے ماضی کے کردار وکارناموں کے مجموعہ کا نام ہے، اس کا تعلق قوموں اور افراد سب سے ہوتا ہے، اور اس کی عمومیت زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے، اسی لئے ہم تاریخ کو کائنات، انسان اور زندگی کے کسی جزء سے الگ نہیں کر سکتے، اور ایک عام کائناتی لحاظ سے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں ان سب کو تاریخ اپنے سینے میں محفوظ کر لیتی ہے، اس لئے جب بھی ہم تاریخ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے عمومی حالات وواقعات اور اچھے وبرے کارناموں کا دفتر مراد ہوتا ہے، پھر ہم اس کی تقویم وتقسیم کرتے ہیں اور عالمی تاریخ، قومی تاریخ، اخلاقی تاریخ، سن کی تاریخ، اجتماعی تاریخ اور علمی تاریخ، ادبی تاریخ، مذہبی تاریخ، فکری تاریخ، اور پھر اسلامی تاریخ، اور انفرادی اور شخصی تاریخ، ان سب اقسام کو مدون کرتے ہیں، ان کی معلومات حاصل کرتے ہیں اور ان کے حالات وواقعات پڑھ کر اپنی ثقافت میں اضافہ کرتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ثقافت کی تکمیل کے لئے تاریخ کی ان تمام قسموں سے واقفیت حاصل کرنا یا کم از کم ان اقسام کی ابتدائی نوعیت کو جاننا ضروری ہے، اسلامی تاریخ پر مکمل واقفیت اور اسلامی ریاست کے مختلف عہود کی جزوی تفصیلات سے باخبر رہنا، اسلامی فکر وشریعت کے ایک نمائندے کے لئے ناگزیر ہے، اس لئے کہ ہم اپنی علمی اور دعوتی ذمہ داریوں کو اس کے بغیر صحیح طریقے سے انجام نہیں دے سکتے۔

تاریخ کی اہمیت قرآن کی نظر میں

تاریخ کی اہمیت قرآن کریم کے مطالعہ سے پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ خود قرآن کریم نے اپنے لائے ہوئے عقائد وافکار اور اعمال وکردار کی وضاحت اور ان پر ایمان راسخ پیدا کرنے کے لئے تاریخ سے بہت زیادہ اعتناء کیا ہے، گذشتہ انبیاء کی قوموں کا تذکرہ، ان کے اعمال وحالات اور انجام کی تفصیلات بیان کر کے اسلامی طریقۂ زندگی کو مثبت انداز میں دلوں کے اندر جمانے کا یہ ایک بہترین اسلوب ہے، ہماری تاریخی معلومات جس قدر وسیع ہوگی اسی قدر ہم اپنی ثقافت کو بھی پھیلا سکیں گے اور اس کا فائدہ عمومی لحاظ سے متعدی ہوگا، تاریخ کی روشنی میں ہم اپنے پیش نظر اور ہم عصر حالات وواقعات کا جائزہ لے کر اس سے نتائج کا استنباط کرتے ہیں، اور اس کی روشنی میں ہم خود اپنے لئے اور قوموں کے لئے فکر وعمل کی راہ متعین کرتے ہیں، اور زندگی کی ابدی حقیقتوں کو واقعات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

چند قابل ذکر نقاط

اس بنا پر اپنی تاریخی معلومات وثقافت کو مزید مفید وموثر بنانے کے لئے کم از کم مندرجہ ذیل نقاط کا لحاظ رکھنا ہر لحاظ سے ضروری قرار پاتا ہے:

(۱) اسلام سے قبل پائے جانے والے افکار ومذاہب اور علوم وتمدن کے حالات، غالب اور مغلوب قوموں کی زندگی میں قابل اہمیت پہلوؤں سے آگاہی، اور ان کے عمومی حالات کا ایک جائزہ۔

یہ جو قرآن کریم نے ماقبل اسلام کی تاریخ کا اشارہ اپنے معجزانہ اور بلیغ اسلوب میں کیا ہے اور فرمایا:

واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا، واذكروا نعمة الله عليكم اذ كنتم أعداء فألف بين قلوبكم فأصبحتم بنعمته اخوانا وكنتم على شفا حفرة من

النار فأنقذكم منها كذلك يبين الله لكم آيته لعلكم تهتدون" (آل عمران:۱۰۳)

''اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلے کو اس طور پر کہ تم سب باہم متفق بھی رہو اور باہم نا اتفاقی مت کرو اور تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم دشمن تھے، پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی سو تم خدا تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے سو اس سے اللہ تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی، اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے احکام بیان کر کے بتلاتے رہتے ہیں تا کہ تم لوگ راہ پر رہو) تو اس سے اس وقت کی زندگی کے حالات و واقعات کو معلوم کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے جس میں آخری درجہ کا انتشار، عداوت، باہمی آویزش اور انسانی زندگی تباہی و ہلاکت کی اس آخری سرحد تک پہنچ گئی تھی، جس کے بعد ہولناک تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے، اگر ہم اس آیت کی تشریح وتفسیر تاریخی واقعات کی روشنی میں کریں اور ان واقعات کا تجزیہ کریں تو ہمیں بے پناہ حقائق وحالات اور تفصیلات کا علم ہوگا۔ اس قدر کہ شاید ہم ان کو تاریخی طور پر جمع کرنے اور ان کی تدوین سے بھی قاصر رہ جائیں۔''

جب ہم ماقبل اسلام کی ان تاریخی تفصیلات سے باخبر ہوں گے تو زندگی، کائنات اور انسان سب کے لئے اسلام کی اس ناقابل تغیر حقیقت و دولت کو کسی حد تک ضروری سمجھیں گے اور دوسروں پر اس کی حقانیت اور اس کی عظمت کو واضح کرنے میں عظیم الشان اور مثبت کردار ادا کر سکیں گے۔

(۲) تمام ادیان و مذاہب کی تاریخ اور اس کے دائرۂ اثر کی تجدید اس کی افادیت کی مدت اور اس کے متبعین کے حالات، اور اس کے مضمرات و نتائج کا علم بڑی حد تک ضروری ہے۔

(۳) قدیم وجدید تاریخ کی خاص اہمیت رکھنے والی شخصیتوں کے حالات سے بھی واقفیت رکھنا ازبس ضروری ہے۔

(۴) نظریات وافکار اور عقلی اور تمدنی فلسفوں کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے، خاص طور سے موجودہ دور کے مادی اور الحادی نظریات وافکار اور ان کے علمبرداروں اور ان کے قابل ذکر مددگاروں اور حامیوں کے بارے میں ضروری معلومات رکھنا، ہماری اسلامی ثقافت کی افادیت کے لئے ضروری ہے۔

(۵) قدیم وجدید اصلاحی اور تجدیدی تحریکوں اور جماعتوں کے بارے میں باخبر رہنا ہماری بڑی ذمہ داری ہے۔

(۶) موجود دور میں اسلام کو خدانخواستہ بالکل کمزور کردینے اور مسلمانوں کو مٹادینے کی جو سازشیں، صہیونیت، صلیبیت اور ماسونیت اویہودیت کے پردے میں ہورہی ہیں، ان کو اچھی طرح سمجھنا اور ان کا مطالعہ کرنا بے حد ضروری ہے اور خاص طور سے مارکس نے تاریخ کا مادی فلسفہ بیان کرنے کی جو کوششیں کی ہیں اور اس مادی فلسفہ کو اسلام کے ظہور پذیر ہونے کی بنیاد بتایا ہے اسکو سمجھنا اور اسکو باطل و بے بنیاد قرار دینے کے لئے اپنے تاریخی علم کو استعمال کرنا ہماری بڑی ذمہ داری ہے۔

(۷) مستشرقین اور عیسائیت کے مبلغین اسلامی تاریخ کی تصویر بگاڑنے کی علمی تحقیق ومطالعہ کی آڑ لے کر جو کوششیں کر چکے ہیں اور برابر کررہے ہیں ان کو اچھی طرح سمجھنا اور ان کی علمی تحقیقات سے دھوکا نہ کھانا، ہماری اسلامی ثقافت کی پاکیزگی کے لئے نہایت ضروری ہے۔

موضوع سے متعلق اہم کتابیں

اس سلسلے میں چند ضروری کتابوں کا مطالعہ مفید ہوگا، ان کا نام پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔

۱	اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
۲	انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر (ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین)	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
۳	قصة الایمان بین العلم والفلسفه والقرآن	شیخ ندیم الجسر
۴	حقائق الاسلام وأباطیل خصومه	عباس محمود العقاد
۵	الفکر الاسلامی المعاصر	دکتور محمد البهی
۶	السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی	دکتور مصطفی سباعی
۷	التشریع الجنائی الاسلامی	عبدالقادر عودة
۸	الارکان الاربعه فی الاسلام	علامہ ندویؒ
۹	الربا والاقتصاد الاسلامی (سود)	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
۱۰	رجال الفکر والدعوة فی الاسلام	علامہ ندویؒ
۱۱	الحجاب	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
۱۲	اشتراکیة الاسلام	شیخ مصطفی سباعی
۱۳	المسلمون فی الهند (ہندوستانی مسلمان)	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
۱۴	جزیرة العرب	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

تاریخی اور فکری معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ہی ہمیں انسانی علوم پر بھی ایک حد تک واقفیت رکھنا چاہئے، خاص طور سے اس دور میں جو انسانی علوم مدون ہو گئے ہیں اور جن کے بعد ہماری اسلامی ثقافت بڑی حد تک ناقص رہ جائے گی، ان کا مطالعہ کرنا اور ان کے مفید نتائج سے مستفید ہونا ایک عالم کے لئے ضروری ہے۔

مثلاً علم النفس، یعنی نفسیات کے بارے میں جو اصول مرتب ہو چکے ہیں ان کو جاننا نہایت ضروری ہے اسلئے کہ اس دور میں نفسیات کی بڑی اہمیت ہے۔ اور اس کی روشنی

میں ہماری مہم زیادہ نتیجہ خیز اور اثر انداز ہو سکتی ہے اور کم وقت میں ہم زیادہ خدمت انجام دے سکتے ہیں، اس طرح علم الاجتماع، علم الاقتصاد، علم الاخلاق، یا فلسفۂ اخلاق ان علوم کی بنیاد پر ہم اسلامی تہذیب کو زیادہ واضح شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے اہلیت رکھ سکیں گے۔

اسلامی ثقافت میں

تاریخی اور فکری معلومات کی اہمیت

یوں تو اسلامی فکر و تاریخ ہی ہمارا اصل مطمح نظر ہے اور اسی سے ہمارا جذباتی لگاؤ ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی دنیا کی تاریخ، گذشتہ امتوں کے حالات، ان کے فکر و عمل کی جولانگاہیں اور قدیم و جدید انسانوں کے طرز فکر، ان کے سوچنے اور عمل کرنے کا طریقہ، اسلام سے قبل پائی جانے والی قوموں کے احوال و واقعات، ان کے معاشرے کی خصوصیات، اس کے اثر سے ان کی تہذیبی روایات اور فکری پرواز، مادیات سے ان کا لگاؤ ان کا تمدنی سرمایہ اور اصل سرچشمۂ زندگی سے دوری، پھر اسلام آنے کے بعد زندگی میں تبدیلی، ان کے موقف میں نرمی اور اصل مقصد حیات کے بارے میں ان کا غور و فکر اور ایمان و یقین اور عقیدہ و عمل سے ان کا لگاؤ، ایک نئی تہذیب، نیا ماحول اور نیا فکری رجحان، اور عام طور سے دو قسم کے انسانی معاشرے کا وجود، ایک اسلامی معاشرہ، دوسرا غیر اسلامی معاشرہ، ان تمام تاریخی حقائق و تفصیلات سے ہم کو باخبر رہنا، ہماری ثقافت کی وسعت اور اس کی افادیت کے لئے نہایت ضروری ہے۔

دور جاہلیت سے بہت پہلے پائے جانے والے یونانی علوم و فنون اور یونانی فلسفے کس درجہ اہمیت رکھتے تھے، یونانی تمدن کی کیا شکل تھی اور اس کی کیا خصوصیات تھیں، اس کا فلسفۂ الٰہیات کس نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتا تھا، اس کے اصل مؤسس اور نمائندے کون لوگ تھے، اور ان کے متبعین نے کس قدر ان کا اثر قبول کیا، رومی تہذیب اور علوم و فنون کس طرح یونانی فلسفۂ حیات کی بنیاد پر قائم ہوئے، اور انہوں نے اپنے پیشرو یونانیوں سے کیا فوائد حاصل کئے، اسلام کی آمد کے وقت رومی تہذیب کی کیا حالت تھی، جاہلی عربوں کا اس سے

کس حیثیت سے تعلق تھا، ایرانی تہذیب کی خصوصیات اور اس کا اثر کس نوعیت کا تھا، مذہب کا کیا مقام تھا اور اس سے زندگی کا تعلق کس درجہ میں قائم تھا، عیسائیت، یہودیت بودھ ازم، ہندو مذہب، برہمن پرستی، اونچ نیچ کا تصور، بت پرستی کی لعنت، عورت کے ساتھ معاملہ، نیچے طبقے کے افراد کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک، مصر وشام، عرب اور حبشہ، روم وایران چین اور ہندوستان کے سیاسی، اجتماعی، تمدنی اور مذہبی حالات کی کیا تفصیلات ہیں، یہ ماقبل اسلام کی تاریخ سے متعلق چند نمایاں عنوانات ہیں جن کے بارے میں ہماری تاریخی معلومات کا دائرہ وسیع ہونا ضروری ہے۔

پھر جاہلی عرب کی تاریخ کا سیاسی اور اجتماعی نظام کس بنیاد پر قائم تھا، تمدن کی کیا حالت تھی، اور کائنات وزندگی کے بارے میں جاہلی عربوں کا کیا موقف تھا، بت پرستی، معرکہ آرائی، انتقامی رجحان، نام نہاد فخر اور نام ونسب کا غرور، زبان دانی اور فصاحت وبلاغت کا گھمنڈ، سخت دلی، اور بے دردی کا معاملہ، ضد اور جھوٹے وقار کا شدت سے مظاہرہ، آخرت کے بارے میں انکار کا رویہ، اور نام ونمود کے لئے بڑی سے بڑی قربانی پیش کردینے میں ذرا تردد نہ کرنا، یہ سب نمایاں عنوانات ہیں جاہلی زندگی کے۔

دوسری طرف رومی اور ایرانی تہذیب اپنے عروج پر تھی، مشرق میں ایران کا طوطی بول رہا تھا تو مغرب میں رومی حکومت اپنا اثر دکھا رہی تھی، انسان کی قیمت صرف یہ تھی کہ وہ ان حکومتوں سے کسی نہ کسی درجہ میں اپنی وابستگی ثابت کرتا رہے، وہ خدمت کے ذریعہ اپنی غلامی اور بندگی کا مظاہرہ کرتا رہے، اور جس قدر تذلل اور پستی کا تصور ممکن ہو اس کے اظہار میں پس وپیش کو ہرگز روا نہ رکھے، شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغۃ میں غیر طبعی تمدن کی بعض تفصیلات بیان کی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ رومیوں اور ایرانیوں کی نظر میں عام انسان کی قیمت جانوروں سے زیادہ نہیں تھی، یعنی اخلاقی انحطاط اپنے آخری درجہ کو پہونچ چکا تھا، اور بظاہر اصلاح کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی، کہ اسی حالت زبوں سے اللہ تعالیٰ نے ایک بار پھر اس کائنات کو نئی زندگی بخشے اور انسان کو اس کا

فطری حق عطا فرمانے کا فیصلہ کیا، اور تہامہ کے افق سے اسلام کا سورج طلوع ہوا۔

حضور ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا اور عربوں کا کیا حال تھا، ان کی زندگی میں فساد کی نمایاں شکلیں کیا تھیں، حضور ﷺ ایک عالمگیر اور زندہ و پائندہ مذہب کے نمائندے اور اللہ تعالیٰ کے آخری رسول تھے، وہ انسانیت کی فلاح واصلاح کے لئے بھیجے گئے تھے، اور انسان کو اس کے صحیح مرتبہ پر واپس لانا، ان کا اصل وظیفہ تھا، "انا أرسلناك شاهدا ومبشر ونذيرا وداعيا الى الله باذنه وسراجا منيرا" . (سورۂ احزاب :۴۵۔۴۶) (اے نبی! ہم نے بیشک آپ کو اس شان کا نبی بنا کر بھیجا کہ آپ گواہ ہونگے اور آپ مومنین کے بشارت دینے والے ہیں اور کفار کے ڈرانے والے ہیں، اور سب کو اللہ تعالیٰ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں) "هو الذی أرسل رسوله بالهدی ودين الحق ليظهره على الدين كله وكفى بالله شهيدا". (سورۂ فتح:۲۸) (وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت دی اور سچا دین یعنی اسلام دیکر دنیا میں بھیجا ہے، تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے اور اللہ کافی گواہ ہے) "هوالذی بعث فی الأميين رسولا منهم يتلوعليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة، وان كانوا من قبل لفی ضلال مبين". (جمعہ:۲) (وہی ہے جس نے عرب کے ناخواندہ لوگوں میں انہی کی قوم میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتیں ہیں اور ان کو عقائد باطلہ واخلاق ذمیمہ سے پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی کی باتیں سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ آپ کی بعثت کے پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے)

انبیاء کا طریقۂ کار

جاہلیت سے اسلام کی طرف منتقلی کا عمل، دعوت وجہاد

اسلامی معاشرہ اور اسلامی قیادت کا اور خلافت راشدہ، فتوحات اور صحابۂ کرام کا مومنانہ موقف، بنی امیہ کا نظام خلافت، اور خلافت عباسیہ کا دور، اور پورے چارسوسال تک

ان کا زمانۂ حکومت، پھر اسلامی زندگی میں انحطاط، سیاست و مذہب کی علاحدگی کی دعوت، جاہلانہ افکار کا اختلاط اسلامی فکر کے ساتھ اسلام کی غلط نمائندگی، دعوت اسلامی سے بے رغبتی، گمراہی اور بدعات کا رواج، ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں کا حملہ اور اسلامی مملکت کا خاتمہ آخری فرمانروا خوارزم شاہ۔

نویں صدی ہجری میں عثمانی ترکوں کا اسلامی قیادت کی باگ دوڑ سنبھالنا، محمد الثانی بن مراد نے ۲۴ رسال کی عمر میں قسطنطنیہ کو کس طرح فتح کیا، اور عثمانی قیادت کا دور شروع ہوا، بیک وقت یورپ، ایشیا اور افریقہ میں براعظموں پر ان کی حکمرانی، یورپ کا ان کے سامنے ہتھیار ڈال دینا، ایران سے مراکش تک اور ایشیا کوچک اور یورپ تک ان کا دور دورہ۔

پھر ترکوں کا انحطاط، اخلاقی، علمی اور فکری میدانوں میں ان کا زوال، اور عام مسلم قوم کی پسپائی، شکست خوردہ ذہنیت کا پھیلاؤ، اس طرح ہندوستان میں اسلام کا داخلہ، یہاں کی تاریخ اور علمی و تہذیبی ارتقاء، اصلاح جدید کی عظیم الشان کوششیں، اس کے علمائے اعلام اور اسلامی دور حکومت، مسلمانوں کے کارنامے، اسلامی فکر کے نمائندے، علم و تربیت کے مراکز۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ، مغربی تہذیب کا عروج، رہبانیت اور مادیت کی کشمکش، ریاست و کلیسا کی باہمی مادیت کی فتح، ڈارون کا ارتقائی نظریہ اور اس کا بول بالا، وطنیت اور قومیت کا فلسفہ اور اس کی طاقتور تاثیر، قومی عصبیت کا ظہور یورپ میں اور مشرق میں اس کا اثر، مغرب زدہ مسلمانوں کا طبقہ، مغربی تہذیب سے شدید مرعوبیت، عالم اسلام میں مغربی سامراج کا دخول، غلامانہ زندگی پر اطمینان کی روش۔

مغربی تہذیب کا مثبت پہلو، ایک صنعتی انقلاب، نئے سائنسی انکشافات، علمی دریافت اور تمدنی ترقیات، زندگی کو آسان بنانے پر زور، وقت کی قیمت کا احساس، کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مفید کام کرنے کی کوشش، لیکن اس کا منفی پہلو، وسائل و مقاصد کو ایک ہی ترازو پر تولنا، اور دونوں میں کسی قسم کی تفریق نہ کرنا، اخلاقی پہلو سے غفلت برتنا، اور انسانیت کی خدمت کے لئے کسی قسم کا کوئی تعمیری منصوبہ بنانے سے انکار کرنا، بلکہ اس کی تباہی کے

اسباب فراہم کرنا، اور ایسے آلات واسلحہ تیار کرنے کی فکر میں سرگرداں رہنا جن سے انسانی معاشرہ کا وجود ہی ختم ہو جائے، اسی کا نتیجہ تھا کہ دو عالمی جنگ قریبی وقفے میں برپا ہوئی، اور اس نے انسانیت اور اخلاق کو مٹانے اور مذہب وعقیدہ کی بنیاد کو منہدم کرنے میں بڑا کردار ادا کیا، مذہب اور اخلاق سے سراسر بے اعتنائی برتنا اس تہذیب کا اصل المیہ ہے۔

مگر اس کے باوجود عالم اسلام کے لئے اس تہذیب کا مرکز توجہ بننا بھی اس سے کم تر کوئی المیہ نہیں ہے، مغربی تہذیب کو انسانی زندگی کی ترقیات کے لئے نمونہ سمجھنا، ایک عام احساس ہے، اور اسلام کو محض عبادات تک محدود سمجھ کر کائناتی ترقیات میں مغرب کی پیروی کرنا اور ریاست کے معاملات میں اہل مغرب کے نظریات اور فلسفے کو اختیار کرنا، عالم اسلام کی ایک عام روش بن گئی ہے، اور مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کا یہی خیال ہے۔

خیال اور روش کو تقویت پہنچانے کے لئے مغربی تہذیب کے مسلمان نمائندے اپنا اپنا کام ہر زمانے میں کرتے رہے، بیسویں صدی اس لحاظ سے زیادہ پر آشوب اور پر فتن رہی، اس صدی میں نام نہاد مسلم دانشوروں اور ان کے مفکرین کی ایک جماعت تیار ہوگئی، اگر چہ اس مہم کو انجام دینے اور اسی شاگرد پیشہ جماعت کے تیار کرنے میں مغرب کے مادی مفکرین کی تمام تر محنت کو دخل ہے، اور اس منصوبے کو بروئے کار لانے کا عمل ہے، جو ان مغربی اہل فکر نے اسلام کو نا قابل تلافی نقصان پہونچانے کے لئے تیار کیا تھا۔ اس کا اولین مظہر مغربی اساتذہ کے یہ اطاعت شعار شاگرد تھے، اور یہ ایک طرف اپنے آپ کو اسلام کا نمائندہ قرار دیتے تھے دوسری طرف اسلامی فکر کی اور اسلامی شریعت کی ایسی تشریح کرتے تھے جو اسلامی فکر اور اسلامی شریعت سے کسی حال میں بھی ہم آہنگ نہیں تھی، اس پورے تاریخی واقعہ کو اگر تاریخی شواہد وواقعات کی روشنی میں ہم جاننا چاہیں تو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی قیمتی کتاب ''اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' میں نہایت وضاحت سے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

☆☆☆

زبان وادب

ثقافت ودعوت کا ایک مؤثر ترین عنصر

زبان وادب کسی بڑے مقصد تک پہونچنے کا ایک اہم ترین ذریعہ ہے، اسلئے کہ صحیح زبان کا استعمال بذات خود مخاطب کے لئے کشش اور اس کے حسن التفات کی کنجی ہے، ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس کا تجربہ کرتے رہتے ہیں، اور اپنی شیریں زبانی سے بہت سے مسئلے خود حل کر لیتے ہیں، اسی طرح سخت کلامی اور تیز زبانی بہت سے نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں، زبان دراصل ایک بہت ہی کارآمد سریع التاثیر اور رزو نتیجہ خیز ذریعہ ہے، مقصد کو حاصل کرنے، اور ماحول کو متأثر کرنے کا، اسی طرح اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے، اپنے نقطۂ نظر کو بیان اور اپنی فکر ورائے کو پیش کرنے کا یہ ایک بیش قیمت ذریعہ ہے، انسان کی قیمت ۵۰ر فیصد زبان سے اور ۵۰ر فیصد اس کے دل سے وابستہ ہے، اس کو عربی شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے۔

لسان الفتی نصف ونصف فؤادہ

فلم یبق الا صورۃ اللحم والدم

عقل مند کی زبان اس کا نصف حصہ ہے اور نصف حصہ اس کا دل ہے، تو گوشت اور خون کے لوتھڑے کی شکل کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہی۔

یہی وجہ ہے کہ زبان کی تاثیر اس کی صحیح ادائیگی، اور اس کی فصاحت اور شیرینی کے اندر مضمر ہے، اسی بنا پر نحو وصرف کے قواعد وضع کئے گئے، تاکہ زبان کا صحیح استعمال مخاطب کے حال، اور ماحول کے تقاضے کے مطابق ہو سکے، اور کہنے والے کو اپنی بات پیش کرنے میں کسی

دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے، اور سننے والے اس بات سے اپنے علم میں اضافہ کرسکیں، اگر آپ کا ذوق زبان صحیح ہے، اور ضرورت کے مطابق متوازن الفاظ استعمال کرنے پر آپ کو قدرت ہے، تو یقین کیجئے آپ غلط زبان برداشت نہیں کرسکیں گے اور الفاظ کی غلطی یا تعبیر وادائیگی کی بے توازنی آپ کے وجدان پر اس قدر گراں گذرے گی کہ بسااوقات دیر تک آپ اس کی تکلیف محسوس کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ لہجہ کی خرابی بھی اہل زبان کے لئے عام طور سے ناقابل برداشت ہوتی ہے اور وہ اس طرح کے حالات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت اپنے اندر نہیں پاتے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مقصد کے حصول اور منزل مقصود تک پہونچنے میں بہت دشواری پیش آتی ہے، عربی زبان میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ ذرا حرکت کے فرق سے ان کے معانی میں کافی تبدیلی ہوجاتی ہے، جیسے حُزن اور حزَن، اور رُخاء اور رَخاء، حَمام، اور حِمام،، نصب اور نصَب، جرْس، جرَس وغیرہ، اسلئے ضروری ہے کہ یہ فروق ہم کو اچھی طرح معلوم ہوں تاکہ اس کے معانی کے تغیر میں غلطی نہ ہو، کیونکہ یہ مفہوم کی ادائیگی اور مسئلہ کو دشوار بنانے میں بہت بڑا محرک ہے، جیسے کوئی آپ کو کھانے پر مدعو کرنا چاہتا ہے اور آپ سے یہ کہتا ہے کہ میاں صاحب! کل تم میرے گھر کھانا کھانا، تو اس کا انداز تکلم آپ کے لئے ناگواری کا باعث بنتا ہے اور آپ معذرت کردیتے ہیں، اپنے اچھے اور موثر انداز میں، لیکن اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ کل شام کو غریب خانہ پر ماحضر تناول فرمائیں، تو آپ بلا تکلف اور بخوشی اس کی دعوت کو قبول کرلیں گے، اسی طرح مفرد الفاظ کا بے محل استعمال، یا غلط تلفظ کے ساتھ اس کی ادائیگی مخاطب کے لئے بجائے پرکشش بننے کے باعث تنفر بن جاتی ہے، ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے جو بات کہی ہے اس میں ایک فرد گذاشت ہوگئی ہے یعنی فرو گذاشت ہوگئی ہے، اب آپ خود سوچیں کہ اگر واقعی کوئی فروگزاشت ہوگئی بھی ہو تو کیا فرد گذاشت کی ترکیب سننے کے بعد آپ اسی سنجیدگی سے اس کی بات پر غور کریں گے جس سنجیدگی سے فروگذاشت کہنے کی صورت میں غور کرتے؟

اہل زبان یہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ کونسا لفظ کس جگہ اور کس لہجہ کے ساتھ استعمال

ہونا چاہئے، مخاطب، ماحول، اور صورت حال یا مقتضائے حال کا وہ اپنے ایک ایک لفظ میں خیال رکھتے ہیں اور اس کے مطابق گفتگو کرتے ہیں، ایک ہی مفہوم ادا کرنا ہوتا ہے، لیکن وہ اس کو ماحول اور مخاطب کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر مختلف طریقوں سے ادا کرتے ہیں، مثال کے طور پر اگر ان کو یہ کہنا ہے کہ سونے میں دیر کرنے سے اٹھنے میں تاخیر ہوتی ہے، تو ایک استاذ اپنے طالب علم سے یوں کہے گا کہ میاں! جلدی سو جاؤ، سویرے اٹھنا ہے، ایک باپ اپنے بیٹے سے کہے گا کہ تم اتنی دیر تک کیوں سوتے ہو، اور صبح دیر تک بستر پر پڑے رہتے ہو، سویرے سویا کرو، ایک دوست اپنے دوست سے کہے گا کہ لیجئے صاحب اب سو جایئے، تاکہ صبح سویرے اٹھنے میں زحمت نہ ہو، ایک میزبان اپنے مہمان سے عرض کرے گا کہ غالباً سویرے ہی سونے کا معمول ہوگا، آپ تو بہت سویرے اٹھ جاتے ہیں، ایک شاگرد اپنے استاذ سے کہے گا کہ حضرت الاستاذ! میں نے بستر لگا دیا ہے، آرام فرمائیں، صبح کتنی سویرے اٹھنے کا معمول ہے، تاکہ میں اس وقت حاضر خدمت رہوں، ایک بیٹا اپنے باپ سے کہے گا کہ ابا جان! آرام فرمایئے آپ کو سویرے اٹھنا رہتا ہے، ایک مرید اپنے شیخ سے کہے گا کہ حضرت والا! اب آرام فرمالیں، شاید کچھ نیند آجائے۔

یہ مثال اہل زبان سے زیادہ صاحب ادب کی دلچسپی اور اس کے لئے باعث اہمیت ہے، اسلئے کہ ادب نام ہے اس خوبصورت کلام کا جس کے ذریعہ متکلم یا ادیب اپنے مافی الضمیر کو موثر طریقہ سے ادا کر سکے، خواہ اس سے زندگی یا کائنات کا کوئی سا مسئلہ بھی متعلق ہو، وہ کلام کبھی نثر ہوگا اور کبھی نظم، مفہوم کی ادائیگی جس قدر وضاحت اور موثر طریقہ سے ہوگی اسی قدر وہ بہتر کامیاب ادب سمجھا جائے گا، بہت سے لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ادب میں فخامت اور بھڑکیلا پن اور نہایت رعب دار الفاظ کا استعمال ضروری ہے، حالانکہ کسی مفہوم کی تعبیر سادگی کے ساتھ کی جائے جو آسان فہم ہو اور بلا تکلف سمجھ میں آجائے تو ادب کی صحیح شکل ہے، مثلاً اگر ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس سال آم کی فصل اچھی ہوئی ہے تو یہ کہنا زیادہ بے تکلف اور آسان فہم ہوگا کہ بازار میں ہر طرف آم ہی آم ہے، اور سستا بھی ہے، لیکن اگر یہ کہا جائے

کہ باغات کے مالکوں نے اس سال آم کی پیداوار پر پوری توجہ مرکوز کی اور اس کی حفاظت کے لئے ہر طرح کی تدابیر پر عمل پیرا رہے، تا آنکہ آم بحفاظت تمام باغوں سے بازار میں منتقل ہوئے اور اپنے کثرت وتنوع سے اور مناسب داموں کی وجہ سے عوام الناس لئے مرکز توجہ بنے، یہ دوسری ترکیب کلام کسی بے تکلف ادیب کے قلم یا زبان سے آپ نہیں سنیں گے، بلکہ مدعیان ادب اور نام نہاد ادیبوں ہی سے اس قسم کی تعبیرات سننے میں آسکتی ہیں، ایک صاحب زمین ادیب جن کو اپنے ادیب ہونے کے بارے میں بڑی غلط فہمی تھی، اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کی زبان سے ادب کے شہ پارے ادا ہوتے ہیں، وہ بھاری بھرکم الفاظ، رعب دار ترکیب اور ناقابل فہم اسلوب اختیار کرتے تھے، ایک وہ دفعہ اپنے فارم پر گئے جہاں کھیت میں کام کرنے والے مزدور موجود تھے، اور وہ ان کو دیکھ کر ان کے قریب آکر کھڑے ہو گئے، اس وقت ان کو پوچھنا تھا کہ کیا اس سال بارش بقدر ضرورت ہوگئی یا نہیں، تو سیدھے سادے عام فہم زبان میں پوچھنے کے بجائے انہوں نے کہا کہ: اے دہقانیو! امسال تمہارے کشت زار میں تقاطر امطار ہوا یا نہیں؟ وہ دیہاتی ان کی بات سمجھنے سے قاصر رہے اور کسی نے کہا کہ بھائیو! خاموشی سے سنو، صاحب! قرآن شریف پڑھ رہے ہیں، ہم میں سے بہت سے لوگ اسی طرح کی عبارت اور اسلوب کو ادب سمجھتے ہیں، اب میں ایک ہی مفہوم کی دو عبارتیں پیش کرتا ہوں۔ آپ مجھے بتائیں کہ ان میں کون سی عبارت صحیح ادب کا نمونہ ہے، یہ الجنة تحت أقدام الامهات کا ترجمہ:

(۱) سنتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے۔

(۲) زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے۔

کسی بھی زبان کو صحیح طور سے استعمال کرنے کے لئے اس زبان کے قواعد، اور اس کا مزاج سمجھنا بہت ضروری ہے، بعض دفعہ ہم اپنی تعبیرات میں کوئی ایک لفظ، یا کچھ ایسے الفاظ استعمال کر دیتے ہیں، جن کی طاقت اور روح کو دیکھتے ہوئے ان کے استعمال کے خاص خاص مواقع ہوتے ہیں، مثلاً کسی بڑے عالم یا بڑی شخصیت کا تعارف کراتے

ہوئے ہم کہتے ہیں: کان علماً شامخاً لیکن ہر کس وناکس کا تعارف کراتے وقت ہم اس کو کان علما شامخا کہیں تو کس قدر بے ادبی ہوگی اور اس لفظ کے ساتھ بے مروتی کا برتاؤ کرنے کے مرادف ہوگا، زبان کی نزاکت، اس کی مزاجی کیفیت سے ناآشنا ہونے اور اس زبان کا ذوق نہ رکھنے کی وجہ سے عبارتوں کا مفہوم سمجھنے میں بڑی غلطی ہوتی ہے اور لوگ اپنی اس غلطی پر قائم رہتے ہیں۔

بعض اساتذہ نے بتایا کہ کسی طالب علم نے ان سے دریافت کیا کہ حضرت آدم کی تخلیق پہلے ہوئی تھی یا حضرت حواء کی، تو استاذ نے بے تکلف کہا کہ حضرت آدم پہلے پیدا کئے تھے، پھر انہیں کی پسلی سے حضرت حواء کی تخلیق فرمائی گئی، تو اس طالب علم نے کہا کہ قرآن میں تو اس کے برعکس لکھا ہوا ہے، اور اس نے سورۂ نساء کی پہلی آیت تلاوت کر کے دلیل پیش کی، یا أیها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة وخلق منها زوجها، (نساء:۱) (اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا، اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا)۔ اس نے نفس واحدۃ کی تفسیر حواء سے کی اور خلق منها زوجها سے حضرت آدم کو مراد لیا، یہ اس لئے ہوا کہ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ لفظ زوج بیوی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور یہ مشترک لفظ ہے، وہ اپنی کم علمی کی وجہ سے یہی سمجھتا تھا کہ زوج کے معنی شوہر اور زوجہ کے معنی بیوی کے ہیں۔

ان چند مثالوں کے بعد یہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ ادب اپنی تمام اصناف کے ساتھ ہماری توجہ کا مرکز ہونا ضروری ہے خواہ وہ نثر ہو، یا شاعری ہو، یا ضرب الامثال وغیرہ کے جملے ہوں یا خطابت کے نمونے ہوں، خطوط اور وصیتوں پر مشتمل، ادب ہو، ان سب اصناف سے واقفیت رکھنا اور ان سب کے اسلوب اور طرز بیان سے پوری طرح باخبر رہنا ہماری ثقافت کے لئے نہایت ضروری ہے، جو لوگ شاعری کو محض ایک ذہنی عیاشی تصور کرتے ہیں اور اس کے دینی اور اخلاقی فائدے پر یقین نہیں رکھتے وہ بڑے اندھیرے میں ہیں اور بے خبری میں مبتلا ہیں، ان کو نہیں معلوم ہے کہ دعوت اسلام اور

مسلمانوں کو تقویت پہنچانے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے شعر کو بڑی اہمیت دی، اور اپنے خاص شاعروں حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ سے دفاعی اہمیت کے مواقع پر ان سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی، جب بنی تمیم کا وفد اپنے سرداروں اور شاعروں اور خطیبوں کو لے کر حضور ﷺ سے مقابلہ کرنے کی غرض سے مدینہ آیا اور نہایت بے ادبی کے ساتھ حضور ﷺ کو انہوں نے پکارا اس وقت حضور ﷺ اپنے کمرے میں آرام فرما رہے تھے، اور اسی موقع پر سورۂ حجرات کی یہ آیت نازل ہوئی۔

(ان الذین ینادونك من وراء الحجرات أكثرهم لایعقلون، ولو أنهم صبروا حتی تخرج الیهم لكان خیرا لهم والله غفور رحیم)[حجرات: ۴-۵] جو لوگ آپ کو حجروں کے پیچھے سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر (بالکل) بے عقل ہیں۔ پھر حضور ﷺ باہر تشریف لائے اور ان لوگوں نے بغیر کسی خاص تمہید کے فخریہ اشعار پڑھنا اور پھر تقریر کرنا شروع کر دیا، وہ لوگ اپنی فصاحت و بلاغت، زبان دانی اور تقریر کی تاثیر اور گرمی سے مسحور کر لینا چاہتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ ہمارے اس عظیم الشان شعر و خطابت کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے مگر حضور ﷺ نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو بلوایا، انہوں نے برجستہ ان کے شاعر زبرقان بن بدر کا بہترین اشعار میں انہیں کے ردیف و قافیہ کے ساتھ جواب دیا، اسکو سن کر پورا وفد حیرت کی تصویر بن گیا۔

پھر آپ نے اپنے خطیب ثابت بن شماس کو بلوایا اور انہوں نے فی البدیہہ ان کے خطیب عطارد بن حاجب کی تقریر کا اسی سے مشابہ ادب و اسلوب کے ساتھ ایسا بلیغ خطبہ دیا کہ بنی تمیم کا یہ وفد مبہوت ہو گیا، اور وفد کے ایک اہم رکن اقرع بن حابس نے بے اختیار ہو کر یہ اعلان کر دیا کہ واللہ یہ شخص (یعنی نبی کریم ﷺ) خدا کی توفیق و مدد سے مالا مال ہے، ان کا شاعر ہمارے شاعر سے زیادہ بلیغ اور ان کا خطیب ہمارے خطیب سے زیادہ بلند آواز ہے، اور وہ لوگ اپنی ادبی شکست تسلیم کر کے سب کے سب مسلمان ہو گئے، اس وفد میں بنی تمیم کے ستر افراد سربرآوردہ اور اعیان و شرفاء میں تھے۔

یہ واقعہ میں نے اس لئے بیان کیا کہ اسلام کی نشر واشاعت میں ادب کا کردار بہت نمایاں اور اہم ہے، اور شاعری کو بڑی اہمیت حاصل ہے، یہ صحیح ہے کہ شاعر اپنے قلبی واردات وتأثرات کو شعر میں پیش کرتا ہے، اور وہ بڑی حد تک غیر جانبدار ہوتا ہے، مگر اس کی شاعری سے بڑے بڑے کام لئے جاتے ہیں، اور اپنے نقطۂ نظر، اپنے مسلک اور خیال کی تائید میں دوسرے لوگ اس کی شاعری سے بہت فائدہ اٹھاتے ہیں۔

صحیح حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "ان من البیان سحراً وان من الشعر حکماً، (خطابت میں ساحری ہوتی ہے اور شعر وشاعری میں حکمت کی باتیں ہوتی ہیں) اسی لئے صحابہ کرام نے شاعری پر خاص توجہ دی، حضرت علیؓ کی شاعری مشہور ہے، حضرت عمر بن الخطابؓ نے اچھے اشعار کی تعلیم دینے کی طرف توجہ مبذول کرائی، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ "رووا أولادکم الشعر تعذب ألسنتهم" (اپنے بچوں کے اندر شعر کا ذوق پیدا کرو، اس سے ان کی زبانیں شیریں رہیں گی) شاعری کی اس افادیت کی بنا پر کبار صحابہ اور تابعین نے اس سے اعتناء برتا ہے اور اس سے دین کے تصور اور اس کے خط وخال کو واضح کرنے میں بڑی مدد لی ہے، مشہور تابعی حضرت امام حسن بصریؒ سے مروی ہے کہ وہ اپنے مواعظ کے دوران اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

الیوم عندك دلها وحدیثها
وغداً لغیرك کفها والمعصم

(آج اس کے ناز وانداز تمہارے لئے ہیں، اور آئندہ کل وہ دوسرے کے دست تصرف میں ہے)۔

شاعر نے تو اس کو اپنی محبوبہ کی بے وفائی اور اس کی جفا کاری کی مثال بیان کرنے کے لئے عرض کیا ہے، لیکن حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ اس شعر سے دنیا کی بے وفائی اور

اس کی بے ثباتی کی مثال دیتے تھے، اور دنیا کو اس عورت سے تشبیہ دیتے تھے جس کو ایک محبوب کے ساتھ قرار نہیں ہے بلکہ وہ روز روز اپنا محبوب بدلتی رہتی ہے۔

چوتھی صدی ہجری کے مشہور عربی شاعر ابوفراس حمدانی نے اپنے چچازاد بھائی اور اپنے امیر سیف الدولہ کو راضی کرنے کے لئے ایک قصیدہ کہا تھا، اس قصیدہ کے ضمن میں یہ چند اشعار بھی ہیں، ملاحظہ فرمائے۔

ولیتك تحلو والحیاة مریرة ولیتك ترضی والأنام غضاب

ولیت الذی بینی وبینك عامر وبینی وبین العالمین خراب

اذا صح منك الود فالکل هین وکل الذی فوق التراب تراب

(کاش آپ میرے لئے شیریں زباں ہوتے اگر چہ پوری زندگی تلخ ہوتی، اور کاش آپ مجھ سے خوش ہوتے اگر چہ تمام لوگ خفا ہوتے، کاش میرے اور آپ کے درمیان کے تعلقات استوار ہوتے اگر چہ پوری دنیا مجھ سے ناراض ہوتی، جب آپ کی محبت مجھے حاصل ہو جائے تو تمام چیزیں ہیچ ہیں اور زمین کے اوپر کی تمام چیزیں مٹی کے برابر ہیں)۔

شاعر نے تو یہ اشعار اپنے امیر و مولی سیف الدولہ کو راضی کرنے اور اس کے ساتھ اپنی وفاداری کے ثبوت کے طور پر پیش کیا تھا، لیکن اس شعر کی معنویت اور اس میں وفاداری ایک اچھوتے انداز اور عاجزی وخاکساری کی ایک دلکش ادا نے اہل اصلاح وتربیت اور اہل علم ومعرفت کو اسے اللہ تعالی کی شان میں استعمال کر کے اپنی عاجزانہ تمناؤں اور خاکسارانہ اداؤں کی تعبیر کا ذریعہ بنانے پر مجبور کر دیا اور جو کلام کسی معمولی انسان کو راضی کرنے اور اس سے اپنے گہرے تعلق کے اظہار کرنے کے لئے کہا گیا تھا وہ اپنے بلند قامت اور معیاری ادب کی بنا پر ایک نہایت پاکیزہ اور عظیم غرض کے لئے استعمال کیا گیا۔

زبان وادب کے سلسلہ میں اس حد تک ایک عام جائزہ پیش کیا گیا، اس سے ہمیں اس بات کا اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ہوگی کہ اسلامی ثقافت کی تکمیل میں اس کا حصہ کتنا قیمتی اور اہم ہے، اور سچ پوچھئے تو ثقافت کو آراستہ کرنے اور اس کی قیمت کو بڑھانے میں زبان

وادب ایک اہم ترین عنصر ہے، آپ اگر زبان کی خوبیوں، اس کے استعمال کے مواقع اور اس کے مزاج وترکیب سے واقف نہ ہوں تو اپنے علم ومعرفت کو مفید نہیں بنا سکتے، اور نہ اپنے اندر خوابیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتے ہیں اور نہ ان سے مثبت طرز فکر کو پیش کرنے کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

ہم اپنے ملک وماحول اور قوم میں رائج اور مقبول زبان وادب میں پوری دسترس حاصل کریں، یہ ہمارا فرض منصبی ہے، تاکہ ہم اپنے علوم وفنون کو اس ملک وماحول میں پیش کرکے اسکو صحیح راہ پر چلا سکیں، مثال کے طور پر ہمارے اس ملک کے ہر طبقہ میں رائج اور مقبول زبان اردو ہے، تو ہمیں اردو زبان وادب کی پختگی پیدا کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے، اور اس زبان کے اعلیٰ ترجمان بننے کی فکر کرنا اپنی ذمہ داری تصور کرنی چاہئے، اس زبان کے ادب اور اس کی اصناف پر وسیع نظر اور مہارت پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے، نثری ادب کے ساتھ شعری ادب کو بھی خاص اہمیت کے ساتھ اپنا مرکز توجہ بنانا بہت ضروری ہے، شعر میں اقبال اور اکبر الہ آبادی، کی حکمتوں سے معمور شاعری کو اپنانا چاہئے۔

اسی طرح اپنے ملک کی سرکاری زبان پر بھی پوری دسترس رکھنے کی ہماری ذمہ داری ہے، ہم اس کے نثر ونظم کے اسالیب سے واقف ہوں اور جو لوگ اس زبان کے اہل زبان ہیں، ان کو اپنی ادبی صلاحیت سے متأثر کریں، اور دین کی خدمت کے لئے اس کو اپنا مطمح نظر بنائیں۔

اسی طرح عالمی زبان وادب جیسے انگریزی اور فرانسیسی زبان، اس سے ہماری واقفیت ہو اور بوقت ضرورت اس سے اپنا کام نکال سکیں، اس زبان کے ادباء ومصنفین اور اہل قلم سے بھی واقف ہوں، اور کسی بھی موقع پر ہمیں مجبور اور بے بس نہ ہونا پڑے۔

اور سب سے اہم اور ضروری زبان جو اسلام اور مسلمانوں کی زبان ہے وہ عربی

زبان وادب ہے، اس کے لئے ہم سب بحیثیت مسلمان کے جوابدہ ہیں، اگر ہم عربی زبان وادب سے غفلت برتیں اور یہ سمجھیں کہ ہم کتاب وسنت کو براہ راست سمجھ لیں گے تو یہ ایک انتہائی غلط فیصلہ ہوگا، عربی زبان بھی اب عالمی زبان بن چکی ہے، اور اس کے جاننے والے اور سمجھنے والے ہر جگہ موجود ہیں، یہ بھی قرآن کریم کا ایک معجزہ ہے کہ دنیا کے ہر گوشے میں اس زبان کے جاننے والے موجود ہیں اور ہزاروں کوششوں اور سازشوں کے باوجود اس زبان کو نقصان نہیں پہونچایا جاسکا، حالانکہ اگر کسی اور زبان کو مٹانے کے لئے ان کوششوں کا سوواں حصہ بھی عمل میں لایا جاتا تو وہ زبان کبھی کی مٹ چکی ہوتی۔

اور اب تو عربی زبان اقوام متحدہ کی زبان بھی بن چکی ہے، ۱۸؍دسمبر ۲۰۱۲ء سے اس زبان کا انٹرنیشنل ڈے (Internaitional Day) بھی ہر سال منایا جانے لگا۔

عربی زبان وادب اور ندوۃ العلماء

ہندوستان کا مقام علوم وفنون کی تاریخ میں

اسلامی ہند کی علمی تاریخ علوم وفنون، زبان وادب اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہی ہے۔ تصنیف وتالیف، تعلیم وتربیت اور تہذیب وتمدن کے میدان میں اس کے فرزندوں کی جگر کاویاں آج بھی لائق صد رشک ہیں اور خاص طور پر قرآن کریم، حدیث شریف، فقہ، علم کلام، منطق، حساب، جغرافیہ، الجبرا، ریاضی، علم طب، علم ہیئت، تاریخ اور زبان وادب کے میدان میں ان کے زور قلم نے ایسے تابندہ نقوش چھوڑے جن کو اس ملک کی علمی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

ہندوستانی مسلمانوں کا عربی زبان سے ربط

مسلمانان ہند نے ملکی زبان کے ساتھ عربی زبان کو اپنایا اور اس کو ممکن حد تک علوم اسلامیہ کی تدوین وتشریح کا ذریعہ بنایا۔ چنانچہ یہاں ایسے علماء، ادباء، شعراء، انشاء پرداز اور شعلہ بیان مقررین پیدا ہوئے جنہوں نے مادر وطن اور اہل کیتی کے سامنے اپنی عقلی کاوشوں اور فکری شہ پاروں کا حسین مرقع ملکی زبان میں نہیں بلکہ عربی زبان میں پیش کیا۔

علمی زندگی کا یہ قافلہ انیسویں صدی کی انتہا سے بیسویں صدی کی ابتدا تک اسی راستہ پر گامزن رہا اور اس وقفے میں بھی غیور علماء کی مسیحائی کے طفیل شبستان زبان وادب خزاں نا آشنا رہا، ان کی کوششوں نے شبستان زبان وادب کی صرف آبیاری ہی نہیں کی، بلکہ ایک تیشہ کا کام دیا جس نے اس غلط طرز فکر پر ضرب کاری لگائی کہ یہ محض قرآن وسنت کی زبان ہے۔ اشہب حیات کی جولانیوں اور طلاطم ہائے افکار کی تیز وتند موجوں سے وہ پنجہ

آزمائی نہیں کرسکتی۔انہوں نے یہ ثابت کیا کہ جس طرح یہ زبان قرآن وسنت کی شاہ کلید ہے،اسی طرح سفینۂ شریعت وقانون، ریاست ومعاشرت اور تہذیب وثقافت کا ناخدا بھی۔

ادبی بیداری کے آثار اور ندوۃ العلماء کی بنیاد

دینی ادبی بیداری کی کرنیں پردۂ ظلمت کو اس وقت اور چاک کرنے لگیں جب ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں چند جگر سوختہ، غیور، قدسی نفوس علماء نے حالات کی نزاکت اور مسلمانوں کی دینی، معاشی، سیاسی اور معاشرتی انحطاط کا کا خاطر خواہ جائزہ لیا اور درپیش خطرات اور نبرد آزما حالات کا مردانہ دار مقابلہ کرنے اور مسلمانوں میں (خاص کر تعلیم وتربیت کے میدان میں) خود کفیل کرنے کے لئے "ندوۃ العلماء" کے نام سے ایک اسلامی انجمن کی تاسیس کی تجویز رکھی، اور ۱۳۱۱ھ ۱۸۹۳ء میں عملاً یہ انجمن قائم کردی گئی اور اس کے ۲ رسال بعد یونیورسٹی پیمانے پر ایک نمونہ کے مدرسہ کی تاسیس عمل میں آئی، اس کا مقصد یہ تھا کہ رائج نظام تعلیم کے مقابلہ میں مجوزہ تعلیمی قراردادوں کو عملی جامہ پہنایا جائے۔اس میں ایک تجویز یہ تھی کہ عربی زبان کو، اس کی کبریائی وگہرائی او وسعت مضامین کے پیش نظر مسلمانوں کو سرکاری زبان کے دوش بدوش لاکھڑا کرنے کے لئے اس کی ترویج واشاعت پر بھرپور زور دیا جائے۔

ندوۃ العلماء کا عربی سے تعلق

عربی سے ندوۃ العلماء کے ربط کے متعلق حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ یوں رقم طراز ہیں:

> "دارالعلوم ندوۃ العلماء نے خاص طور پر قرآن کریم کی تعلیم کی طرف توجہ کی، جو ہر نسل ودور کی کتاب ہے اور عربی زبان کو اپنے نصاب تعلیم میں اہمیت دی جو فہم کتاب کے سلسلہ میں شاہ کلید اور اس کے خزانے کی امین ہے اور پتھروں اور دفینوں کی زبان (جس پر قدیم ہندوستانی تہذیب شاہد ہے) کے بجائے زندہ وترقی یافتہ اور انشاء پردازی وخطابت کی زبان کی حیثیت سے عربی زبان کی تعلیم کی طرف توجہ کی۔"

ندوۃ العلماء کا انقلابی اقدام

ذمہ داران ندوۃ العلماء نے سب سے پہلے یہ جرأت مندانہ اقدام کیا کہ دینی تعلیم کا ایک جدید نصاب تعلیم اور لائحہ عمل تیار کیا جس میں عربی زبان کو علمی مضامین کے درس وتدریس میں اساسی جگہ دی گئی اور مقامات حریری، متنبّی اور نفحۃ الیمن کے تنگ حصار سے نکال کر ادب وزبان کے میدان کو وسیع کیا گیا اور مسجع ومقفی عبارت کے بجائے شستہ وآسان اور رواں تحریر کی طرح ڈالی گئی۔

ہندوستان میں ادب عربی کا پہلا رجحان

چونکہ اس ملک میں ادب عربی کا یہ پہلا اور انوکھا انقلابی قدم تھا، اس لئے ادبی اور علمی حقوق میں اس کی دھوم مچی ہوئی تھی، جس نے مراکز اسلامیہ کے ذمہ داران تعلیم وتربیت کو اس موضوع پر سوچنے اور ندوۃ العلماء کے اس نئے تجربہ سے فائدہ اٹھانے پر مجبور کیا۔

ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور اس کے فرزندوں نے بعض حلقوں کی مخالفت کے باوجود عزم محکم کے ساتھ علم وثقافت کے تمام میدانوں میں عربی ادب کو عام کرنے کی کوشش کی، چنانچہ ندوۃ العلماء کے ناظم علامہ سید عبدالحی حسنی (متوفی ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۳ھ) نے ہندوستان کی تہذیب وثقافت، علمی مراکز، تاریخی مقامات، اور یہاں کے علماء کے حالات پر عربی زبان میں مبسوط کتابیں لکھیں جو عربی زبان وادب کے ارتقاء کے میدان کا پہلا علمی اقدام تھا اور اس طرح انہوں نے اس چمنستان نخیل کی آبیاری کی، جس کا ندوۃ العلماء کے بانیوں نے کبھی خواب دیکھا تھا اور اس کے ذریعہ وہ اس عظیم ذمہ داری سے سبکدوش ہوئے جو ندوۃ العلماء کے اعلیٰ ذمہ دار کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی تھی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نزہۃ الخواطر کی آٹھویں جلد کے مقدمہ میں اس عملی اقدام کو سراہتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''یہ ان کی بلند حوصلگی، بالغ نظری اور ذہن ثاقب کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اس کتاب کی تالیف کے لئے عربی زبان کا انتخاب کیا، جبکہ ہندوستان میں عربی زبان ان کے زمانے میں ناقص نصاب تعلیم اور طویل المیعاد مسجع انشاپردازی کے رواج سے جمود و تعطل کا شکار ہوگئی تھی''۔

اب زبان وادب کے میدان میں ندوۃ العلماء کی شہرت ملک کے گوشے گوشے میں پھیل چکی تھی، لیکن تنہا یہ بات اس انقلابی مہم کو عملی جامہ پہنانے اور اہل علم کے مختلف طبقوں کو باور کرانے کے لئے کافی نہ تھی کہ عربی زبان آج بھی لوگوں کی ضروریات زندگی کے تغیرات، قلبی احساسات اور افکار و تخیلات کی ترجمانی کرسکتی ہے۔

ندوۃ العلماء میں عربی ادباء کی آمد

علامہ سید عبدالحی حسنی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی وفات کے بعد ذمہ داران ندوۃ العلماء اور خاص کر علامہ سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر عبدالعلی حسنی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی کہ عربی زبان وادب کے میدان کو درس وتدریس کے علاوہ خطابت وانشاء پردازی اور صحافت کے ذریعہ وسیع کیا جائے۔ اس کے لئے شیخ خلیل عرب، ڈاکٹر محمد تقی الدین الہلالی، شیخ محمد حسن خزرجی یمانی، شیخ محمد طیب مکی، شیخ محمد عرب ہلالی جیسے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں جن میں سے ہر شخص اپنی جگہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھا، اس زمانہ میں ان عرب ادباء کی آمد علمی وادبی تاریخ میں ایک عظیم واقعہ تھا جو ہندوستان میں نئے ادبی رجحانات کے لئے سنگ میل ثابت ہوا۔

ان عرب اساتذہ نے ذمہ داران ندوۃ العلماء کی مدد سے ماہر طالب علموں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جو شگفتہ بیانی، وضاحت، حسن ارتقاء، صحت تعبیر اور جودت تحریر میں کسی عرب سے کسی طرح کم نہ تھے، بلکہ بعض نے عربوں سے بھی خراج تحسین وصول کیا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا عبدالرحمٰن کاشغری ندوی اسی شبستان ادب کے نونہال ہیں۔

''الضیاء'' میگزین کا اجراء

تاسیس کے صرف چالیس ہی سال کے بعد ندوۃ العلماء نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا، اور مولانا مسعود عالم ندوی کی ادارت میں ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۲ء میں ''الضیاء'' عربی ماہنامہ میگزین آب وتاب کے ساتھ منظر عام پر آیا جو دینی اور روحانی قدروں کا علمبردار، تنوع علمی وادبی مضامین کا بیش بہا ذخیرہ، خوابیدہ روحوں کے لئے صدائے جرس اور فکر وعمل کے لئے ایک ولولہ انگیز محرک، بے تکلفی وسادگی کا حسین پیکر اور رعنائی ودل کشی کا اچھوتا مرقع تھا، ڈاکٹر تقی الدین ہلالی، مولانا سید سلیمان ندوی نگراں اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور مولانا محمد ناظم ندوی شریک کار رہے۔

''الضیاء'' کے اجراء کے اسباب

علامہ سید سلیمان ندوی ''الضیاء'' میگزین کے اجراء کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

> ''جو چیز ہمیں لبھورلاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا ملک ہندوستان جس کی آبادی تقریباً ۸ کروڑ ہے (یہ اُس وقت کے اعداد وشمار کے اعتبار سے) جس میں کتاب اللہ کی زبان سمجھنے والے تقریباً بیس لاکھ ہیں اور چھوٹے بڑے مدارس کی تعداد بھی ایک ہزار سے کم نہیں جن کے طلباء کی تعداد ایک لاکھ یا اس سے کچھ زائد ہے، لیکن اس کی بڑی تعداد عربی زبان میں گفتگو کرنے اور کوئی وقیع مضمون لکھنے سے عاجز ہے، فی البدیہہ تقریر تو دور کی بات ہے ان کی عربی دانی کے مظاہرے کا میدان صرف فقہ اور منطق کی غیر ضروری بحثیں ہیں جو سود مند تو درکنار، درخود اعتناء بھی نہیں اور یہ حزن ویاس دو آتشہ اس وقت ہوجاتا ہے جب ہماری نظریں فرسودہ نصاب پر پڑتی ہیں جس میں کلاسیکی طرز کی چند کتابیں ہیں۔
>
> اس علمی انحطاط سے پنجہ آزمائی کرنے اور اس خلا کو پر کرنے کی

جس نے پہلی کوشش کی وہ ندوۃ العلماء ہے۔ اس نے قدیم وجدید عربی زبان کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ کی اور ابوقتیبہ دینوری، عبدالقاہر جرجانی، قدامہ ابن جعفر البغدادی، ابو ہلال عسکری، حافظ بصری جیسے ممتاز ادباء کی تصانیف اور متقدمین شعراء کے دواوین کو اپنے نصاب میں داخل کیا۔

پھر مبتدی طالب علموں کے لئے بعض ابتدائی کتابیں اور عربی میں دخیل کلمات کی تشریحات پر مشتمل ایک نئی ڈکشنری مرتب کی گئی اور جدید عربی زبان کی تعلیم کے لئے عرب اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس لئے شروع میں اس شعبہ کی صدارت علامہ شیخ محمد طیب مکی کے سپرد کی گئی۔ اس کے بعد شیخ محمد بن حسین خزرجی یمانی، اور اخیر میں اس خلا کو میرے دوست علامہ شیخ محمد تقی الدین ہلالی پر کر رہے ہیں۔

ندوۃ العلماء کے یہ مساعی بار آور ہوئے اور مدارس اسلامیہ نے ممکن حد تک اس کو اپنانے کی کوشش کی، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ عربی زبان کے خزاں رسیدہ چمن کا دور بہار اس وقت آیا جب ہمارے رفیق درس وسبق کے ساتھی اور علوم شرقیہ وغربیہ کے جامع مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی کے ذمہ اتر پردیش کے ناظم امتحانات اور مدارس اسلامیہ کے انسپکشن کی ذمہ داری سونپی گئی۔ انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نظام تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے بہت کچھ تبدیلیاں کیں، ادب عربی کو اس کا مناسب مقام دیا اور طلباء مدارس عربیہ پر عربی انشاء پردازی اور مقالات نگاری کو ضروری قرار دیا۔

سرکاری یونیورسٹیوں نے بھی اپنے عربی سیکشن میں انگلینڈ وجرمنی سے سند یافتہ فضلاء وماہرین زبان کی مدد سے قدیم نصاب تعلیم میں تبدیلیاں کرائیں، الہ آباد، لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ اور بورڈ سے ملحق مدارس، اورنیشنل کالج لاہور، مدرسہ شمس الہدیٰ اور مدرسہ عالیہ کلکتہ نے بھی اس کو

اپنایا،لیکن ڈھاکہ اور لاہور کی یونیورسٹیوں نے اس سلسلہ میں قائدانہ رول ادا کیا۔

ڈھاکہ یونیورسٹی نے بعض علوم جدیدہ اور انگریزی زبان کے ساتھ عربی کی تعلیم کے لئے ایک نیانصاب تیار کیا جس کے ذریعہ اس نے عربی زبان کے طلباء کو خالص انگریزی یونیورسٹی سے فارغ ہونے والے طلباء کے دوش بدوش کھڑا کردیا،مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بھی ڈھاکہ یونیورسٹی کی پیروی کی اور عربی کا ایک الگ شعبہ کھولا، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد تمام یونیورسٹیوں سے زیادہ عربی سیکشن پر خرچ کرتی ہے اور فارغ ہونے والے طلباء کے ساتھ خصوصی عزت واکرام کا برتاؤ کرتی اور ملازمت میں بھی اعلی مقام پر فائز کرتی ہے۔

لیکن شاید ہندوستان کی فضا عربی زبان کے لئے سازگار نہیں،علوم وادب کی بھرماراور اردوانگریزی میگزین کی کثرت طلباء کو اتنا موقع ہی نہیں دیتی کہ وہ عربی کے لئے کوئی وقت فارغ کرسکیں،مہینوں عربی میگزین واخبار پڑھنے کی نوبت نہیں آتی اور لکھنے کی نوبت کا تو ذکر ہی کیا۔

یہی اسباب تھے جس نے گراں دوستی پر مجبور کیا جب کہ اس راہ کے فرزانوں کی داستانیں سامنے تھیں۔ ہمارے ایک بزرگ نے ہمت کی اور ''الریاض'' نکالا،لیکن اس کے نودمیدہ غنچے شعلۂ فقر کا شکار ہوگئے۔ ''البیان'' نے بال وپر نکالے لیکن آہ! اسے بھی شہیر زمانہ کا نخچیر بننا پڑا۔ پھر بڑی آب وتاب کے ساتھ ''الجامعہ'' نکالا لیکن وہ بھی زمانہ کے دستبرد کا شکار ہوگیا۔ اس کے علاوہ اور بھی عربی میگزین منظر عام پر آئے جو آرزو وانتظار کی کشمکش میں ناپید ہوگئے، مجھے بھی اس ناکامی کا احساس ہے لیکن کارساز کائنات کے دامن سے وابستگی، دوستوں کی معاونت اور اس ملک کے عربی داں طبقہ کی ہمت افزائی ڈھارس بندھاتی ہے کہ

موجزن سمندر میں کود پڑوں جب کہ ؎

دریں ورطہ کشتی فروشد ہزار
کہ پیدا نہ شد تختۂ برکنار

جولوگ دامے، درمے، قدمے، سخنے میری معاونت فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجر عطا فرمائے گا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ مخلصین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ (التوبہ:۱۲۰)

ان اللہ لایضیع اجر المحسنین"

علامہ سید سلیمان ندویؒ کے اداریہ کے بنیادی نکات

علامہ سید سلیمان ندوی کے اداریہ کا یہ طویل اقتباس اس انقلابی اقدام پر روشنی ڈالتا ہے جس کی تکمیل کا انہوں نے اپنے ہم سفروں اور ہم نواؤں کے ساتھ بیڑا اٹھایا تھا، اس کے نکات نذر قارئین ہیں:۔

۱- اس ملک میں عربی زبان وادب کی تعلیم وترویج میں ندوۃ العلماء کا قائدانہ کردار۔

۲- کل ہند پیمانے پر مدارس اسلامیہ اور تعلیمی مراکز میں ندوۃ العلماء کی اس سلسلہ کی کوششوں کی پذیرائی۔

۳- مناسب تبدیلیوں کے ذریعہ قدیم اور فرسودہ نصاب تعلیم کی تجویز۔

۴- راہ کی مشکلات اور وسائل کی کمیابی کے باوجود میدان صحافت میں ایک عظیم انقلاب۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور ندوۃ العلماء

دارالعلوم ندوۃ العلماء اپنے جدید انقلابی پروگرام کے مطابق منزل بہ منزل آگے بڑھتا رہا، اخیر میں ندوۃ العلماء کو حضرت العلامہ سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی ذاتِ گرامی میسر آگئی جن کی کوششوں سے ندوۃ العلماء نے ہر میدان حیات میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

موصوف نے ندوۃ العلماء کے ناظم اور خادم ہونے کی حیثیت سے اس انقلابی اقدام کی تجدید کی جس کی تکمیل کا بانیان ندوۃ العلماء نے بیڑا اٹھایا تھا اور آپ کی مخلصانہ

کوششوں سے علمی، ادبی اور دعوتی میدان میں قابل تعجب حد تک کامیابی حاصل ہوئی، اللہ تعالی نے آپ کو عربی زبان اور ادب عربی کی تعلیم کے سلسلے میں جدید اور پر مغز قابل انتفاع نصاب بنانے کی سعادت عطا فرمائی اور یہ پہلا موقع تھا جب ندوۃ العلماء اس سلسلہ میں خود کفیل ہو رہا تھا، آپ نے عربی زبان وادب میں ایک نئے طرز اسلوب کی طرح ڈالی جس نے ہند و بیرون ہند میں اہل قلم کے ہاتھوں پذیرائی حاصل کی۔ جس اسلوب کو ہم بجا طور پر ''دعوتی اسلوب'' اور ادب کو ادب الدعاۃ'' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

آپ نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ گرانقدر علمی اور فکری کتابوں کی تصنیف کی طرف توجہ کی، تحریر میں پھولوں کی شگفتگی، موجوں کی روانی، اور زبان واسلوب کا بانکپن ملحوظ رکھا جس کی اہمیت کے پیش نظر عرب علماء نے پانچویں اور ساتویں دہائیوں کے درمیان نکلنے والے علمی اور ادبی شہ پاروں کے درمیان موصوف کی تصانیف کو اول جگہ دی۔

اس کے بعد موصوف نے عربی صحافت کے میدان میں ایک انقلابی اقدام کیا اور فرزندان ندوۃ العلماء کو ایک خالص عربی میگزین کے اجراء کی دعوت دی۔ چنانچہ یہ خواب اس طرح شرمندۂ تعبیر ہوا کہ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں البعث الاسلامی'' (ماہنامہ عربی میگزین) اور اس کے چار سال کے بعد ۱۹۵۹ء میں ''الرائد'' (پندرہ روزہ عربی جریدہ) کا اجراء عمل میں آیا، اس طرح ندوۃ العلماء نے صحافت کے میدان میں کامیابی حاصل کی اور دنیا کے گوشے گوشے سے مبارکباد کے پیغامات آئے جس طرح ''الضیاء'' نے کبھی عالم اسلام سے خراج تحسین وصول کیا تھا۔

ماہر ادباء اور قابل ذکر شخصیات

موجودہ دور ادبی اعتبار سے ندوۃ العلماء کا ''گلابی دور'' ہے، اس میں ماہر ادباء کی ایک کثیر تعداد نکلی جن میں قابل ذکر شخصیتیں یہ ہیں۔

ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی (سابق استاذ ادب عربی جامعہ عبدالملک جدہ) مولانا محمد رابع حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء) مولانا محمد الحسنیؒ (ایڈیٹر البعث اسلامی)

مولانا واضح رشید ندوی (چیف ایڈیٹر پندرہ روزہ ''الرائد'') ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی (صدر شعبہ عربی حیدرآباد یونیورسٹی) جناب مولانا محمد رضوان ندوی (استاذ زبان عربی بن غازی یونیورسٹی لیبیا) جناب مولانا محمود الحسن ندوی (سابق صدر عربی سیکشن دہلی ریڈیو اسٹیشن) جناب مولانا محمد راشد ندوی (سابق صدر شعبۂ عربی مسلم یونیوسٹی علی گڑھ) ڈاکٹر احتشام احمد ندوی (سابق صدر شعبہ کالی کٹ یونیورسٹی) سید محمد لقمان ندوی (استاذ کلیۃ حائل سعودیہ عربیہ) ڈاکٹر محمد اسماعیل (استاذ عربی ادب لیبیا) جناب مولانا ضیاء الحسن ندوی (استاذ وصدر ادب عربی جامعہ ملیہ دہلی) جناب محمد لقمان خاں ندوی (استاذ عربی ادب لیبیا) جناب محمد یونس نگرامی ندوی (استاد عربی ادب لکھنؤ یونیورسٹی)۔

ندوۃ العلماء کی کوششوں کے سبب ادب عربی کا میدان اب وسیع ہوتا جارہا ہے۔ مقام مسرت ہے کہ آج سے پچاس سال پہلے ندوۃ العلماء نے جس بات کی صدا لگائی تھی اب وہ آواز بیگانی نہ رہی اور اب ندوۃ العلماء بجا طور پر یہ کہہ سکتا ہے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
''ہم نوا'' آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ندوۃ العلماء اور عالم عربی

ندوہ کی تاسیس جس فکری بنیاد پر ہوئی، اس کا تقاضہ تھا کہ اہل فکر کے ہر طبقہ میں اسے مقبولیت اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے، یہی وجہ تھی کہ اس دینی، تعلیمی اور تربیتی تحریک نے اپنے عہد اول میں ہندوستان کے بلند نظر اور اصحاب فکر و بصیرت علماء سے خراج تحسین حاصل کرلیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے قیام ندوہ کو مسلمانوں کے لئے ایک نیک فال قرار دیا تھا۔ اسی طرح ذی شعور طبقہ کی طرف سے بانیان ندوۃ العلماء کو مبارک باد دی گئی اور ہندوستان کی علمی اور دعوتی تاریخ میں اسے ایک سنگ میل کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا تھا۔

اس لئے جلد ہی اس جرأت مندانہ اقدام کی گونج سارے ملک میں سنائی دینے

لگی اور ندوہ کے پے در پے اجلاسوں نے اس کا تعارف کرانے میں اور بڑی تعداد میں ندوی فضلاء کے ذریعہ ملک کے گوشے گوشے میں تحریک ندوۃ العلماء متعارف ہوگئی۔

ندوہ نے اپنے نمونہ کے دارالعلوم کے لئے جو نصاب تعلیم وضع کیا، اس کی اساس کتاب وسنت اور فقہ اسلامی پر رکھی گئی اور ساتھ ہی عصری علوم کی ایک معتد بہ مقدار بھی اس میں شامل کی گئی، اس کا مقصد یہ تھا کہ اس نصاب تعلیم کو پڑھ کر ایسے راسخ العقیدہ علمائے دین تیار ہوں جو اسلام کی صحیح اور پختہ فہم وبصیرت رکھنے کے ساتھ زمانے کے تقاضوں جدید مسائل اور نئے فلسفوں اور افکار ونظریات سے اتنی واقفیت رکھیں کہ بلاخوف وخطر اسلامی نظام کی بالادستی تسلیم کراس کیں اور اجنبی ماحول میں اس کی صحیح تشریح کراس کیں۔

ندوۃ العلماء اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب رہا، اور تھوڑی سی مدت میں اس کی شہرت اندرون ملک سے نکل کر عالم اسلام کے تمام علمی اور دینی مراکز میں پہونچ گئی، چونکہ ندوہ نے (اصل) زبان عربی قرار دی تھی، اس لئے عربی کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے پڑھنے پڑھانے کا ذوق وشوق اس کی امتیازی خصوصیت ہے جو ہر دور میں پائی گئی۔ عربی زبان وادب پر خاص طور سے توجہ دینے کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ یہاں کا ہر طالب علم اسلامی علوم کو اس کے اصل سرچشمہ کتاب وسنت سے براہ راست حاصل کر سکے۔ اور عربی زبان پر اتنی قدرت حاصل کرلے جس سے وہ قرآن وحدیث کو اچھی طرح سمجھ سکے۔

عالم اسلام بالخصوص عالم عربی میں ندوہ کی شہرت کا بڑا سبب یہی تھا کہ ندوہ کی (اصل) زبان عربی تھی، اسی بنا پر عالم عربی سے براہ راست تعلق پیدا ہوا، عربی اخبارات ورسائل یہاں آنا شروع ہوئے، عرب علماء سے خط وکتابت شروع کی گئی اور ندوہ کی تحریک سے ان کو باخبر کیا گیا، علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ سید عبدالحی حسنی رحمہ اللہ اور علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مہم میں بڑا حصہ لیا، انہی بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ علامہ شید رضا، عبدالعزیز الثعالبی، مفتی امین الحسینی اور جامع ازہر کے علمی وثقافتی وفد نے ندوہ کی زیارت کا شوق ظاہر کیا اور انہیں اس کا موقع حاصل ہوا۔

عالم عربی سے ندوہ کا تعلق ایک طبعی چیز تھی۔ (جو ہر وقت اور ہر زمانہ میں پائی گئی)، علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی اور دینی شہرت نے ندوہ کا تعارف عرب دنیا کے بہت سے علمی حلقوں میں کرایا، عرب اساتذہ نے دارالعلوم میں تدریس کی خدمت انجام دی، جس کی وجہ سے ندوہ کا مزید تعارف عالم عربی میں ہوا۔ اور اس کی ایک صحیح اور پاکیزہ تصویر ان کے ذہنوں میں آگئی، متعدد طلباء یہاں سے نکل کر جامع ازہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے گئے، ان کی وجہ سے بھی ندوہ کا تعارف بڑھا اور اس کی ہمہ گیر فکر سے عرب علماء کو واقفیت کا موقع ملا۔

عہد آخر میں جب ندوہ کی زمام کار حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں میں آئی تو ندوہ کا تعارف عالم عربی میں زیادہ وسیع پیمانہ پر ہوا اور عرب علماء نے ندوہ کو زیادہ قریب سے دیکھا اور اس کے تخیل کو پسند کیا، ۱۹۵۰ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (رحمہ اللہ) نے مصر کا دورہ کیا اور کچھ دنوں وہاں قیام فرمایا، تو ندوہ کی شہرت بام عروج پر پہنچ گئی، اور اس کا بہترین تصور وہاں کے علماء کے ذہنوں میں قائم ہوا، یہاں تک کہ اس زمانے کے شیخ الازہر نے اس تخیل پر بڑی حیرت واستعجاب کا اظہار کیا، وہ اس بات کے سمجھنے سے قاصر تھے کہ ہندی علماء کے ذہنوں کی پرواز اتنی بلند ہوسکتی ہے؟

مصر کے دوران قیام میں حضرت مولانا کے مختلف موضوعات پر بہت سے لکچرز اور تقریریں ہوئیں اور مشہور علماء وادباء کے ساتھ عوام سے بھی ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع ملا، یہ وقفہ ندوۃ العلماء کی تاریخ میں سب سے اہم اور قیمتی ہے، یہ وہی تاریخی دور ہے جس میں ندوۃ العلماء حضرت مولانا کی شخصیت میں جلوہ گر تھا جس نے بھی حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی اس نے ندوۃ العلماء کا جامع تخیل اور اس کی چلتی پھرتی تصویر ان کی ذات میں جلوہ گر پایا، یہ تاریخ ندوۃ العلماء کا وہ اہم باب ہے جس کو ہندوستان کی اس عظیم الشان علمی دینی تحریک کا مؤرخ کبھی فراموش نہیں کرسکے گا۔

اب ندوی اور ندوہ عرب دنیا میں نہ صرف ایک معروف چیز کا نام تھا، بلکہ عرب دنیا کا اس سے ایک بڑا تعلق بھی پیدا ہو چکا تھا۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی عربی

تصنیفات نے اور خصوصاً ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' نے وہ کام انجام دیا، جو بہت سے ثقافتی وفود بھی انجام نہیں دے سکتے تھے۔

ایک عرب ملک کے ذمہ دار وزیر نے تو یہاں تک کہا کہ ہم نے تو ہندوستان کو مولانا ندوی اور ندوۃ العلماء کی وجہ سے پہچانا۔

لیکن حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں یہ تمنائے بے تاب رہ رہ کر ابھرتی تھی اور دل بے چین کو اور زیادہ بے چین کر دیتی تھی، حضرت مولاناؒ کی نظر ندوۃ العلماء کے اعلیٰ مقاصد پر مرکوز تھی، اور اس کے باوجود کہ ماضی میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس مختلف شہروں اور مرکزی مقامات پر ہوا کرتے تھے، اور اس میں ندوۃ العلماء کے دینی، دعوتی، تعلیمی، فکری رہنمائی کے بارے میں مختلف لوگوں کی طرف سے اظہار خیال بھی ہوتا تھا، اس وقت تک ندوہ اپنے مقاصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکا تھا، اور وہ محض ایک تعلیم گاہ کے دائرہ میں محدود ہوکر رہ گیا تھا، حضرت مولانا چاہتے تھے کہ ندوۃ العلماء، نہ صرف ہندو پاک کے دائرہ میں کسی حد تک متعارف ہوکر رہ جائے، اور نہ اس کا کوئی محدود حلقہ ندوۃ العلماء کے اراکین اور اس کی محبین کی حد تک قائم رہے! اس بے چینی نے حضرت مولانا کو اس بات پر آمادہ کیا کہ ندوۃ العلماء کے پیغام کا تعارف کرانے اور اس کی اہمیت وضرورت کو تسلیم کرانے کے لئے وسیع پیمانہ پر عالمی حیثیت سے ایک اجلاس بلایا جائے، انہوں نے اس مہم کو ایک تحریک کی حیثیت دینا ضروری سمجھا، اور اس کو اپنے علمی اور دعوتی زندگی کا ایک اہم موضوع قرار دیا، چنانچہ مجلس انتظامیہ کا جلسہ بلانے کا فیصلہ کرنے کے بعد اراکین انتظامیہ کو ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء کو تشریف لانے کی دعوت دی، اس جلسے میں پچاسی سالہ جشن تعلیمی کا انعقاد ماہ اکتوبر ونومبر میں کرنے کا فیصلہ ہوا، اور اس کے انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے دارالعلوم کی عمارت میں ایک دفتر قائم کیا گیا، اور یہ ذمہ داری جناب مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سپرد کی گئی۔

بہر حال یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ تنہا حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی

شخصیت ان کی تصنیفات ان کی دعوتی اور علمی سرگرمیوں، ان کے دعوتی دوروں، عالم عربی کے اسفار نیز ان کی روشن ضمیری نے عالم عربی میں ندوۃ العلماء کا تعارف جس وسعت اور ہمہ گیری کے ساتھ کرایا اس کی مثال اس وضاحت کے ساتھ کہیں اور نہیں مل سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ ندوۃ العلماء کو عرب ممالک میں ایک ایسا علمی اور دینی مرکز تصور کیا جاتا ہے جہاں سے بالغ نظر، روشن ضمیر اور پختہ کار علماء اور داعی پیدا ہوتے ہیں۔ جو اس ملک میں عربی زبان وادب کا ایک حسین چمنستان ہے۔

وہ علمی اور دینی اور ثقافتی کام جو عربی زبان میں یہاں انجام پا رہے ہیں وہ ندوہ کے اس علمی مقام کو متعین کرتے ہیں۔ مولانا کی عربی تصنیفات کے ساتھ ان کا بھی اثر بہت گہرا ہے۔ پہلے ''الضیاء'' نامی عربی کا جو ماہ نامہ نکلتا تھا اس کی وجہ سے بھی ندوہ کا علمی وادبی وقار قائم ہوا اور عرب ادباء نے ندوی قلم کو سراہا لیکن الضیاء زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا اور جب تک جاری رہا وہ ہاتھ کی کتابت میں لیتھو پر چھپتا رہا، جو عربوں کے لئے زیادہ مانوس نہیں ہے۔ تاہم اس نے ندوۃ العلماء کا عالم عربی میں صحیح تعارف کرانے میں بڑی مدد دی۔ اور اس نے وہاں کے اہل علم واہل فکر کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء کے سابق ناظم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے تعاون وتائید سے جب ۱۹۵۵ء میں موجودہ عربی ماہنامہ ''البعث الاسلامی'' نکلا تو عرب ممالک کے تمام نئے اور پرانے حلقوں میں وہ ندوۃ العلماء کے تعارف کا سبب بنا اور مقصدیت کی جو روح اس میں کارفرما تھی اس نے اس کے معاونین وناظرین کا ایک بڑا حلقہ عرب دنیا میں پیدا کر دیا، جہاں سب سے پہلے ندوۃ العلماء کا تعارف ہوا۔ مولانا ندوی کی سرپرستی میں اس کا نکلنا مزید اس کی مقبولیت اور ندوہ سے عقیدت کا باعث ہوا۔ اب ندوۃ العلماء عرب دنیا میں اپنی صحیح تصویر پیش کر چکا تھا۔ ''البعث الاسلامی'' اس کا وہ ترجمان تھا جو اپنی پیشانی پر ندوۃ العلماء کا شعار لگا کر رہا اور بحمد اللہ آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

اس کے کچھ ہی دنوں بعد ایک پندرہ روزہ عربی اخبار ''الرائد'' کے نام سے طلبہ کی عربی انجمن النادی العربی کی طرف سے اس کے صدر ادیب اول حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتھم کی زیرنگرانی نکلا اور عرب دنیا میں اس کا زبردست استقبال ہوا۔ وہاں سے لوگوں نے اپنی پسندیدگی کے بے شمار خطوط لکھے اور اس اقدام پر ندوہ کے طلبہ کو مبارک باد دی۔

یہی وہ اسباب تھے جنہوں نے عالم عربی میں ندوۃ العلماء کی صحیح تصویر پیش کی اور وہاں کے عرب علماء نے ندوۃ العلماء کو ہندوستان میں علوم اسلامیہ اور عربی زبان کا زبردست قلعہ تصور کیا۔

حسن اتفاق سے مجھے جب بھی کسی عرب ملک اور بالخصوص خلیج عرب کی ریاستوں میں جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے ندوہ کا باقاعدہ تعارف کرانے کی ضرورت نہیں پیش آئی اسلئے کہ علمی حلقے ندوہ کو حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت اور ان کی فکر انگیز تصنیفات کی وجہ سے پہلے ہی سے جانتے ہیں، پھر البعث الاسلامی اور الرائد نے مسلسل پیام رسانی اور تعارف کی جو ذمہ داری لے لی ہے اس سے ندوۃ العلماء کا تصور دنیائے عرب کے ہر گوشہ میں موجود ہے۔

قواعد نحو وصرف اور ان کا طریقۂ تدریس

ہمارے اسلامی مدارس کے نصاب تعلیم میں نحو وصرف کو بہت اہمیت دی گئی ہے، اس لئے کہ نحو وصرف کے قواعد اور انکی عملی مشق سے عربی زبان کے لکھنے، بولنے اور سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اور وہ عبارت کو اعراب کی غلطیوں اور اس کی کمزوریوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مدارس اسلامیہ میں نحو وصرف کی متعدد کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، تاکہ نحو وصرف کے مسائل اور اس کی باریکیوں سے واقفیت حاصل ہو۔

درس نظامی کے نصاب میں صرف میں ''میزان الصرف'' اور ''صرف میر'' نحو میں ''نحو میر''، ''ہدایت النحو''، ''کافیۃ''، ''شرح جامی''، اور ''شرح ابن عقیل'' کم از کم اتنی کتابیں نحو وصرف کے موضوع پر پڑھائی جاتی ہیں، لیکن ان کو علمی حیثیت سے پڑھانے کا رواج ہے، فنی حیثیت سے اس کے مسائل کو یاد کرانا اور قواعد کی مشق کی طرف کوئی توجہ نہ کرنا ایک عام بات ہے۔ حالانکہ نحو وصرف کے قواعد کو یاد کرانے اور اس کی تطبیق کے لئے ادبی کتابوں یا قرآن کریم یا حدیث شریف کی منتخب آیتوں اور جملوں پر قواعد منطبق کرنا اور مثالوں سے ان کو واضح کرنا نہایت ضروری ہے۔ نحو وصرف کے قواعد کا اجراء اور تطبیق کرانے کے لئے تختہ سیاہ کا استعمال کرنا بھی بہت ہی مفید اور ضروری ہے، اس کا رواج عام طور سے ہمارے اسلامی مدارس میں نہیں ہے۔

ہمارے دار العلوم ندوۃ العلماء کے نصاب میں عالمیت اور اس کے اوپر کے درجات میں نحو وصرف کی قدیم کتابیں جیسے ابن ہشام کی ''شرح قطر الندی وبل الصدی'' اور ''شرح شذور الذہب'' اور ''الفیہ ابن مالک'' اور ''المفصل مؤلفہ زمخشری رکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں سے نحو وصرف کے مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے میں اسلئے بڑی آسانی ہوتی

ہے، کہ طالب علم شروع سے قواعد کی مشق اور ان کی تطبیق کا عملی نمونہ اختیار کر کے بڑی حد تک اعراب کی صحت کے ساتھ مفہوم کو سمجھنے پر قادر ہو جاتا ہے، مصر سے شائع شدہ صرف کے موضوع پر نہایت مفید اور مفصل کتاب ''شذا العرف فی فن الصرف'' داخل نصاب ہے، ان مذکورہ کتابوں سے نحو وصرف کے مسائل کو سمجھنے اور ان کی تطبیق کا بڑا فائدہ حاصل ہو جاتا ہے۔

نحو وصرف کی کتابوں کو دوسری عام کتابوں کی طرح سے پڑھا دینے سے اسکا فائدہ محدود رہ جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نحو وصرف کا مزاج تطبیقی ہے، اور اس کے مزاج کی رعایت کرتے ہوئے نحو وصرف کی تعلیم دینا ہر حال میں مفید ہے۔ اس لئے کہ یہ بات بھی تجربہ میں آچکی ہے کہ بہت ساری نحو وصرف کی کتابیں پڑھنے لینے کے بعد بھی عبارت خوانی میں خامی رہ جاتی ہے، اور اعراب کی صحت پوری طرح نہیں ہو پاتی، اور مسئلہ صرف عبارت کو صحیح اعراب کے ساتھ پڑھنے کا نہیں ہے، بلکہ بہت زیادہ ضروری الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کرنا ہے، حروف کے مخارج کی رعایت کرنا اور نطق صحیح کے ساتھ عبارت کو پڑھنا بھی نحو وصرف کے قواعد کا ایک بنیادی عمل ہے، مثلاً متحرک الاوسط لفظ کو ساکن الاوسط پڑھنا، اور اس کے برعکس۔ اسی طرح الفاظ کی حرکتوں کا لحاظ نہ رکھنا، اور اس کے مخارج کی رعایت کے بغیر، مثال کے طور پر حرف ''ض'' کو ''زا'' اور ذال کے مخرج سے ادا کرنا اور عربی زبان کو اردو یا کسی دیگر زبان کے انداز سے پڑھنا بھی کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

ہمارے مدارس عربیہ میں ان باتوں کا لحاظ بہت کم کیا جاتا ہے، اور عربی زبان کی فخامت کا لحاظ کئے بغیر انتہائی سرعت کے ساتھ جیسے تیسے عبارت پڑھ لینا عربی زبان کے مزاج سے کسی طرح یہ عمل میل نہیں کھاتا، بلکہ عربی زبان کے امتیازی وصف کو باقی رکھتے ہوئے اعراب کی صحت کا لحاظ کیے بغیر عبارت کا مفہوم واضح نہیں ہو پاتا، اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ '' کان'' کے اسم وخبر کے درمیان تمیز نہ کرنے کی وجہ سے مفہوم غلط ہو جاتا ہے۔ کلام عرب میں بلاغتی نقطہ نظر سے تقدیم وتاخیر، تعریف وتنکیر، اور فصل وصل،

جیسے امور کا لحاظ نہ رکھنے کی وجہ سے عبارت کا مفہوم بدل جاتا ہے، اور کبھی کبھی اس کی وجہ سے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اعراب کے ساتھ نطق (تلفظ) کی صحت اور عربی زبان کے لہجہ کو اختیار کرنا کسی بھی عربی داں کے لیے نہایت ضروری ہے، اس کے لئے مدارس کے اندر ہر ہفتہ عربی مجلسوں کا منعقد ہونا اور ان میں طلباء کو عربی زبان میں مافی الضمیر کی ادائیگی کا موقع ملنا انتہائی ضروری چیز ہے، ہمارے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں شروع سے النادی العربی کے جلسے ہر جمعرات کو ہر درجہ میں منعقد ہوتے ہیں، اس کے ذریعہ سے طلباء کو اعراب، نطق، اور لہجے کی مشق کا موقع ملتا ہے، اس لئے کہ ہر جلسہ میں ایک استاد بحیثیت مشرف شرکت کرتے ہیں، یہ طریقہ دیگر مدارس میں بھی شروع کیا گیا ہے، اور ایک اچھے سمت کی طرف توجہ دی گئی ہے۔

اس اہم مقصد کو پورا کرنے کے لئے ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جن کے ذریعہ عربی زبان سے لگاؤ پیدا ہو، اور نحو وصرف کے قواعد نہ صرف یہ کہ ذہن نشین ہوں، بلکہ ان کی پوری طرح تطبیق کی جائے، اور زبان وادب کی کتابوں میں اعراب کی صحت کے ساتھ نطق اور لہجے کا بھی پورا اہتمام کیا جائے۔

نحو کا تعلق زیادہ تر اسم سے ہے، اسلئے اسم کی بحثوں کو ترتیب دینے میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہر پہلی بحث دوسری بحث کے سمجھنے میں معاون ثابت ہو، اس سے طالب علم کے اندر شوق پیدا ہوتا ہے، اور وہ ہر طریقہ سے مسائل وقواعد کے سمجھنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ طالب عالم کی نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے پہلے آسان مسائل بیان کیے جائیں، پھر اس کے بعد مشکل مسائل کی طرف توجہ کی جائے، مثلاً مبتدا خبر کی بحث پہلے ہو اور فاعل مفعول بہ کی بحث اس کے بعد ہو، اسی طرح مبتدا خبر کی مشق کے بعد افعال ناقصہ اور حروف مشبہ بالفعل کی مشق کرانا چاہئے، اگر مبتدا وخبر اور نواسخ جملہ کے قواعد کے درمیان فعل مضارع منصوب اور فعل مضارع مجزوم وغیرہ کی بحثیں درج کردی جائیں، اسی طرح موصوف صفت کے اندر جن دس چیزوں میں مطابقت پائی جاتی ہے، ان کا بیان پہلے

ہو اور صفت و موصوف کا بیان اس کے بعد ہو تو یہ طریقہ زیادہ مفید ہے، اسلئے کہ عام قاعدہ کے اعتبار سے پہلے تذکیر و تانیث، واحد تثنیہ جمع، رفع نصب جر، اور معرفہ نکرہ کے بیان کے بعد صفت موصوف کے مسئلے کو سمجھنا انتہائی آسان ہو جاتا ہے، اسی طرح اعراب کی مشق کے لئے زیادہ سے زیادہ جملے تمرینات کے اندر دینا ضروری ہوتا ہے، عربی سے اردو بنانے کی مشقوں کے ساتھ اردو سے عربی بنانے کی مشقیں تمرینات کے ذریعہ طلباء کے استفادہ کے لئے نہایت ضروری ہیں۔

قواعد صرف ونحو فی نفسہٖ مقصود ہیں یا ان کی حیثیت ذریعہ اور واسطہ کی ہے؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے علمائے صرف ونحو فرماتے ہیں کہ ان قواعد کی حیثیت محض ذریعہ اور واسطہ کی ہے ان سے جملوں کی ساخت، تعبیر کی درستگی، اسالیب کلام کی صحت اور افہام وتفہیم میں مدد ملتی ہے، ان کی تعلیم فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے، کلام کی ادائیگی اور مافی الضمیر کی ترجمانی کے سلسلہ میں ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ تعلیم وتعلم کے اس گوشہ اور پہلو کے لحاظ سے نحو وصرف کے قواعد فن وادب کے دائرہ میں آجاتے ہیں۔

یہ قواعد اس وقت مستقل علم اور فی نفسہٖ مقصود ہو سکتے ہیں جب کوئی طالب علم ان کو ایک فلسفہ کی حیثیت سے حاصل کرے، ان کے اسرار ورموز پر قابو پالے اور کلام کے اندر مفرد مرکب کی ساری بحثوں پر حاوی ہو جاوے، اس وقت ان کے اندر استعمال کئے جانے والے استقراء، تعمیم، تجرید، استنباط اور موازنہ کے اصولوں کو دیکھتے ہوئے ہم نحو کو ایک مستقل علم کا درجہ دے سکتے ہیں اور اس کو فی نفسہٖ مقصود سمجھ سکتے ہیں۔

لیکن ہمارا مقصد تو صرف یہ ہوتا ہے کہ ہم نحو کو ایک ذریعہ اور واسطہ کی حیثیت سے پڑھیں اور پڑھائیں تاکہ ہم کو اس کے خاطر خواہ اور متوقع فوائد حاصل ہو سکیں، لہٰذا نحوی قواعد کو زبان سیکھنے کا مرحلہ اولین قرار دیا جائے گا، ابتدا نحوی قواعد کی تعلیم سے ہو گی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ زبان کے معانی، تعبیر اور ادب کی طرف بھی طلبہ کی توجہ مبذول کی جائے گی، تاکہ وہ قواعد کو سمجھیں، ان کی عملی مشق کریں۔ اپنے نئے الفاظ وتعبیرات پر ان کو

منطبق بھی کریں، اور لغوی مثالوں سے خود قواعد کا استنباط کریں۔

اسلوب وتعبیر کے حسن وقبح سے نحو وصرف کے قواعد کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جیسا کہ نحوی قواعد کے بہت سے پرجوش حامیوں کا خیال ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فن انشاء وتحریر کی تعلیم، اسالیب کلام کی تحسین اور تعبیر کے اندر بے ساختگی اور بلندی پیدا کرنے کی بنیاد انہیں نحوی قواعد پر ہے، حالانکہ ان کا تعلق صرف انسان کے ادبی ذوق، فنی سلیقہ اور ادبی صلاحیت وفطرت سے ہے، یہ بات قطعاً صحیح نہیں ہے کہ نحوی قواعد میں مہارت پیدا کئے بغیر کلام میں نکھار اور تعبیر واسلوب میں حسن وجمال پیدا نہیں ہوسکتا، اس حد تک تو سب کو تسلیم ہے کہ نحوی قواعد میں مہارت پیدا کرنے سے کلام کی صحت، تعبیر واسلوب کی درستگی اور مافی الضمیر کی صحیح ترجمانی میں مدد ملتی ہے، اور اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ فن انشاء وتحریر میں کمال پیدا کرنے کے سلسلہ میں نحوی قواعد کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن یہ کلیہ صحیح نہیں ہے کہ تعبیر واسلوب میں خوبی پیدا کرنے کا انحصار نحوی قواعد پر ہے، اور اگر نحو وصرف کے قواعد کے پرجوش حامیوں اور داعیوں کی بات صحیح ہوتی تو تعبیر کی صحت ودرستگی، اسلوب کے جمال وحسن اور کلام کی پختگی اور بلندی میں نحوی سب سے فائق ہوتے، یہ بات واضح طور سے معلوم ہے کہ عمدہ افکار، نادر خیالات اور نازک احساسات وشعور کے اختراع میں نحوی قواعد کا کوئی دخل نہیں ہے، نحوی قواعد کا کام صرف یہ ہے کہ افکار وخیالات کی ترتیب، تعبیر و اسلوب کی وضاحت اور اعرابی غلطیوں سے محفوظ رہنے میں ان سے مدد ملتی ہے۔

مندرجہ ذیل نقاط میں ہم صرف ونحو کے قواعد کا مختصر فائدہ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ ان قواعد کے ذریعہ زبان کے اندر درستگی وصفائی پیدا ہوتی ہے، اور اعرابی غلطیوں سے حفاظت ہوتی ہے بشرطیکہ ان قواعد کی روشنی میں کلمات، جملوں اور عبارتوں کے استعمال کی طرف توجہ کی جائے، اور رفع، نصب، جر اور جزم کے مواقع اور ضمہ، فتحہ، کسرہ اور سکون کی جگہوں سے واقفیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ صحیح اعراب کی مشق کی جائے اور اس کی عادت ڈالی جائے تاکہ معرب ومبنی میں مکمل تفریق کے ساتھ بولنے، لکھنے اور پڑھنے

میں ان قواعد کا اجراء اور انطباق ہو سکے۔

۲۔ امثلہ وشواہد، عمدہ اسالیب اور فصیح و بلیغ عبارتوں کے ذریعہ طالب علم کے لغوی ذخیرہ میں اضافہ ہوتا ہے، اور تعبیرات واسالیب کے تحلیل وتجزیہ الفاظ ومعانی کے درمیان تعلق ورشتہ کے اظہار، کلمات کی کیفیت اور کلام کے اندر ان کے مقام وحیثیت سے واقفیت کے ذریعہ وہ خطا وصواب اور صحیح وغلط کے درمیان تفریق کر سکتا ہے۔

۳۔ ان نحوی قواعد کے ذریعہ طالب علم کو غامض ودقیق ترکیبوں کے سمجھنے، غموض کے اسباب سے واقفیت حاصل کرنے اور پھر ان ترکیبوں کے تحلیل وتجزیہ میں مدد ملتی ہے، اس طرح وہ غموض، اشتباہ، اور عبارت واسلوب کی پیچیدگی سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

۴۔ ان قواعد کے ذریعہ زبان کی ساخت اور صیغوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے طالب علم کا ذہن تیار ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ قواعد زبان کی ساخت اور صیغوں کا علمی تجزیہ کرتے ہیں، جو لوگ زبان کو بحیثیت ایک فن کے حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ان قواعد کے ذریعہ الفاظ کی تبدیلیوں اور اسالیب کے تنوع کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

ہندوستان کے عربی مدارس میں صرف ونحو کے قواعد کی تدریس کا عام طریقہ یہ ہے کہ ان کو مستقل علم وفن کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے، نحو وصرف کی تعلیم ایک غامض، غیر واضح، پیچیدہ اور فلسفیانہ فضا وماحول میں ہوتی ہے، طالب علم کے ذہن میں کبھی یہ بات نہیں آتی کہ ان قواعد کی حیثیت دیگر علوم مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، زبان وادب اور بلاغت کے لئے صرف معاون کی ہے، ان سے اعراب کی دشواریوں اور فن کی مشکلات کے حل کرنے، عبارت کا مفہوم سمجھنے، کلام کی ساخت اور صیغوں سے واقفیت حاصل کرنے اور پھر معانی تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے، اور یہ فی نفسہ مقصود نہیں ہیں۔

اس طرح سے استاد طلباء کو نحو پڑھانا شروع کرتا ہے، اور مثال کے طور پر کلمہ کی تعریف کرتے ہوئے بتائے گا کہ کلمہ اس لفظ مفرد کو کہتے ہیں جس کی ساخت مفرد معنی پر دلالت کرنے کے لئے ہوئی ہو، پھر کلمہ کی طول طویل تشریحات کرے گا، اپنی بات کی تائید

میں ہر ممکن دلیل پیش کرے گا، دور دور سے شواہد لائے گا، تفصیلات کی گہرائی میں چلا جائے گا، معنی کی تشریح کے دوران شارحین ومحشین کے اقوال کی طرف بھی اشارہ کرے گا اور پھر فن کے دقائق، نکات اور اسرار ورموز بھی پیش کرے گا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم ذہنی الجھاؤ کا شکار ہوجاتا ہے، اور موضوع کے سلسلہ میں وہ اندرونی پریشانی میں مبتلا ہوجاتا ہے، بعض مدرسین اس طرز پر قواعد کی تشریح اور نحویوں کے مذاہب ونظریات کو پیش کرنے میں مدتوں لگادیتے ہیں۔ اس طرح طالب علم کے ذہن میں یہ احساس جاگزیں ہوجاتا ہے کہ یہ فن بے حد مشکل ہے، موضوع بے انتہا خشک ہے، اور مسائل بالکل سخت ہیں۔ کتاب کے پڑھنے میں انہماک کے باوجود کتاب سے اس کا تعلق ورشتہ کمزور پڑجاتا ہے، اور وہ اس پڑھنے کا صرف یہی حاصل سمجھتا ہے کہ بغیر مطلب سمجھتے ہوئے چند بنیادی مسائل محفوظ کرلے اور کتاب کے الفاظ اور استاد کی تشریح کا ایک حصہ یاد کرے، اس کے بعد وہ سوچتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوگیا، ہمارے پاس اس کی بہت سی مثالیں ہیں کہ بہت سے طلباء نے قرآن کی طرح مطلب سمجھے بغیر نحو کی کتابیں حفظ کرلیں اور اسی طرح ہمارے پاس نحو کے ان مدرسین کی بھی مثالیں ہیں جن کو اس فن کی تدریس کے سلسلہ میں مستند سمجھا جاتا ہے، لیکن وہ لکھنے، پڑھنے اور بولنے میں اعراب کے مسائل کے اجراء وتطبیق پر قادر نہیں ہیں۔

ہمارے عربی مدارس کے نحو وصرف کے مدرسین کے طریقہ تدریس کی اصل خامی یہ ہے کہ وہ ان قواعد کو فی نفسہ مقصود سمجھ کر پڑھاتے ہیں، اور پڑھانے کا انداز بھی خشک، بے جان اور جامد ہوتا ہے، نحو کی قدیم درسی کتابوں میں منطق وفلسفہ اور دیگر بہت سے علوم داخل ہوگئے ہیں۔ جنہوں نے اس فن کو مزید پیچیدہ، غامض اور مشکل بنادیا ہے، اور فن کے معروضی طرز کو بالکل ختم کردیا ہے، جس سے طالب علم ذہنی فکری الجھاؤ اور پریشانی کا شکار ہوجاتا ہے، اس کے ذہن پر موضوع کی پیچیدگی اور مقصدیت کا احساس چھاجاتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ آئندہ تعلیمی زندگی سے اس موضوع کا کوئی تعلق نہیں ہے، مثال کے طور پر ملا نورالدین عبدالرحمٰن جامی کی کتاب شرح جامی کو لیجئے، اس کتاب کی خصوصیت یہ

ہے کہ اعراب کے قواعد، فوائد اور مسائل کو چھوڑ کر ہر چیز کے لئے طالب علم کے ذہن کو تیار کرتی ہے، اور اس میں جلا پیدا کرتی ہے، اس کتاب سے ذہانت، تفلسف، تدقیق، تعمق اور اس طرح کے دوسرے خارجی فوائد تو حاصل ہو سکتے ہیں، لیکن موضوع سے متعلق چیزوں کی تفصیل مشکل سے ملے گی، یہی وجہ ہے کہ جو طلباء اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ہمارے یہاں آتے ہیں ان کی نحوی سطح اور ان کا اعرابی معیار قابل افسوس حد تک پست ہوتا ہے، وہ عبارت پڑھنے میں نحوی اور صرفی غلطیوں سے محفوظ نہیں رہ پاتے، اور نہ قواعد کے متعلق کسی سوال کا صحیح اور عملی جواب ہی دے سکتے ہیں، البتہ نظریاتی جواب تو بعض طلباء اچھی طرح دے لیتے ہیں، لیکن عملی اور تطبیقی میدان میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔

ہمارے مدارس میں بالعموم نحوی قواعد کی تدریس کا یہی طریقہ رائج ہے، اس طویل نصاب کے دوران کبھی طالب علم کو عملی مرحلہ سے سابقہ نہیں پڑتا، اور نہ وہ صرف ونحو کے حقیقی مقصد ہی سے واقف ہو پاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ مختلف علوم وفنون کی طرح یہ بھی ایک علم وفن ہے، اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ کتاب سمجھ لی جائے، مسائل یاد کر لئے جائیں اور سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحانات میں سوالات کے جوابات دے دیئے جائیں، طالب علم نحو وصرف سے متعلق چار یا پانچ یا اس سے بھی زائد کتابیں پڑھتا ہے لیکن وہ مقصد سے ناواقف ہوتا ہے، اس کے سامنے کبھی اعراب کے مسائل کا عملی مرحلہ نہیں آتا، اور بہت سے لوگ تو اعرابی غلطی کو کوئی ایسا بڑا عیب شمار نہیں کرتے جو ایک عالم کی شان سے فروتر ہوتا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ اعراب کی صحت ایک ظاہری حسن وجمال کی چیز ہے، اس سے علوم کی فہرست میں ایک مزید علم کا اضافہ ہو جاتا ہے، بس اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صرف ونحو کا مضمون طلباء کے لئے ہمیشہ ناپسندیدہ اور باعث انقباض رہا ہے، کیونکہ طلباء کے اندر یہ احساس جاگزیں ہو جاتا ہے کہ ان قواعد کا انحصار منطقیانہ تحلیل وتجزیہ پر ہے، زمانہ کی تعبیرات واسالیب اور ان کے درسی تجربات سے ان کا کوئی واضح اور صاف مقصد نہیں ہے۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نحو وصرف کی تدریس سے متعلق کچھ مفید تجویزیں پیش کردی جائیں، تاکہ طالب علم ان کے حقیقی مقصد سے روشناس ہو سکے، اس سلسلہ میں ہم مندرجہ ذیل بعض نقاط کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی طرف توجہ کرنے سے یہ خشک اور جامد موضوع دلچسپ اور مرغوب فیہ بن جائے گا، اور طلباء کو اس سے خاطر خواہ فوائد حاصل ہوں گے۔

۱۔ ہم اعراب کے قواعد کو ذریعہ اور واسطہ سمجھیں نہ کہ مقصود، ان کا رشتہ آداب زندگی سے مربوط کردیں، ایسی مثالوں کا انتخاب کریں جن کا تعلیمی زندگی اور طلباء کے رجحانات وضروریات سے گہرا تعلق ہو، اور ایسی عبارتیں پیش کریں جو جمال فنی اور اسلوب کی خوبی کا نمونہ ہوں، اور ان سے قواعد کے استعمال کی بھی وضاحت ہوتی ہو، اس طرح نحو کا موضوع دلچسپ ہوسکتا ہے، اور عملی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تربیت کا فائدہ بھی اس سے حاصل ہوسکتا ہے۔

۲۔ دوسرے مضامین میں بھی اعراب کے قواعد پر متنبہ کرنے کے مواقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور مناسب حدود کے اندر طلباء سے سوالات کئے جائیں، لیکن مدرس کو اس کا خیال رکھنا ہوگا کہ اصل مضمون سے ہٹ کر نحوی قواعد کی تشریح وتفصیل میں نہ بہہ جائے۔

۳۔ نقل وتکرار کے ذریعہ نحوی قواعد کے مضمون میں منظم عملی مشق پر خاص طور سے توجہ مرکوز کی جائے۔ تاکہ طلباء لغت کے صحیح استعمالات اور اسلوب وتعبیر کی تحسین کے عادی ہوجائیں، اور اس سلسلہ میں طلباء کو گفتگو کی مکمل آزادی دی جائے۔

۴۔ قواعد اصول کی تدریس میں تفلسف وتعمق سے اجتناب کیا جائے، نحوی مسائل، لغوی الفاظ کی تشریح، طریقۂ استعمال اور اعراب کی توجیہ بیان کرنے پر اکتفا کیا جائے،، اور عملی زندگی اور معاشرہ سے متعلق ایسی مثالیں دی جائیں جن کے فوائد عملی اور محسوس ہوں، اور ذہن ودماغ پر ان کا اثر ہو، ساتھ ہی ساتھ قواعد کے پڑھانے میں ترتیب، نظام تدریج اور طلباء کی نفسیات کا لحاظ رکھنا بھی بہت ضروری ہے، مثلاً محسوسات

سے معنویات اور آسان سے مشکل کی طرف آہستہ آہستہ منتقل ہوتا ہے۔

۵۔ مدرس کے لئے ضروری ہے کہ تعبیر کی صحت کا التزام کرے اور ہر طرح کی غلطی سے اجتناب کرے، اس کا اثر طالب علم پر بہت گہرا پڑتا ہے، اور اس سے تعبیر کو سنوارنے اور غلطی سے اجتناب کی طرف توجہ ہوتی ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ قواعد پڑھانے کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے سپرد ہو جو صحیح و فصیح کلام پر قادر ہوں، بعض مدرسین کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ قواعد کی تدریس میں عامی زبان استعمال کرتے ہیں، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ قواعد کی تعلیم میں خود قواعد کی زبان پر اعتماد کیا جائے اور کسی دوسری زبان کا سہارا نہ لیا جائے۔

۶۔ ابتدائی مراحل میں بنیادی قواعد پڑھائے جائیں، جن کا اسلوب و معانی سے گہرا تعلق ہو اور جن کا سمجھنا اور ادراک کرنا آسان ہو اور فرضی اور نادر الوقوع مسائل نہ پیش کئے جائیں۔

نحو وصرف کی تعلیم کے سلسلہ میں یہ بعض بنیادی اشارے ہیں، اگر ان کی طرف توجہ دی گئی تو تعلیم کے خاطر خواہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

اس پہلو پر خاص طور سے توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے کہ ان قواعد کی حیثیت صحیح فصیح کلام و تعبیر کے لئے ایک ذریعہ اور واسطہ کی ہے۔ ان کو مستقل فن یا فی نفسہ مقصود سمجھنا درست نہیں ہے، ہمارے مدارس کے نصاب کی بنیادی کمزوری ہے کہ اس میں نحو کے عملی پہلو پر کوئی توجہ نہیں ہے، نحو کو ایک مستقل فن سمجھا جاتا ہے اور ہر سال نحوی تعلیم کے لئے ایک یا چند کتابیں متعین کر دی جاتی ہیں، اسی وجہ سے اس نصاب کے نتیجہ میں نحو وصرف کی تعلیم کا کوئی فائدہ ظاہر نہیں ہو پاتا، نحو وصرف کی بہت سی کتابیں پڑھ لینے کے باوجود بلکہ فراغت کے بعد بھی لوگ صحیح اعراب نہیں پڑھ سکتے، اور لکھنے، پڑھنے اور بولنے میں اگر کوئی اعرابی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے ہیں اور نہ اس کو کچھ اہمیت ہی دیتے ہیں۔

اوراب جبکہ تعلیم وتربیت کے ماہرین عملی پہلوؤں کی طرف توجہ کررہے ہیں اور تعلیم کی مشکلات، تربیت کی خصوصیات، ذہنی صلاحیتوں اور نفسیاتی حالات کا جائزہ لے رہے ہیں تو ہمارے اوپر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہمارے مدارس میں نحو وصرف کے قواعد کی تدریس ذریعہ اور واسطہ کی حیثیت سے ہو، جس سے کلام کی صحت، تعبیر کے حسن و جمال اور اسلوب کی درستگی میں مدد ملے۔

بلاغت: نظریہ اور فن

کسی بھی زبان کے ادب اور اس کی تاثیر کو سمجھنے اور اس سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے علمائے بلاغت نے کچھ اصول مقرر کئے ہیں اور اس موضوع پر کتابیں تصنیف کی ہیں، تاکہ انسان اپنے مافی الضمیر کو مقتضائے حال کے مطابق صحیح طریقے سے ادا کر سکے اور اپنے مخاطب کو فائدہ پہنچا سکے۔

ایک ایسا شخص جو زبان وقلم کی خوبیوں کو تحریر وتقریر کے ذریعہ دل نشیں اسلوب اور مؤثر انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے، اس کا اپنے مخاطبین کی نفسیات، ان کی ذہنی سطح، ان کے ماحول اور ان کے گردوپیش کی فضا سے پوری طرح واقف ہونا اور نہایت باریک بینی سے ان کا احاطہ کرنا ضروری ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر علماء بلاغت نے بلاغت پر خصوصی توجہ دی۔

اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر متقدمین علماء نے بلاغت کے موضوع پر بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں، اور جدید تعلیمی نظریہ کے مطابق معاصر علماء نے بھی نئے اسلوب کے ساتھ جدید طرز پر کتابیں تحریر کی ہیں، اور الفاظ کو صحیح طریقے سے صحیح جگہ پر استعمال کرنے کے بارے میں ایسے اصول مرتب کئے ہیں جن سے واقف ہونا نہ صرف طالب علم کے لئے بلکہ ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو اس فن سے اشتغال رکھتا ہو، خاص طور سے ان لوگوں کے لئے جو قرآن کی بلاغت اور اس کے معجزانہ اسلوب کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیتے ہوں، یہی وجہ ہے کہ اعجاز القرآن کے موضوع پر ہر عہد میں لوگوں نے اپنی توجہات مرکوز کیں، اور اس کا ثمرہ بہت سی اہم تصنیفات کی شکل میں ظاہر ہوا، جن میں قرآن کے اعجاز پر مدلل طریقے سے گفتگو کی گئی ہے۔

غور کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ علمائے بلاغت نے اس موضوع پر نہایت گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے، اور اس کو ایک عظیم علم کی حیثیت سے علمی حلقوں میں پیش کرنے کی زبردست جدوجہد کی ہے، اور اس کے حقائق ودقائق کو موضوع بحث بنایا ہے، تاکہ قرآن کریم کا اعجاز، اس کی سحر بیانی اور اس کے مؤثر ترین اسلوب کو دنیا کے سامنے پیش کرکے اللہ تعالی کی رضا حاصل کرسکیں اور اس کے کلام کی عظمت کا اعتراف اس کے بندوں سے بھی کراسکیں۔

عہد امیہ میں اگرچہ فن بلاغت مستقل صنف سخن کے طور پر ضبط تحریر میں نہیں آیا تھا، لیکن کلام کو سامع کے ذہن ودماغ تک پہنچانے کی کوششیں مؤثر طریقہ پر جاری تھیں، قرآن کریم کی بلاغت کی اثر آفرینی تھی کہ علم وادب اور فکر وفن کے حاملین نے اس کی طرف توجہ کی، چنانچہ دوسری صدی ہجری میں بصرہ کے رہنے والے صاحب فن ابوعبیدہ معمر بن مثنی نے اس موضوع پر کئی کتابیں لکھیں، ان میں اعجاز القرآن، معانی القرآن اعراب القرآن، طبقات الشعراء اور المحاضرات والمحاورات قابل ذکر ہیں، دوسری صدی کے اواخر اور تیسری صدی کے اوائل میں ابوعثمان عمرو بن بحر جاحظ نے ''البیان والتبیین'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کرکے فن بلاغت کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا، اسی طرح جعفر بن قدامہ محمد بن حسن بن دریدازدی اور ابو ہلال حسن بن عبداللہ عسکری نے بلاغت کو اپنا خاص موضوع بنایا، آخر الذکر نے ''کتاب الصناعتین'' اور ''المحاسن فی تفسیر القرآن'' کے نام سے کتابیں لکھیں۔

ان نمائندہ ارباب فن نے اپنی کتابوں میں ان مسائل کو اہمیت دی کہ کلام میں بلاغت کا کیا درجہ ہے؟ اعجاز قرآنی کسے کہتے ہیں؟ قرآنی بلاغت کے وہ کون سے گوشے ہیں جن کے سامنے بڑے بڑے سخنوران فن حیران وششدر رہتے؟ لیکن وہ باقاعدہ فن بلاغت کی تدوین نہیں کرسکے، بالآخر پانچویں صدی ہجری میں اقلیم بلاغت کے تاجدار علامہ عبدالقاہر جرجانی نے بلاغت کے اصول وضع کئے اور مستقل فن کی حیثیت سے ان کو پیش کیا، اور دوشہرۂ آفاق کتابیں بھی لکھیں جن میں سے ایک ''اسرار البلاغۃ'' اور دوسری ''دلائل

الاعجاز'' کے نام سے علمی حلقوں میں متعارف ہے، ان دونوں کتابوں نے ادبی دنیا میں ایک فکری انقلاب برپا کردیا، علامہ عبدالقاہر جرجانی وہ پہلے صاحب فن ہیں، جنہوں فلسفہ بلاغت اور اعجاز قرآنی کے سمجھنے میں اس کے مؤثر کردار سے متعلق بالتفصیل کلام کیا ہے، اور اس فن کے اصول وقواعد بیان کئے اور اپنے اخلاف کے لئے اس کی تبویب وترتیب میں سہولت بہم پہونچائی، پھر شیخ ابو یعقوب یوسف بن ابوبکر سکاکی نے اسی نہج پر ''مفتاح العلوم'' نام سے ایک کتاب لکھی اور اس میں اس فن کے قواعد کو نہایت تفصیل سے پیش کیا۔

بلاغت کی ایک قسم علم بدیع ہے، ابن المعتز نے سب سے پہلے اس صنف کو مرتب ومدون کرکے پیش کیا، وہ اس علم کا موجد ہے، وہ بذات خود ادیب اور شاعر تھا، اس کی اہم کتابوں میں البدیع، الزہر والریاض، الآداب اور طبقات الشعراء ہیں۔

قرآن کریم فصاحت وبلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے، اسی سرچشمہ سے اس فن کے اصول مرتب ہوئے، چنانچہ وہ اس فن کی منتہا قرار پایا، معروف اسلامی ادیب ومؤرخ مصطفیٰ صادق الرافعی اپنی کتاب ''تاریخ آداب العرب'' میں رقمطراز ہیں:

> ''قرآن کریم عربوں کی نظر میں فصاحت وبلاغت کی اعلیٰ چوٹی پر تھا، چنانچہ وہ اس علم کی کسوٹی قرار پایا'' جملہ ادبی علوم وفنون میں بلاغت ایک ایسا فن ہے جس کی اساس ذوق جمال اور رعنائی خیال پر ہے، اس کے ذریعہ انسان ادب کے متنوع طریقہائے بیان سے واقف ہوتا ہے، وہ پرشکوہ فکر، بلند معانی اور خوبصورت زاویۂ نگاہ کا آئینہ دار ہے، وہ اظہار خیال کی طاقت، ادبی ذوق کی تشکیل جیسے امور کا ذریعہ ہے، بلاغت خالص ادبی فن ہے، فلسفیانہ انداز کلام اور ژولیدہ بیانی سے بالکل پاک ہے، متقدم علمائے بلاغت ابو ہلال عسکری، جاحظ، ابن معتز اور ابن قتیبہ نے جب بلاغت کے معنی ومفہوم کی وضاحت کی تو ذوق وفن اور تجزیہ وتنقید کا اسلوب اختیار کیا، لیکن علامہ عبدالقاہر جرجانی نے ایک نئے طرز فکر کی طرح ڈالی، اور انوکھے انداز میں بلاغت کے قواعد وضوابط کو مرتب

کیا جس میں اس کے امتیازی نقوش بھی تھے اور قوانین کی حد بندی بھی تھی، مزید عربی انداز نگارش کی خصوصیات کی وضاحت کے ساتھ نظریۂ نظم کلام کی تفصیل بھی تھی۔''

علامہ رشید رضا مصریؒ نے دلائل الاعجاز کے مقدمہ میں علامہ جرجانی کے نظریۂ بلاغت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بلاغت کلام یہ ہے کہ متکلم مخاطب کے سامنے اس کی حالت کے مطابق ایسے مؤثر اسلوب میں گفتگو کرے جو اس کے تارنفس کو جھنجھوڑ دے، اس کے لئے نحو اور بلاغت کی متعدد قسموں کے استعمال کی ضرورت ہوگی، اور کلام کو مؤثر بنانے کے لئے مثالوں کو بھی پیش کرنا ہوگا، جو مثال مطابق حال اور اثر پذیری میں بہتر ہوگی وہی معتبر مانی جائے گی، مثال کے طور پر بادشاہ نے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ اس کے تمام دانت گر گئے ہیں، ایک تعبیر بتانے والے نے بتایا کہ بادشاہ سلامت! آپ کے اہل خاندان کا انتقال آپ کی موجودگی میں ہوگا، دوسرے تعبیر بتانے والے نے بتایا کہ بادشاہ سلامت کی عمر طویل ہوگی، یہ دوسرا جواب بادشاہ کو پسند آیا، پہلے جملہ میں جو بات کہی گئی تھی وہ بھی مبنی بر صداقت تھی، لیکن اس کے اندر نہ تاثیر تھی اور نہ معنویت، اسی دوسرے طرز بیان کو علامہ جرجانی نے اپنی دونوں کتابوں ''دلائل الاعجاز'' اور ''اسرار البلاغۃ'' میں اختیار کیا ہے، ان کے بعد کچھ علمائے بلاغت آئے، انہوں نے بلاغت کو محض ایک لفظی صنعت قرار دیا۔''(۱)

معلوم ہوا کہ بلاغت نحو وصرف اور منطق وغیرہ کی طرح علوم آلیہ کی قبیل سے نہیں ہے، اور نہ وہ چند مسائل وضوابط اور تعریفات سے عبارت ہے، بلکہ اس کا تعلق ادبی ذوق اور جمالیاتی شعور سے ہے، لہٰذا اس کو فنی ادب اور ادبی جمال سے مربوط رکھنا ضروری ہے،

---

(۱) مقدمہ دلائل الاعجاز

بلاغت میں صرف قواعد، اس کی مثالوں، اور اس کے ضروری احکام پر اکتفا کرنا، اور اس کو علمی تحقیقات کے ضمن میں رکھنا ازالہ حیثیت عرفی کے مرادف ہے، یہ موضوع علمی موشگافیوں اور فلسفیانہ نکتہ سنجیوں کا نہیں بلکہ ادبی عبارتوں میں پنہاں فنی خوبصورتی، اسلوب کی دلکشی اور اندرونی اثر پذیری کے جاننے کا ہے، جب کسی انسان کو یہ ملکہ حاصل ہو جائے گا تو درست اور نادرست کلام کے درمیان امتیاز کرنا آسان ہوگا، اور نظم کلام کے مختلف وجوہات سے بھی واقفیت ہوگی، اسی صلاحیت کو اصطلاح میں صنعت کلام سے تعبیر کرتے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری کے علمائے بلاغت میں ایک نمایاں نام ابو ہلال عسکری کا ہے، وہ صنعت کلام سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

> ''کلام بامعنی الفاظ کے مجموعے کا نام ہے، فن بلاغت کا عالم لفظی حسن کے ساتھ معنوی حسن کو بھی زیر بحث لاتا ہے، کیونکہ معانی ہی خوبیوں کا مرکز ہیں، معانی کی حیثیت بدن کی اور الفاظ کی حیثیت ظاہری پوشاک کی ہے، دونوں کے درمیان جو فرق ہے وہ اظہر من الشمس ہے، اگر کسی شخص کو ایک زبان میں مافی الضمیر کو صحیح الفاظ میں ادا کرنے کا سلیقہ ہے تو دوسری زبان میں ادا کرنا اس کے لئے کوئی مشکل امر نہیں، مثلاً عبدالحمید کاتب فارسی زبان کا ایک قادرالکلام انشاء پرداز تھا، اس نے انشاء پردازی کے وہی اصول عربی زبان کے لئے استعمال کئے، اور باکمال رہا، اس سے معلوم ہوا کہ صنعت کلام میں وہی شخص ممتاز ہوگا جو الفاظ کا صحیح استعمال اور معانی کی خوبیوں سے واقف ہو۔''

پانچویں صدی ہجری میں علامہ عبدالقاہر جرجانی رحمۃ اللہ علیہ نے بلاغت کے اصول وقواعد وضع کئے، اور اسلوب کو موثر بنانے، طریقہ ادا کو دلکش بنانے میں بلاغت کے کردار کو سراہا اور بتایا کہ صنعت کلام بامعنی الفاظ کے ذریعہ وجود میں آتی ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''جب الفاظ معانی کا پیرہن ہیں، تو یقیناً وہ معنی خیز ہوں گے، اور یہ حقیقت ہے کہ دل کے احساسات الفاظ کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں،

الفاظ کے سلسلہ میں یہ تصور رکھنا کہ وہی بذاتہ مقصود ہیں، یا ان کو ادا کرنے کے بعد پھر ان کو فکر سے معمور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے خام نظریہ اور بے بنیاد بات ہے"۔

چنانچہ معلوم ہوا کہ بلاغت، کلام اور متکلم کی مشترکہ صفت ہے، کیونکہ کلام اگر متکلم کے دل کا ترجمان ہے اور مطابق حال ہے تو کلام بلیغ ہے، اور جو متکلم دلکش انداز اور اچھے پیرایۂ بیان میں اظہار خیال پر قادر ہو تو فصیح و بلیغ ہے۔

ساتویں صدی ہجری میں ابو یعقوب یوسف سکاکی نے ایک کتاب "مفتاح العلوم" کے نام سے لکھی، اس میں بلاغت کے قواعد اور اس کے قسموں کی تعریفات کو مرتب کیا اور پہلی مرتبہ بلاغت کو تین قسموں میں علم بیان، علم معانی، علم بدیع میں تقسیم کیا، متقدمین کی مشکل عبارتوں کی توضیح کی، مزید مثالوں کے ذریعہ سے ان کی تشریح کی، اس طرح شروح وحواشی کی کتابوں کی کثرت ہوئی، چنانچہ فن بلاغت متأخرین کے نزدیک چند بنیادی مسائل وقواعد، اصطلاحات اور انکی اقسام مزید ان کی تفصیل وتشریح سے معنون ہوا، ظاہر سی بات ہے کہ بلاغت کی تدریس کا یہ طول طویل طریقہ بلاغت کی روح نہیں پیدا کرسکتا۔

برصغیر کے مدارس میں بلاغت کی تدریس کا یہی طریقہ رائج ہے، نحو وصرف کی طرح اس کو بھی پڑھایا جاتا ہے، اساتذہ بلاغت کے قواعد، اس کی اصطلاحات کی پہلے تعریف ذکر کرتے ہیں پھر توضیحا کتاب میں موجود مثال کو ذکر کردیتے ہیں، اس وجہ سے یہ علم خشک علم تصور کیا جانے لگا، جس میں نہ ادبی جمال کا عنصر ہے اور نہ اس سے فنی شعور اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے، طلباء بھی قواعد کی اصل عبارتوں اور اصطلاحات کے یاد کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور اس کے احکام کی فلسفیانہ تشریح کرتے ہیں۔

بلاغت کے ساتھ اس غیر فطری رویہ سے ادبی عبارتوں میں موجود جمالیاتی پہلوؤں کا ادراک جاتا رہا، اور یہ رجحان پیدا ہوگیا کہ بلاغت کا ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے، اساتذۂ بلاغت کی توجہ بھی بلاغت پر نظریاتی طور پر رہی، مزید طرفہ یہ کہ فن بلاغت پڑھا

نے والے مدرسین نے بلاغت کی تدریس میں مجادلانہ، نہج اختیار کیا، جس سے یہ فن مشکل سے مشکل ترین ہوگیا، پھر نئی اصطلاحات وضع کرنے اور ان کی تشفی بخش تشریح کی ضرورت پیش آئی جن کے پیچ وخم میں طلباء کا ذہن الجھ گیا اور تشویش کا شکار ہوا۔

سطور ذیل میں ہم چند نکات پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں، جن سے کسی حد تک استفادہ اور انشاء اللہ موضوع سے خصوصی دلچسپی اور اس کے اصول سے واقفیت میں خاصا معاون ہوگا:

(۱) فن بلاغت پڑھانے والوں کے اندر موضوع سے مناسبت اور جمالیاتی پہلوؤں سے واقفیت ہونا ضروری ہے، کیونکہ بلاغت ایسے فنی اصول سے عبارت ہے جن کو حسن وقبح کی شناخت کے بغیر سمجھا نہیں جاسکتا۔

(۲) آغاز درس میں طلباء کے سامنے بلاغت کی افادیت واہمیت پر ایسی جامع گفتگو ہونی چاہئے، جس سے طالب علم کے اندر اس فن کے پڑھنے کا شوق پیدا ہو، نیز مثالوں کے ذریعہ سے افہام وتفہیم کا سلسلہ جاری رکھ کر طلباء کو ادبی شہہ پاروں کے ذریعہ حسن کے مقامات کی نشاندہی کرنے کا مکلّف کیا جائے۔

(۳) اسلوب کی مختلف قسموں کو زیر بحث لایا جائے، ایک مفہوم کو مختلف عبارتوں میں کس طرح ادا کیا جاتا ہے، اور کلام کب مقتضائے حال کے مطابق ہوتا ہے، استعارہ، تشبیہ، مجاز، کنایہ، محسنات لفظیہ ومعنویہ کا استعمال کہاں صحیح ہوتا ہے؟ اس کی بھی نشاندہی کی جائے، بہرصورت طلباء کو بلاغت کے بنیادی قواعد کا جاننا اسلوب کی عمدگی، تصویر کی دلکشی اور کلام کی خوبیوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔

آج کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ بلاغت کے پڑھانے والے وہ حضرات ہیں، جو کلام کے حسن سے غافل اور محدود فکر کے حامل ہیں وہ قدیم طرز تدریس کو چھوڑنا پسند نہیں کرتے، اور نہ ان کتابوں سے صحیح معنوں میں استفادہ کرتے ہیں جو تطبیقی انداز میں لکھی گئی ہیں، چنانچہ ان کا درس منطقیانہ اور فلسفیانہ فوائد ونتائج پر تو مشتمل ہوتا ہے، لیکن اس سے بلاغت کی پختہ صلاحیت طلباء کے اندر نہیں پیدا ہو پاتی۔

اسلامی ادب اور کچھ دوسرے ادبی نظریے

مذہب اور ادب

ادب کسے کہتے ہیں؟

یہ ایک مختصر سا سوال ہے جس کا جواب اپنے اپنے زمانے کے مفکرین وادباء اپنے اپنے ذوق وانداز کے مطابق سینکڑوں سال سے دیتے چلے آئے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادب دراصل زندگی کی صحیح تشبیہ اور انسانی تجربات کی اس سچی تصویر کا نام ہے جو ایک فن کی شکل میں سامنے آتی ہے، خواہ وہ افسانہ ہو یا نثر ونظم، یا کوئی تمثیلی قصہ ہو، یا نغمہ وموسیقی۔

زندہ اور بامقصد ادب وہی ہوسکتا ہے جو حقیقت کا ترجمان ہو، لیکن جہاں یہ صفت مفقود ہوئی، ادب اپنی تاثیر، اپنی طاقت اور اپنی گہرائی سے محروم ہوجاتا ہے اور وہ محض ایک تصویر بن کر رہ جاتا ہے جو روح سے خالی ہوتی ہے، اس بے روح ادب میں زندگی کی ہر تشبیہ اور انسانی تجربات کی ہر تعبیر بے قیمت ہوتی ہے، بلکہ وہ احساس ووجدان کی ایسی غلط تصویر ہوتی ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس کی ساری قیمت (خواہ کوئی بھی ادب ہو یا ادب کی کوئی بھی قسم ہو) صرف اسی میں مضمر ہے کہ وہ واقعات وانفعالات کی صحیح نمائندگی کرے، اس کے بغیر اسکی مثال بالکل اس خالی جام کی ہے جو دور سے بہت پر کیف اور دلفریب نظر آتا ہے، لیکن اسمیں پیاس بجھانے کی صلاحیت قطعاً نہیں ہوتی ہے یا مٹی کے اس شیر کی ہے جو دور سے جنگل کا ایک زندہ شیر دکھائی پڑتا ہے، لیکن درحقیقت وہ مٹی کے ایک ڈھیر سے زائد کچھ نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ادب کن حالات میں اپنا وظیفہ صحیح طریقہ سے انجام دے

سکتا ہے، اور وہ کون سی شی ہے جو اسکی زندگی کی ضامن ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ادب کی بنیاد جب زندگی اور انسانی نفس کی گہرائیوں پر قائم ہے اور ادب و زندگی میں جب قدر مشترک حقیقت اور واقعات کی صحیح ترجمانی یا اسکی سچی تصویر کشی ہے، تو بلا شبہ اس واقعیت اور حقیقت کی نمائندگی کے لئے ایسی چیز کا سہارا ڈھونڈنا پڑے گا جو ازل سے حق و صداقت اور انسانی نفس کی واقعی رہنمائی پر مبنی ہو اور جس کا وظیفہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہو کہ وہ زندگی کو بیک وقت کامیابی اور شادمانی سے ہمکنار کرتی ہے اور روح و جسم کے تقاضوں کو عدل و مساوات کی روشنی میں پورا کرتی ہے۔

آپ سوچیں تو بجز مذہب کے اور کوئی شی نہیں ہو سکتی جو زندگی کے حقائق پر اس تدبیر و حکمت کے ساتھ نظر رکھتی ہو، اس لئے کہ مذہب کا موضوع بھی زندگی اور نفس انسانی ہی ہے اور مذہب و زندگی کا قدر مشترک بھی واقعیت و صداقت اور وہ روحانی قدریں ہیں، جو زندگی کی حقیقت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہیں، اور جن کا وظیفہ صرف یہ ہے کہ وہ انسان کی زندگی کو ہر اعتبار سے کامیاب اور خوشحال بنائیں۔

اسی طرح ادب کا مقصد اگر یہ ہے کہ وہ نفس کیلئے ایسی علمی اور فنی غذا فراہم کرے، جس سے قلب منشرح ہو اور وہ ایک با مقصد اور مثالی ماحول قائم کر سکے، تو مذہب کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ زندگی اپنے خالق کی بنائی ہوئی راہوں پر چل کر حقیقی فلاح سے ہمکنار ہو اور ایک ایسی مثالی سوسائٹی وجود میں آئے جو انصاف، مساوات، خوشحالی و اخوت کی داعی ہو، اور ظلم، ناہمواری، بے اطمینانی اور انتشار سے متنفر اور بیزار ہو۔

اس سے یہ بات کس قدر واضح ہو گئی کہ مذہب ایک لمحہ کیلئے بھی انسانی نفس کی تربیت اور اس کی اصلاح سے غافل نہیں ہو سکتا، ادب اس تربیت و اصلاح کا ایک بہت بڑا وسیلہ ہے، اور بعض حالات میں ادب کے بغیر ذہنی تربیت ناممکن ہو جاتی ہے، اس لئے مذہب اور ادب کو دو الگ الگ چیزیں قرار دینا اور دونوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ کرنا بڑی ناانصافی ہے۔

مذہب کی سب سے بڑی کتاب قرآن مجید ہے جو ادب و بلاغت کا ایک عظیم نمونہ ہے، اس کتاب میں واقعات کی تصویر کشی اور مثالوں کے ذریعہ حقائق کا اظہار کس مؤثر اور بلیغ انداز میں موجود ہے، اس بحر بیکراں کی تفصیل کیلئے سفینے بھی کافی نہیں، اور نہ انسانی عقل و خرد اسکی باریکیوں کی حد تک پہونچ ہی سکتی ہے۔

فن برائے فن اور ادب برائے ادب کا نعرہ انہیں جگہوں میں بلند ہوا جہاں مذہب کو ایک قدیم اور غیر ضروری شئ کہہ کر زندگی کے خانہ سے نکال دیا گیا، اور یہ نعرہ انہیں لوگوں نے بلند کیا، جو الحاد و بے دینی کے دلدل میں پھنس کر اطمینان و سکون سے محروم ہو چکے ہیں اور بے بسی و بے چینی اور کرب والم میں اپنی زندگی کی گھڑیاں گن گن کر پوری کر رہے ہیں اور اپنے ہی تن مردہ کی طرح وہ ادب کو بھی ایک لاشئہ بے جان دیکھنا چاہتے ہیں۔

ترقی پسند ادب ہو یا آزاد ادب، اخلاقی قدروں سے آزاد رہ کر زندہ نہیں رہ سکتا، اور نہ سوسائٹی کی تعمیر میں کوئی کردار ادا کر سکتا ہے، بلکہ وہ ذہن و دماغ کی تخریب کا اولین ذمہ دار ہے۔

مذہب ہی ادب کی تخلیق کرتا ہے، اور وہی اس کو غذا فراہم کر کے مؤثر طاقتور اور گہرا ادب بناتا ہے، اگر مذہب کی رہنمائی سے ادب محروم ہو جائے تو وہ مٹی کے اس شیر سے زیادہ وقیع نہیں ہو سکتا جو دور سے شیر دکھائی پڑتا ہے، لیکن قریب سے وہ مٹی کا ایک ڈھیر ہوتا ہے۔

ادب زندگی کی بنیاد کو اعلیٰ اخلاقی قدروں پر اٹھاتا ہے اور کائنات میں رنگ آمیزی، فن کاری اور سحر آفرینی کر کے جمال کائنات کا شعور پیدا کرتا ہے اور انسان خالق جمال کی تصویر کائنات کے ذرے ذرے میں دیکھ کر مسحور رہ جاتا ہے، اور اسکا نفس خالق کائنات کی عظمت سے معمور ہو جاتا ہے :

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

ادب کا مفہوم اور اس کا مقصد

ادب ایک عظیم طاقت ہے، ایک خوبصورت طرز بیان ہے، اس طاقت کو ابھارنے، اس کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کے لئے پاکیزہ جذبات کے ساتھ فکر سلیم کی رہنمائی بھی ضروری ہے۔ الفاظ کا صحیح انتخاب، ان کی متوازن ترتیب اور اثر ڈالنے والے اسلوب کا استعمال ایک کامیاب ادیب کی اولین ذمہ داری ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے بعد یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ زبان وقلم سے نکلنے والے الفاظ اپنی ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں، ان کی حیثیت ایک دھاردار ہتھیار کی ہے کہ اگر اس کو غلط سمت میں اور تخریبی مقصد کے لئے استعمال کیا جائے تو اس کے نتیجہ میں بہت سی خرابیاں لازم آتی ہیں، اور بسا اوقات اخلاقی اور اجتماعی تباہی کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ادب کا وجود اس اہم مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے ہوا، وہ الفاظ کو معانی کا جامہ پہناتا ہے، وہ زندگی، کائنات اور انسان کی صحیح ترجمانی کرتا ہے، وہ پاکیزہ اخلاق کی دعوت دیتا ہے، صحت مند اقدار کو فروغ دیتا اور ان کی پوری حوصلہ افزائی کرتا ہے، دوسرے الفاظ میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ادب دراصل ہماری زبان اور ہمارے قلم سے نکلنے والے الفاظ کو بامقصد بنانے اور اس کو صحیح رخ دینے کا ایک عظیم الشان ذریعہ ہے، وہ نہ صرف یہ کہ ہمیں خوبصورت انداز میں زندگی کے نشیب وفراز سے آگاہ کرنے اور اس کو جمال وشائستگی سے آراستہ کرنے میں ہماری مدد کرتا ہے، بلکہ جذبات واحساسات کو بھی خوبصورت بنانے اور ان کو مقصدیت کی راہ پر لگانے کے طریقے بتاتا ہے۔

ادب نہیں بلکہ فن

یوں تو مؤرخین، ادبیات اور فنون لطیفہ کو یونان کے ماقبل مسیح عہد سے وابستہ کرتے ہیں اور ان کو افلاطون وارسطو کے ذہن وفکر کی پیداوار قرار دیتے ہیں، لیکن واقعہ ہے کہ اُس عہد میں ادب نام کی کوئی چیز نہیں تھی، جو کچھ تھا وہ فنون لطیفہ اور کلچر سے تعلق رکھتا تھا، اس لئے کہ

وہ ادب کے مفہوم و معنی سے بھی واقف نہیں تھے اور نہ اس اصطلاح کو وہ خود اپنی فنی صلاحیتوں کی ترجمانی اور ان کی تشریح کے لئے استعمال ہی کرتے تھے، وہ فن اور ثقافت کے نام سے شعر و شاعری، نغمہ و موسیقی اور مجسمہ سازی و بت تراشی، تہذیب و تمدن اور دیگر فنی مہارتوں کو پیش کرتے تھے، اور فلسفہ کے نام کے ساتھ، علم و فکر، منطق و معقول اور تمام علمی کاوشوں کو وابستہ کرتے تھے، بعد میں جن لوگوں نے ادب اور تنقیدی ادب کی تاریخ لکھی، انہوں نے ادب کی اصطلاح کو یونانی فن و ثقافت کے لئے استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔

صرف یہی نہیں کہ یونانی اور رومن آرٹ اور کلچر کے لئے ادب کی اصطلاح اس زمانے میں نامعلوم تھی، بلکہ عہد اسلام سے قبل جاہلی دور میں عربی شعر و شاعری اور نثری ذخیرہ کو ادب جاہلی کے عنوان کے تحت اس وقت کے کسی شاعر یا مؤرخ نے نہیں پیش کیا۔

اسلام اور آداب زندگی

جاہلیت، زندگی کا کوئی واضح اور متعین تصور پیش کرنے سے قاصر تھی، اس میں اخلاقی قدروں اور آداب معاشرت، کسی چیز کا کوئی وجود نہیں تھا، اسلام کے اثر سے انسانی زندگی میں انقلاب آیا، اس کے حدود و آداب متعین ہوئے اور انسان کو زندگی کا ایک پاکیزہ تصور حاصل ہوا، اس تصور کو عملی حیثیت سے مستحکم بنانے کے لئے اسلام کی لازوال تعلیمات نے بہت بڑا کردار ادا کیا۔ اخلاق ایک مستقل باب کی حیثیت سے زندگی کا جزء بن گئے، اور ہر جز کو ایک ادب کے ساتھ وابستہ کیا گیا، یہاں تک کہ زندگی انفرادی اور اجتماعی اخلاق و آداب کا مکمل نمونہ بن گئی اور انسان مسلم کو خلوتوں کے آداب سے لے کر اجتماعی اور سیاسی آداب اور حکمرانی تک کے آداب بتائے گئے، اور اسلام کی تعلیمات میں ان سارے آداب کی تفصیلات پوری وضاحت کے ساتھ بیان کردی گئیں۔

اس طرح اسلام نے دراصل ادب کا ایک نہایت ہی وسیع اور عظیم الشان تصور پیش کیا، اس ادب کا تقاضا تھا کہ زندگی ہر طرح کی خوبیوں سے آراستہ ہو، وہ مقصدیت کی روح سے معمور ہو، اور برائیوں، بداخلاقیوں اور شیطانی خصلتوں سے اس کا رشتہ کسی حال میں نہ

جڑنے پائے، کتاب اللہ اور کلام رسول ﷺ آدابِ زندگی کا روشن ترین عنوان تھے، یہ دونوں سرچشمۂ ہدایت ہونے کے ساتھ زندگی کو تہذیب وتمدن اور علم وفکر، لطافت حس، اور ذوق ووجدان کا درس بھی دیتے تھے، اور روح کی بالیدگی کے ساتھ شعور کو بھی نزاکت ونزاہت کے جوہر سے آراستہ کررہے تھے۔

اسلام ادب کے ہم معنی

ادب، لغت میں دعوت دینے کو کہتے ہیں، اَدَبَ یأدب اُدباً کے معنی ہیں: کسی اچھی چیز کی طرف بلانا، ابن منظور نے اپنی کتاب لسان العرب میں لکھا ہے کہ: "سمی أدباً لأنه یأدب الناس الی المحامد وینهاهم عن المقابح"۔

اسلام ایک دعوت الی الخیر کی شکل میں ظہور پذیر ہوا، اس کی تعلیمات کا بنیادی نقطہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، اس کا مقصد ہی اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینا ہے، اور یہ دعوت نرم اسلوب، حکمت کے انداز اور خیر خواہی وموعظت کی روح کے ساتھ دی جائے تو خوبصورت اور مؤثر کلام کے بغیر اس کی ترجمانی کی کوئی اور صورت نہیں ہے، خواہ اس کو زبان سے ادا کریں یا قلم کے نوک سے، بالکل اسی نوعیت کے ساتھ اسلام کی دعوت پیش کرنے کا حکم کتاب اللہ کی آیات میں موجود ہے، اور "ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی أحسن" (نحل ۱۲۵) آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلائیے، اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے۔ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ دعوت کے اس طریقۂ کار کا ذکر ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں تو قرآن کو صراحۃً ادب ہی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، ان کی روایت اس طرح ہے: "ان هذا القرآن مأدبة الله فی الأرض فتعلموا من مأدبته" قرآن روئے زمین پر اللہ کا خوان نعمت ہے تو تم اس سے خوب استفادہ کرو، اور حضور ﷺ نے جب خود یہ فرمایا کہ "أدبنی ربی فأحسن تأدیبی" (میرے رب نے مجھے تعلیم دی اور اچھی تعلیم دی) اور اپنے اس قول سے قرآن

اور وحی کو ادب قرار دیا تو اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ اسلام ادب کے ہم معنی ایک پیغام اور طرز تربیت کا نام ہے اور اس کی تمام چھوٹی بڑی تعلیمات وتفصیلات زندگی کے ہر گوشے سے متعلق ہیں، اور فطرت کے تقاضوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں، یعنی کوئی طریقۂ عمل حکمت وجمال کے راستے سے ہٹا ہوا نہیں ہے، اور کلام وبیان کے ذریعہ وہ زندگی، کائنات اور انسان کے پیغام ومقام کو واضح کرتا ہے۔

ادب ایک خالص اسلامی اصطلاح ہے

ادب کا تعلق جب اسلام سے اس قدر گہرا ہے کہ ادب کا مفہوم ہی اسلامی طرز تربیت میں مخفی ہے اور اسلام کی تعلیمات اور اس کے آداب کی طرف دعوت دینے کا نام ادب ہے، تو یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اسلام اور ادب کوئی دو الگ چیز نہیں ہے، اور ادب دراصل اسلام کی اصطلاح اور اس کی تعبیر ہے۔ اس میں ادب اپنی تمام گوناگوں خصوصیات اور اپنے تمام گوشوں کے ساتھ موجود ہے، چنانچہ اس میں علم وفکر، تہذیب وثقافت، اخلاق وفضائل، خوبصورت اور مؤثر انداز بیان میں زندگی کے حقائق اور کائنات اور انسان کی حیثیت اور اس کے پیغام ومقام کی تشریح، سب کچھ موجود ہے، اس میں فلسفہ وتاریخ کے ساتھ لطیف اور نازک احساسات وجذبات کی عکاسی اور ہر صنف کلام وبیان کو ایک بامقصد انداز کے ساتھ پیش کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، اور کائنات کی ابدی حقیقتوں کو آسمانی ادب اور نبوی اسلوب بیان میں نہایت موثر طریقے اور خوبصورتی کے ساتھ اور انتہائی دلکش اور حسین انداز میں اسلام نے پیش کیا ہے، اس لئے اس ادب کو صرف اسلامی ادب کہنے کے بجائے اگر معجزاتی اور آسمانی ادب کہا جائے تو ذرا بھی اس میں مبالغہ نہیں ہوگا، اسلام کے اس طریقۂ بیان سے پہلے ادب کی اصطلاح غیر معروف تھی، شعر وشاعری اور دیگر فنی مشاغل کو لوگ فن (ART) اور ثقافت کے نام سے جانتے اور یاد کرتے تھے، اگر چہ اس میں صرف کلام ہی کی صنف نہیں، بلکہ دوسرے فنون لطیفہ بھی داخل تھے۔

ادب ایک مستقل فن کی حیثیت سے اسلام کا عطیہ ہے، اہلِ جاہلیت بھی اپنے کلام

کے لئے اس اصطلاح کو نہیں دریافت کر سکتے تھے، اور جب ادب کی اصطلاح اسلامی ادب کے ذریعہ عام ہوئی تو دنیا کی تمام قوموں نے اپنی علمی اور فنی تخلیقات کے لئے جن سے زندگی اور کائنات کی حقیقتوں کی ترجمانی لطیف اور موثر انداز میں کرتے تھے ادب کی اصطلاح کو اختیار کیا اور انگریزی زبان میں اس کے لئے لٹریچر (LITERATURE) کا لفظ اختیار کیا گیا، پھر تمام قدیم فنی تخلیقات اور مہارتوں کو یہاں تک کہ یونانی اور لاطینی خیالات وافکار کو بھی یونانی اور لاطینی ادب کہا جانے لگا، حالانکہ اس سے قبل وہ ان کی ثقافت اور فنون لطیفہ (CULTUR,EFINE ARTS) ی کا ایک جزء تھا۔

اسلامی ادب کی ہمہ گیری

اب یہ بات بڑی حد تک صاف ہو جاتی ہے کہ ادب دراصل خالص مسلمان خاندان میں پیدا ہوا، اور یہ ہر اعتبار سے اسلامی ہے، یہ بنی نوع انسان کے لئے ایک پیغام ہے، اس کا مقصد، زندگی، کائنات اور انسان ہر ایک کی صحیح ترجمانی کرنا ہے، اور انسان کو اپنے مقصد تخلیق سے آگاہ کرنا ہے، اور اس کے لئے دل ودماغ، شعور واحساس، فکر وخیال ہر چیز کو یقین کے سانچے میں ڈھالنا ہے، تاکہ اس کی زندگی صحیح رخ پر پورے اعتماد کے ساتھ چل سکے اور اس کو اپنی منزل مقصود چشم بصیرت سے نظر آنے لگے۔

انسانی سیرت کی تعمیر اسلامی ادب کا خاص مقصد ہے، یہ کائنات میں انسانی زندگی کا کردار متعین کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ کائنات سے اس کا رشتہ کس نوعیت کا ہونا چاہئے؟ اور انسان کا رشتہ انسان سے کس درجہ میں ہونا چاہئے؟ اس کے کیا مراتب ہیں؟ اور وہ کس طرح اپنی زندگی سے دوسرے کو فائدہ پہنچا سکتا ہے اور دنیاوی امور وحالات میں اس کا کیا موقف ہے؟ اس کا تعلق اپنے خالق سے کس حیثیت کا ہے؟ اور وہ کیونکر امن واطمینان کی فضا قائم کر کے دنیا کو آخرت کی تیاری کا مرکز بنا سکتا ہے؟

اسلامی ادب پوری زندگی پر محیط ہے، زندگی اور کائنات میں پیش آنے والے حالات وواقعات پر اس کی گرفت کبھی کمزور نہیں پڑتی، وہ واقعات کا فنی انداز میں تجزیہ کرتا

ہے اور اپنے گرد و پیش کے حالات پر اپنا اثر ڈالتا ہے، اور اپنے پرتو جمال سے فکر و خیال کو صحت بخش غذا فراہم کرتا ہے، اور ہر طرح کے تخریبی عناصر سے ذہن و دماغ کو پاک کرتا ہے، اور ماحول کو اخلاقی و فکری بیماریوں سے برابر پاکیزہ کرتا رہتا ہے، اجتماعی فتنوں کا نہایت حکمت کے ساتھ سد باب کرتا ہے، تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

جب بھی کسی قوم یا معاشرے میں برائیوں نے قدیم جمایا، ظلم و انانیت نے حق و انصاف پر یلغار کی، اور بے ضمیری، استحصال اور نفع اندوزی کی ذہنیت کا غلبہ ہوا تو با مقصد ادب نے اس کے لئے انقلاب کی راہیں ہموار کیں، قوموں کو خواب غفلت سے بیدار کیا، اور فکر و خیال کی تطہیر کے ساتھ حملہ آور طاقت کو صاف کرنے اور اس کو ٹھکانے لگانے کا فریضہ بھی انجام دیا، غلامی کے دور کا خاتمہ کرنے میں اس کا کردار سب سے زیادہ مؤثر اور قابل ذکر رہا، اسلامی تاریخ میں جتنے پُرفتن واقعات پیش آئے ان سب میں اس ادب کا کردار جلی سرخیوں سے لکھے جانے کے قابل ہے، خواہ وہ اعتزال اور خلق قرآن کا فتنہ ہو، یا باطنیہ کی تحریک اور تاتاریوں کی یورش، یا صلیبی جنگوں کے سیاہ بادل ہوں، ہر ایک کا قلع قمع کرنے میں اسلامی ادب نے نہایت یادگار کارنامہ انجام دیا ہے۔

اسلامی ادب کے واضح خط و خال

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا کہ اسلامی ادب اپنی تمام فنی خصوصیات کے ساتھ زندگی کی عکاسی، کائنات کی ترجمانی اور انسان کے موقف کی تشریح کرنے میں درجۂ کمال پر فائز ہے، اس نے ادب کا سچا اور متوازن مزاج قائم کرنے میں سبقت کی ہے، اخلاقی قدروں کی تعیین، فنی عناصر کی شیرازہ بندی اور زندگی کے تمام ظاہری اور باطنی پہلوؤں کی نگرانی اور انسانی جذبات و احساسات کی مکمل رعایت اور ان کی تربیت، افکار و خیالات کی تثقیف و تہذیب اس ادب کا نمایاں وصف ہے، اس ادب کا تصور خاص اسلامی ہے، اور اس کا سرچشمہ عقیدہ اور ایمان ہے، اسی سے اس کو غذا ملتی ہے۔ یہیں سے اس کو جلا حاصل ہوتی ہے اور اسی سرچشمہ کیواں سے اس کو جوش کردار ملتا ہے اور اس پر تقدیر کے راز کھلتے ہیں۔

انسان کی ذات اس کا محور ہے، اس کے تمام حالات اور سرگرمیوں سے وہ پوری طرح وابستہ ہے، وہ صرف اس کی جمالیاتی امنگوں سے تعلق نہیں رکھتا، صرف اس کے نازک جذبات واحساسات، اس کے دلکش اور رنگین خوابوں اور اس کی خوبصورت تمناؤں اور حسین مستقبل کی آرزوؤں کی تصویر کشی نہیں کرتا، بلکہ وہ اس کے اندیشوں، اس کے غموں، اس کے مسائل ومشکلات اور اس کے غیر متوازن اور مذبذب ارادوں سے بھی تعلق رکھتا ہے، وہ اس کی مایوسیوں اور بے کیف مستقبل کے بھیانک تصور سے بھی، اور آخرت کے خوف سے بھی تعلق رکھتا ہے، وہ جس طرح زندگی کے روشن پہلو سے وابستہ ہے، اسی طرح اس کے تاریک پہلوؤں سے بھی اس کا تعلق ہے، وہ منفی اور مثبت ہر طرح کے ذہن کے گرد گھومتا ہے اور اپنا اثر دکھاتا ہے۔

اسی طرح وہ کائنات کی رنگینیوں، اس کے حسن وجمال، اس کی بہاروں اور اس کے دلکش اور پرفریب مناظر سے تعلق رکھنے کے ساتھ، کائنات کی مہیب فضاؤں، اس کے دل دہلانے والے طوفانوں، اس کے دلدوز نغموں، اس میں پیش آنے والے حوادث اور خطرات، صحراؤں کی ہلاکت خیزیوں، سمندروں کی تاریکیوں اور اس کی گہرائیوں، زمین کی وسعتوں اور اس کے زلزلوں، پہاڑوں کی بلند چوٹیوں اور اس پر بسنے والی مخلوقات، اسی طرح آسمان کی فضاؤں اور اس میں اڑنے والے طیور وطائرات، اس میں تیرنے والے اجرام، شمس وقمر اور نجوم وکواکب، بادلوں سے اٹھنے والی گھٹائیں، اور ان سے برسنے والی بارشیں، غرض کہ کائنات کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا اسلامی ادب احاطہ نہ کرتا ہو۔

ایک ایسے ہمہ گیر اور بامقصد ادب کے بارے میں اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کے خط وخال بالکل واضح اور فطری ہیں، اور اس کا سب سے زیادہ نمایاں وصف یہ ہے کہ اس میں اصالت (ORIGINALITY) اپنے مکمل مفہوم کے ساتھ موجود ہے، اور دنیا کے تمام ادب اسی کی بنیاد پر قائم ہوئے ہیں، اور تمام ادبی نظریات اسی سے ماخوذ ہیں، مغربی ادبی نظریات ہوں یا مشرقی ادب کی تحریکیں، ہر ایک اصالت کے اسی وصف سے

خوشہ چینی کر کے اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کرتی ہیں، حالانکہ ان سب کی حیثیت محض مقلد اور خوشہ چیں کی ہے، یہ الگ بات ہے کہ مغرب کے ان ادبی نظریات وتحریکات کے علم برداروں نے اپنی انفرادیت کا سکہ جمانے کے لئے اصلی اسلامی ادبی نظریہ میں مادی نقطہائے نظر کو ایک فلسفہ بنا کر شامل کر دیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دراصل وہی لوگ ادبی نظریات کے موجد اور ادبی تحریکات کے مؤسس ہیں۔

اس کا دوسرا نمایاں وصف فکر ذاتی ہے جب کہ دوسرے تقلیدی ادب کے نظریات مستعار ہیں، اور اسی فکر ذاتی سے وہ اپنے ادبی افکار کو اخذ کرتے ہیں اور اس میں بہت سے غیر فطری اور زندگی کے اقدار سے متصادم خیالات کو داخل کر کے ان کو ایک مستقل اور جدید نظریئے کی حیثیت سے پیش کر دیتے ہیں، یہ اسلامی ادب ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ عقل وشعور، ذوق ووجدان کو اصالتِ فکر اور استقلال ذات کی مستحکم بنیاد پر قائم کر کے انسان کو فطرت انسانی سے پوری طرح ہم آہنگ ادب عطا کرتا ہے۔

ادب اسلامی کے عناصر ترکیبی

جب بھی زندگی یا کائنات کے کسی مفہوم کو لے کر اسے مؤثر، دلکش اور رقیق (دل گداز) انداز میں بیان کریں گے، بایں طور کہ وہ طرز تکلم جذبات واحساسات کی ترجمانی کرے اور مخاطب کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لے تو وہ ادب، فنی حیثیت سے کامیاب سمجھا جائے گا، اور جب مقصد پاکیزہ ہو، اور اس سے اچھے اخلاق یا مثبت اقدار کی دعوت دی جارہی ہو تو وہ ایک کامیاب اور بامقصد ادب ہوگا، اسلامی ادب کے اجزائے ترکیبی میں سب سے پہلے جو چیز ملحوظ ہوتی ہے وہ پاکیزہ خیال اور بامقصد فکر ہے، اس کے بغیر ہم اپنے ادب سے صحیح تصویر کشی نہیں کر سکتے اور جو تصور ہم پیش کرنا چاہیں گے اس کو واضح کرنا دشوار ہوگا۔

دوسرا عنصر شعور ووجدان ہے، یہ ایک اہم بنیادی عنصر ہے، اس سے ادب کو دلکشی اور جاذبیت کے ساتھ پختگی اور زندگی عطا ہوتی ہے، اس کے بغیر ادب کا تصور ناممکن ہے، جو کلام اس وصف سے عاری ہو وہ ایک علمی حقیقت کہلانے کا زیادہ حقدار ہوگا اور اس کو ادب کی صف

میں رکھنا بڑی بے ادبی کی بات سمجھی جائے گی، کسی عبارت کو آپ پڑھتے ہیں خواہ وہ نثر ہو یا نظم، اگر اس سے وجدان اور شعوری کی تسکین ہوتی ہے تو اسے ادب کے درجہ میں بدرجۂ اول رکھیں گے، لیکن خالص عملی اور فکری حقائق شعور و وجدان پر اثر انداز ہونے کے بجائے صرف عقل کو متاثر رکھتے ہیں، اگرچہ بہت سی تحریریں ایسی بھی ہوتی ہیں جن سے عقل و وجدان دونوں ہی مستفید ہوتے ہیں تو ان کو علم و ادب کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس موقع پر یہ بات نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ شعور و وجدان کا تعلق خود ادیب سے ہے، اگر اس کی قوت وجدانیہ خود کمزور ہے یا اس کا شعور نازک اور سریع الانفعال نہیں ہے تو اس کے ادب میں یہ عنصر کمزور رہے گا اور اسی حد تک اس کے کلام کی تاثیر اور اس کی طاقت میں بھی کمی واقع ہوگی۔

الفاظ کا عنصر ادب کا جسد خاکی ہے، اس میں حقیقت کی روح پھونکنے کے لئے معانی کا استحضار اور اس کی ذہنی اور فکری ترتیب ضروری ہے، اب سوال یہ ہے کہ پہلے ڈھانچہ تیار کر کے پھر اس میں روح ڈالی جائے گی، یا روح کی حقیقت اور معانی کی ترتیب ذہن میں پہلے سے تیار رہے گی اور وہ الفاظ کے سانچے میں ڈھلتی رہے گی۔

اہل بلاغت کہتے ہیں کہ معانی کی ترتیب اور اس کا استحضار ذہن میں پہلے سے ہونا ضروری ہے، اسی کے لحاظ سے الفاظ از خود معانی کی ترجمانی کریں گے، اور وہ کلام کے سانچے میں ڈھلتے چلے جائیں گے، ادیب کا کمال یہ ہے کہ وہ الفاظ کا انتخاب معانی کے مطابق کرتا ہے، اور نہایت خوبصورت پیرایۂ بیان اور دلکش اسلوب میں اسے مخاطب کے سامنے پیش کر دیتا ہے، اس کا یہ طرز ادا اس قدر مؤثر، اس کے خیالات اتنے نازک اور شفاف ہوتے ہیں کہ براہِ راست مخاطب کا وجدان اس کو قبول کرتا چلا جاتا ہے اور جس حقیقت کو ادیب نے اپنے فن کا سہارا لے کر پیش کیا ہے وہ اس کا بے تکلف اور بلا تاخیر ادراک کر لیتا ہے۔

اسلامی ادب کی تقلید

میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی ادب کے یہ اجزائے ترکیبی اسی نظریہ کا عطیہ ہے اور اس کی تقلید کم و بیش دنیا کے تمام آداب کو کرنی پڑی، کوئی ادب ان عناصر سے بے پروا ہو کر

کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا، اسی لئے کہ ادب بحیثیت ادب اس بنیادی ترکیب سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا، جولوگ ادب برائے ادب کے قائل ہیں وہ بھی ان عناصر کو اپنے ادب کے لئے ضروری سمجھتے ہیں ان کا مقصد خواہ جو بھی ہو، اور وہ کتنا ہی وقتی اور عارضی کیوں نہ ہو، لیکن ادب کہلانے اور ادبی حیثیت سے اسے پیش کرنے کے لئے اسلامی ادب کے اجزائے ترکیبی کی تقلید ناگزیر ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ ان عناصر میں پاکیزگی کے تصور اور مقصدیت کی روح کو بنیاد پرستی یا فکری جمود سے تعبیر کرتے ہیں۔

مغرب کی مادہ پرستانہ زندگی اور مادی تہذیب کے نتیجہ میں جتنے ادبی نظریئے ظہور پذیر ہوئے، بنیادی اعتبار سے اسلامی ادب کے نظریہ سے ماخوذ ہیں، فرق یہ کیا گیا ہے کہ ان نظریات کو کہیں جنس و جمال کے نقطہ پر مرکوز کیا گیا، اور کہیں جذبات واحساسات کو جمالیات کا لبادہ اڑھا کر اس کو ادب کا نام دیا گیا ہے، اور کہیں عقل وفلسفہ کے رخ پر ادب کا غازہ مل کر خدا و آخرت کا انکار کیا گیا ہے، اور انسان کو صرف ایک مادی اور وجودی جانور قرار دے کر اسے عیش کوشی کی کھلے عام دعوت دی گئی ہے۔ ع

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اسلامی ادب میں التزام (وابستگی) کا مسئلہ

اسلامی ادب خالص اسلامی بنیادوں پر قائم ہے اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ ادب کا فنی تصور بھی اسلامی تعلیمات اور سرچشمۂ رشد وہدایت، کتاب وسنت کا خاص عطیہ ہے، ادب ایک عربی لفظ ہے، اس کا لغوی مفہوم تو اسلام سے پہلے بھی موجود تھا، لیکن ظہور اسلام کے بعد چونکہ اسلام نے زندگی کے تمام آداب سکھائے اور ہر جزء وکل کو اس کے تابع کیا، نیز زندگی، کائنات اور انسان کی تعبیر پوری وضاحت کے ساتھ نہایت خوبصورت اور دلکش انداز میں کی اور ہر ایک کا موقف، اس کا مشغلہ اور اس کے مقام کو متعین کیا، اس کا اسلوب، فن وجمال کی تمام خوبیوں سے آراستہ تھا۔ اس کے عناصر ترکیبی ہر اعتبار سے نہایت مکمل اور متوازن تھے، اس لئے وہ فنی ادب کا بہترین نمونہ ہے، اور اس کی بنیاد پر ادب کی خوبصورت

عمارت قائم ہے۔

بنابریں اسلامی ادب ہی دراصل دنیا کے تمام آداب اور اس کے لٹریچر کا مبدأ ہے۔ اس سے پہلے کسی زبان میں ادب یا اس کے ہم معنی کسی لفظ کا تصور موجود نہیں تھا۔ یونانی اور رومن ادب بھی ثقافت اور فن یعنی کلچر اور آرٹ یا فنون لطیفہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، یہاں تک کہ اسلام، ادب عالی کے عظیم ترین تحفہ کے ساتھ طلوع ہوا۔ اور اس کے بعد سے ادب کے ہم معنی الفاظ اور اصطلاحیں تمام زبانوں میں رائج ہوئیں، چنانچہ انگریزی اور فرانسیسی زبان میں لٹریچر (LITERATURE) کا لفظ اسلامی ادب کے دریافت ہونے کے بعد رائج ہوا، یہ اصلاً لاطینی (LITERA) سے مشتق ہے، اور اسی طرح جرمن اور روسی اور دیگر تمام زبانوں میں ادب کے ہم معنی الفاظ رواج پذیر ہوئے۔

اس مختصر تفصیل کے بعد یہ کہنا ذرا بھی دشوار نہیں ہے کہ اسلامی ادب بذات خود ادب ملتزم ہے، یعنی اعلیٰ اخلاقی قدروں پر مبنی اور اس سے وابستہ ہے، بلکہ خود لفظ ادب اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ لیکن زندگی اور کائنات کے صحیح تصور کو ختم کرنے اور اس کے بلند مفہوم اور مرتبہ کو گھٹانے اور اس میں خلط ملط پیدا کرنے کی کوششیں اسلام مخالف طاقتوں اور مادہ پرست قوموں کی طرف سے ہوئیں، اسی طرح ادب کو ایک عام انسانی نظریہ قرار دے کر اس کو اپنے صحیح اور فطری مفہوم سے الگ کرنے اور اسلام سے جو اس کا براہ راست رشتہ تھا، اس کو کاٹنے کی کوششیں کی گئیں، اور فلسفۂ ادب کی خوبصورت اصطلاح کے پردے میں اس کو اسلامی روح سے الگ کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ ادب ایک بدنام اصطلاح ہوگئی، اور عام لوگ اس کا مقصد محض زبان کی چاشنی تک محدود رکھنے لگے، اور اسے تفریح طبع کا ذریعہ سمجھنے لگے خود مسلمانوں کے مذہبی طبقے میں ادب ایک غیر ضروری اور بے مقصد فن کا نام ہوگیا اور اس سے اشتغال رکھنے والوں کو دنیا سے قریب اور دین سے دور تصور کیا جانے لگا۔

مغربی فنکاروں کی یہ بڑی کامیابی تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کے ذہن میں ادب کا یہ غلط مفہوم داخل کر دیا، اور اس کو مذہب سے الگ تھلگ محض دنیاوی شہرت حاصل کرنے

اور دنیا کمانے کا فن باور کرایا۔ اس کامیابی کی جڑیں زیادہ مضبوط اور گہری کرنے کے لئے انہوں نے ادب کو مختلف مادی نظریات میں تقسیم کر دیا۔ اور تنقیدی ادب کو ایک مستقل فلسفہ کی شکل دے کر اور اس کے فرضی اصول وضوابط بنا کر تعلیم یافتہ طبقہ کو مسحور کر لیا، پھر ادب اور تنقید کے متعدد مکتب فکر قائم ہوئے، اور اسلام سے اس کو اس حد تک دور رکھا گیا کہ اسلامی ادب کا نام لینا ایک مضحکہ خیز بات ہوگئی اور اسلام کی طرف اس کی نسبت کرنا تو جرم کی حد تک ایک نازیبا حرکت سمجھی جانے لگی۔ ادب کے بارے میں اس تصور کو مستحکم کرنے کے لئے اہل مغرب نے جو مادی نظریئے قائم کئے اور ان کی نشر واشاعت پر جو طاقت صرف ہوئی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب تک ادب کے بے شمار نظریئے، تحریکیں اور مکاتب فکر قائم ہو چکے ہیں اور برابر ان فلسفیانہ نقطہائے نظر کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ادب کے نام پر ضلالت، مذہب بیزاری عام کی جا رہی ہے، اور حیات وکائنات کو محض وقتی لذت اندوزی کا ایک ذریعہ قرار دینے کی کوششیں مسلسل اور تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہیں۔

کچھ مغرب کے ادبی نظریات کے بارے میں

فلاسفۂ ادب، عام حالات میں ادب کی دو بنیادی قسمیں قرار دیتے ہیں، ایک تشبیہی اور مثالیاتی ادب، جس کا مقصد ادب برائے ادب ہوتا ہے، اس کو تجریدی ادب بھی کہتے ہیں، دوسرا واقعاتی ادب، یہ واقعات اور حقائق کی تعبیر وترجمانی کا فرض انجام دیتا ہے، اس کو تجسیدی ادب کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں، لیکن اس کے حدود مادی دنیا کے آگے نہیں ہیں اور نہ یہ بلند اور غیر محسوس واقعات کو خاطر میں لاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ تجریدی ادب ایک موہوم تخیل ہے، واقعات کی دنیا میں اس کا باقی رہنا زیادہ قرین قیاس نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ اس وقت اکثر ادبی نظریئے مادی اور محسوس واقعات کی بنیاد پر ہی قائم ہیں۔

کلاسیکی ادب

یوں تو لغت میں کلاسیکل (CLASSICAL) کے معنی بلند اور معیاری کے ہیں،

ایچ ،ایل،لوکس(H.L LUCUS) کا کہنا ہے کہ یہ لفظ لاطینی لفظ کلاسس(CLASSES) سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہجوم کے ہیں، رومن شہنشاہ ٹولیس(KING TULIUS) کے زمانے میں فوج کے بہترین اور مرصع دستے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ساتویں صدی عیسوی میں یہ لفظ اعلیٰ اور معیاری درجہ کے ادباء کے لئے استعمال ہوا،اس زمانہ میں کلاسیک سے یونانی اور رومن تصانیف مراد لی گئیں، بعد میں لاطینی زبان کی کتابیں معیاری ادب میں شمار ہونے لگیں، اور اس کا نام کلاسیکی ادب پڑ گیا، اور اس اصطلاح کا استعمال محدود مفہوم سے نکل کر ادب کے اعلیٰ اور معیاری نمونوں کے لئے ہونے لگا، اور کلاسیکی ادب کے نمائندوں کو دوسرے ادبی نظریات کے نمائندوں پر فوقیت دینے کی کوشش ہونے لگی۔

شروع میں یہ ادبی نظریہ کسی حد تک قابل تعریف تھا اور ثقافت کا معیار بلند کرنے میں اس نے نمایاں خدمات انجام دیں، اگر چہ اس میں قدامت پرستی تقدس کی حد تک موجود تھی اور کلاسیکی ادب کے نمائندوں کو معصوم عن الخطأ قرار دیا جاتا تھا۔ انہوں نے ادب وفن کے خود ساختہ کچھ متعین پیمانے بنائے تھے جو ادب اس پیمانہ پر پورا نہیں اترتا تھا وہ مسترد کر دیا جاتا تھا، کلاسیکی ادب کا موضوع قدیم یونانی اور رومن ہے، قدامت پرستی اور جمود اس ادب کا خاص امتیاز ہے۔ یہ صرف مادی اور محسوس اشیاء کو قابل عمل سمجھتا ہے، غیر محسوس اور روحانی تصورات کا انکار کرتا ہے، یہ صرف تمدنی اور تہذیبی حالات سے بحث کرتا ہے، غیر متمدن اور نیچرل چیزوں سے اعراض کرتا ہے، یہ ادب صرف ظاہری حسن و جمال اور ظاہری ہیئت کو قابل اعتناء قرار دیتا ہے، اندرون قالب کیا چیز ہے؟ س کو نا قابلِ التفات تصور کرتا ہے، اور سب سے اہم اور نفرت انگیز پہلو اس ادب کا یہ ہے کہ اس میں سچائی، بے تکلفی اور فطرت کی ترجمانی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں کلاسیکی ادب تکلف و تصنع اور مبالغہ آرائی اور حقیقت سے بہت دور ایک ذہنی عیاشی کے ہم معنی ہے، اس ادب کے قدیم مثالی نمائندے یہ لوگ ہیں، ہیومر(HOMERE) ورجلیوس اور ہورس(HORACE) جو شخص ان کے ادب سے جتنا قریب ہوگا، اسی قدر وہ ان کے نزدیک قابل ترجیح وتعریف ہوگا۔

رومانٹیکی (رومانی) ادب (ROMANTICISM)

کلاسیکی ادب ایک غیر فطری اور ناقابل عمل معیار پیش کرتا تھا۔ اس لئے اس کو بعد میں آنے والی نسلوں نے مسترد کرنے کی کوشش کی، اور اس کے ردعمل کے طور پر انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں رومانٹیکی ادب (ROMANTICISM) یعنی آزاد ادب کا ظہور ہوا۔ اس کا سب سے پہلا مقصد یہ تھا کہ کلاسیکی ادب کی عائد کی ہوئی قدیم عقلی بندشوں اور پابندیوں کو ختم کر کے ادب کو جذبات وخیالات کی ترجمانی کا ذریعہ تصور کیا جائے اور نئے فنی اصول وضوابط سے اسے وابستہ کیا جائے، تاکہ ادیب آزادی کے ساتھ اپنا فنی عمل جاری رکھ سکے، اور احساسات وجذبات کی ترجمانی دلکش، مؤثر اور خوبصورت انداز سے کر سکے اور تمدن کی گھٹی ہوئی فضا سے نکل کر طبعی اور دیہات کے فطری ماحول میں اپنی ادبی سرگرمیوں کو انجام دے سکے۔

اس ادب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ جذبات وخیالات کی عکاسی کرتا ہے، لیکن شعور وجدان کی بندشوں سے بالکل آزاد ہو کر، اور عملی دنیا سے فرار اختیار کر کے، اس ادب میں انقلابی روح کارفرما ہوتی ہے اور فکر وخیال کی آزادی اس کا امتیازی نشان ہے، اس لئے کہ تخیلاتی دنیا اس ادب کا خاص محور ہے، اور یہ فرضی تصورات میں اپنی قوت ابداعیہ کو صرف کرتا ہے، اس ادبی نظرے کے خاص نمائندے روسو (ROUSSEAU) اور لامارٹائن (LAMARTINE) سمجھے جاتے ہیں۔

اس نظریئے کا ردعمل محسوس اور سفلی واقعات پرستی کی شکل میں واقعاتی ادب تھا اور رومانٹیکی ادب کے برعکس اس ادب کے ماننے والوں اور اس کو ایجاد کرنے والوں نے زندگی اور کائنات کی حقیقت کو محسوس اور مادی واقعات میں تجربہ کی بنیاد پر تلاش کرنے کی کوشش کی۔

رمزیت کا نظریہ (SYMBOLISM)

انیسویں صدی عیسوی کے اخیر میں شعری ادب میں رمزیت کا نظریہ سامنے آیا،

یہ بھی دراصل واقعاتی ادب کے جواب میں قائم ہوا۔اس کا مقصد بظاہر ادب وشعر میں نئے اسلوب کی تلاش تھا۔لیکن حقیقت میں یہ نقطۂ نظر ادب میں عوامی یا عامیانہ طرز فکر پھیلنے کے خلاف ردعمل تھا،اور یہ عیش پرست طبقے کی طرف سے ڈیموکریسی کے تصور کی مخالفت تھی،اس طبقہ میں شاعروں کی بڑی کثرت تھی،انہوں نے رمزیت کے نام سے ایک پرشور موسیقی شعری ادب میں داخل کرنے اور اس کو اپنی خاص زندگی اور معاشرہ پر منطبق کرنے کی کوشش کی،ان کے نزدیک دنیا محض نغمہ وجمال،عشق ومستی کا نام تھا اور یہ بات ان کو اسی نوع کی شاعری اور ادب میں مل سکتی تھی۔اس رمزی ادب اور شاعری کے خاص نمائندے ورلاین (VERLINE) اور مالارم (MALLARME) اور بادلر (BAUDELAIRE) شمار کئے جاتے ہیں۔

سُر یالزم (SURREALISME):

لیکن رمزیت کا یہ نظریہ بھی اپنی خاص کیفیت اور مزاج اور محدود طبقے کی نمائندگی کے باعث کامیاب نہ ہوسکا اور اس کے ردعمل کے طور پر سر یالزم (SURREALISME) کا نظریہ شعری ادب میں بیسویں صدی کے نصف میں ظاہر ہوا۔یہ ایک خالص نفسیاتی نقطۂ نظر تھا۔اس کے معنی ہیں:حقیقت سے ماوراء ایک دوسری حقیقت۔اس کا مقصد لاشعور میں چھپے ہوئے حقائق کی ترجمانی ہے،یعنی عقل کی کسی قسم کی فنی اور اخلاقی رکاوٹ کے بغیر لاشعور اپنے اندرونی خیالات واحساسات کا اظہار کرسکے،۱۹۲۴ء میں انڈرے برٹیان (ANDREBRETOAN) نے اس ادبی نظریئے کا منشور شائع کیا،اس میں اخلاقی روایات سے مکمل انحراف کرکے ایک نت نئے ادب کی تخلیق اس کا مقصد بتایا گیا،لیکن یہ نظریہ غیر فطری ہونے کی وجہ سے قائم نہ رہ سکا۔

وجودی ادب کا نظریہ

سب سے زیادہ جس فکری رجحان نے جدید ادب کو متاثر کیا،وہ وجودی فلسفہ (EXISTENTLISM) ہے،اس فلسفہ کی جڑیں بہت گہری اور قدیم ہیں،لیکن جان پول

سارتر نے بیسویں صدی کے وسط میں اس فلسفہ کو ادب کا جامہ پہنایا، اور انسان کو ایک مستقل بالذات وجود تسلیم کیا، اور اس کو ہر طرح کے اختیارات سے نوازا، اور مطلق انفرادیت کا نظریہ عام کیا، انیسویں صدی میں ڈنمارک کے کیرکیجارڈ (KIERKEGAARD) نے وجود انسانی کی علت بتاتے ہوئے یہ باور کرانے کی کوشش کہ انسانی وجود ایک مستقل بالذات شے ہے۔ انسان خود اس وجود کا خالق ہے اور اس کو ہر عمل کا پورا اختیار حاصل ہے، اس الحادی فلسفہ سے نہ صرف عقلی طور پر لوگ متاثر ہوئے، بلکہ اس نے ادب پر بھی پورا اثر ڈالا، اور غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ جس زمانے میں یہ نظریہ رائج ہوا، وہ ذہنی کشمکش اور فکری اضطراب کا دور تھا اور ادبی میدان میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا تھا جس کا پر کرنا ضروری تھا۔

اس وجودی نظریئے کی مقبولیت اس وجہ سے اور زیادہ ہوئی کہ اخلاقی اقدار اور ضمیر انسانی سے بے نیاز ہو کر خواہشات نفس کے لئے اس نے لگام بالکل ڈھیلی کر دی اور خدا کا تصور ذہنوں سے قطعاً نکال دیا۔ اس لئے کہ خدا کے یقین کے ساتھ انسان اپنے وجود کو آزاد نہیں کرا سکتا۔ اسی طرح اخلاقی نظام کے ماننے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی آزادی کو اخلاقی بندشوں سے مقید کر دیا جائے۔ سارتر کا خیال ہے کہ انسان میں اخلاقی گراوٹ یا برائی اور پستی کا بذات خود کوئی وجود نہیں ہے، بلکہ یہ چیزیں محض اضافی ہیں، ہم دوسروں کو دیکھ کر اس طرح کا خیال ظاہر کرتے ہیں، اس لئے ہمیں خود اپنے وجود سے تعلق رکھنا چاہئے اور دوسروں کو دیکھ کر کوئی رائے قائم کرنا جرم سمجھنا چاہئے، اسی طرح دوسروں کا احترام کرنا یا کسی خاص اخلاقی اصول کا پابند ہونا اپنی آزادی اور اپنی شخصیت کو نقصان پہنچانے کے مرادف ہے۔

وجودیت کا یہ نقطۂ نظر دراصل جھنجھلاہٹ، غصہ، ناکامی، نفرت وحسرت اور رنج والم کا نتیجہ ہے اور اس احساس کا ثمرہ ہے کہ انسان خود اپنے وجود کی ترجمانی اپنی خواہش کے مطابق نہیں کر سکتا، اور ماحول، حالات، سوسائٹی اور خاندان کی روایات اور بندشیں اس کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں، سارتر کے اس وجودی نظریئے کا ایک بڑا سبب دو عالمگیر جنگیں ہیں، ان کی تباہی کے آثار اس فلسفی کے فکر پر اس طرح پڑے کہ وہ ردعمل کے طور پر اس منفی

نظریئے کو وجودیت کی شکل میں پیش کرنے لگا، بلکہ نظر حقیقت سے دیکھئے تو یہ ایک زبردست احساس کمتری کا ردعمل اور نتیجہ ہے، دوسری عالمگیر جنگ میں اس کو جرمنی میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے پورے ایک سال تک رہنا پڑا تھا اور اسی عرصہ کے دوران اس کے ذہن وفکر میں بغاوت ونفرت اور ناکامی وغصہ کا ایک ایسا شدید طوفان برپا ہوا کہ اس نے وجودیت جیسے بے سروپا نظریئے کے پھیلانے میں اپنی پوری طاقت مرکوز کردی، اور وجودی ادب کے نام پر اس نے الحاد وبداخلاقی اور زندگی کو ہر طرح کی انسانی بندش سے آزاد کرانے میں زبردست رول ادا کیا۔

اس نظریئے کے علمبرداروں میں انیسویں صدی عیسوی کے فرانسیسی مفکر (یہ سارتر کے پیش رو ہیں) مارسیل (MARCEL) اور جان پول سارتر، اندرجید، البیر کامو اور ہیڈجر، خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مارسیل اپنے خیالات میں کسی حد تک معتدل تھا اور وہ سرے سے اخلاقی اور انسانی قدروں کا انکار نہیں کرتا تھا تاہم اس کی انتہا بھی الحاد ہی ہے، اور انسانی وجود کو مادیت کے گھناؤنے فضلات سے ملوث کرنے میں اس نے بھی خاص کردار ادا کیا ہے۔

پرناسی ادب (PARNASSIANISM)

رمزی اور رومانی نظریۂ ادب کے خلاف انیسویں صدی عیسوی میں دو فرانسیسی شاعر (لیکونت دی لیسلے (LECONTEDELISLE) اور تیوفل جوتیر (THEOPHLGAUTIER) میدان میں آئے اور انہوں نے پرناسی ادب کے نام سے ایک ادبی نقطۂ نظر ایجاد کیا، یہ دراصل ادب میں جذباتیت کے خلاف ایک ردعمل تھا۔

وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اہل یونان کے باطل خداؤں میں ایک شاعری کا دیوتا تھا جس کا نام اپالو (APOLLO) تھا، ان کے نزدیک فن شاعری کے اس معبود کا مرکز پرناس (PARNASS) پہاڑ کے اوپر تھا، انیسویں صدی کے مادہ پرست مغربی شاعروں نے اپنی شاعری کو فنی تقدس کا رنگ دینے کے لئے اس کی نسبت اس پہاڑ کی طرف کرکے اس کا نام

پرناسی ازم (PARNASSIANISM) رکھا، اور اسے ایک مستقل ادبی نظریئے کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ادب وشاعری محض تفریح طبع کا ایک ذریعہ ہے، اور اس کا کوئی تعمیری مقصد نہیں ہے، اس نظریہ کا نام ادب برائے ادب رکھا گیا، بعض لوگوں نے اس کو اپالو کا نظریۂ ادب کے نام سے موسوم کیا، اسی کو پرناسی ادب بھی کہتے ہیں۔

جدیدیت کا نظریہ (Modernize)

ادب میں جدیدیت کا رجحان جس کو عربی میں (حداثۃ) کہتے ہیں، انیسویں صدی کے اخیر میں اس کے ساتویں یا آٹھویں دہے میں سب سے پہلے پیرس میں دریافت ہوا، اور اغلب یہ ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے ربع اول میں اس رجحان کی ابتداء یورپ سے ہوئی اور یہ دراصل یونانی علم الاصنام کے تصور کا نتیجہ ہے، جس کو مغربی تہذیب کی تجدد پسندی کے ساتھ ضم کر دیا گیا اور مکمل آزادروی کی روش اس کا طرۂ امتیاز قرار پائی، ادب کے ذریعہ مغربی تہذیب کے تجدد پسندانہ تصور کو اور مکمل خود اختیاری اور آزادی کے ذہن کو انسانی معاشرہ پر اور خصوصاً نئی نسل کے ذہن پر مسلط کرنے کی کوشش اس کے ذریعہ کی گئی، جدیدیت کے اس ادبی رجحان میں سب سے زیادہ جنسی آزادی پر زور دیا گیا اور اس کو بلا روک ٹوک ہر نوجوان مرد وعورت کا حق بتایا گیا، اس نظریہ کے مطابق مذاہب نے اس راہ میں جو قید و بند اور اخلاقی بندشیں قائم کر دی ہیں وہ انسان کو اس کے حق آزادی سے محروم کرنے کی ایک زبردست سازش ہے، اس بنا پر مذہب کو انسان کی تمام سرگرمیوں سے علاحدہ رکھنا ادب میں جدیدیت کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔

جدیدیت کا خاص مقصد

جدیدیت کا سب سے بڑا بنیادی مقصد اخلاقی پابندیوں کو ہٹانا اور شرم وحیا کے تصور کو دلوں سے محو کرنا ہے، اور انسان کو فطری طریقۂ زندگی کی شاہراہ سے ہٹا کر خواہشات

نفس اور ہوس پرستی کی بھول بھلیوں میں گم کر دینا اس کا اولین شعار ہے۔

ادب میں جدیدیت کا یہی رجحان یورپ کے مختلف ملکوں میں بہت مقبول ہوا۔

جدیدیت کے نام پر اباحیت

مغربی تہذیب کے زیر سایہ جن لوگوں نے تربیت پائی اور وہ لذت کوشی اور اباحیت پسندی کی تمام سرحدوں کو پار کر گئے، ان کی تعداد ہمیشہ بہت زیادہ رہی ہے، وہ اپنی ہوس رانی کو جائز قرار دینے کے لئے کوئی ایسا سہارا چاہتے تھے جس سے ان کو اپنی غیر اخلاقی سرگرمیوں کو جاری رکھنے میں مدد ملے اور اس کے لئے ان کو کوئی ادبی سند مل جائے، تاکہ ادب کا نام لے کر ہر طرح کی آزادی اور بے حیائی کو جاری رکھ سکیں۔

اس زمرہ میں ہر طبقے کے لوگ شریک تھے، اور زندگی کی تمام شاخوں سے تعلق رکھنے والے اہل ثروت و وجاہت، تاجر اور صنعت کار، سیاستداں اور دانشور، سبھی کی نمائندگی پائی گئی، ظاہر ہے کہ یہ لوگ اگر اپنی نفسانی اور حیوانی خواہشات کو پوری کرنے کے لئے کسی ادبی تصور یا فنون لطیفہ جیسی کسی بھاری بھرکم اصطلاح کو نہ اپناتے تو وہ قانون کے سامنے جواب دہ ہوتے، اور انسانیت کی تصویر مسخ کرنے کا ان پر الزام آجاتا، اس خطرہ کو ٹالنے اور آزادی کے نام پر تمام اخلاقی قدروں کو پامال کرنے کے لئے انہوں نے ادب میں جدیدیت کے نام سے ایک نئے ادبی رجحان کے تصور کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا اور ادب وفن کی دنیا میں ایک انقلاب کے علم بردار قرار پائے۔

اس حد تک ادب کے بارے میں کچھ مادی نظریات کا ذکر آیا۔ اس کے علاوہ ابھی اور بہت سے نظریئے اور طرز فکر ادب کے سلسلہ میں موجود ہیں اور برابر ان میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ادب کے نام پر یہ ساری کوششیں صرف اسلام کے لائے ہوئے ادب اور اس کی قدروں کو ختم کرنے کی ایک گہری سازش ہے، اس سازش کا شکار خود مسلمان ادباء اور مفکرین ہو رہے ہیں اور ان تخریبی کوششوں کو کامیاب بنانے میں ان کی زبردست مدد کر رہے ہیں۔

مضمون کے مراجع

۱	النقد الأدبی	ڈاکٹر احمد امین
۲	الأدب وفنونہ	ڈاکٹر عزالدین اسماعیل
۳	// //	ڈاکٹر محمد مندور
۴	لسان العرب	ابن منظور
۵	تاریخ الأدب العربی	احمد حسن زیات
۶	النقد الادبی الحدیث	ڈاکٹر محمد غنیمی ہلال
۷	کتاب الصناعتین	ابو ہلال عسکری
۸	دلائل الاعجاز	عبدلقاہر الجرجانی
۹	فجر الاسلام	ڈاکٹر احمد امین
۱۰	قضایا أدبیۃ	ڈاکٹر عبدالباسط بدر
۱۱	مذاہب الأدب الغربی	// //
۱۲	مبادئ النقد الادبی	محمد غنیمی ہلال
۱۳	نقوش اقبال	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ
۱۴	مجلدات البعث الاسلامی	عربی ماہنامہ ندوۃ العلماء لکھنؤ
۱۵	ثورۃ الأدب	محمد حسین ہیکل
۱۶	الأدب الاسلامی	دکتور عدنان رضا النحوی
۱۷	فرانسیسی ادب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں

عربی اور اردو میں نعتیہ شاعری

چند مثالیں

اردو زبان وادب میں نعتیہ شاعری کا فن زمانی اعتبار سے بہت بعد میں ظہور پذیر ہوا، اس لئے کہ فارسی زبان میں نعت گوئی کی صنف کا زمانہ بہت مقدم ہے، نعت گوئی کی صنف عربی نعتیہ شاعری کے نتیجے میں فارسی شاعری کی دنیا میں مقبول ہوئی. اور پھر اردو شعراء نے اسے مرکز توجہ بنایا۔ مدحیہ شاعری میں جن عربی شعراء کو سبقت حاصل ہے ان میں سیدنا حسان بن ثابت، کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحہ اور اخیر میں کعب بن زہیر رضی اللہ عنہم کا نام لیا جاسکتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ نعتیہ شاعری کا وجود انہیں کا مرہون منت ہے اوران کی مابعد الاسلام کی شاعری رسول اللہ ﷺ کی منقبت اورفضائل وصفات عالیہ کی ترجمانی کے لئے شہرت رکھتی ہے، کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے غزوۂ طائف کے موقع پر دشمنوں کو مخاطب کر کے کہا تھا:

نطيع نبينا ونطيع رباً　　هو الرحمن كان بنا رؤوفاً
رشيد الأمر ذو حكم وعلم　　وحلم لم يكن نزقاً خفيفاً

(ہم اپنے نبی کے فرمانبردار ہیں اور الرب الرحمٰن کی اطاعت کرتے ہیں جو ہمارے لئے بہت مہربان ہے وہ ہدایت یافتہ علم وحلم سے متصف فیصلہ صحیح کرنے والے تھے اور جلد طیش میں آنے والے نہیں تھے)

اور حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا یہ مشہور شعر......

فان أبي ووالده وعرضي　　لعرض محمد منكم وقاء

(میرے آباء واجداد اور میری عزت وآبرو سب کچھ محمد ﷺ کی عزت کو بچانے کے لئے وقف ہیں)۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ کی نعتیہ شاعری میں یہ دو شعر مشہور ہیں۔

لو لم تكن فيه آيات مبينة

كانت بديهته تنبيك بالخبر

فثبت الله ماآتاك من حسن

قفوت عيسى باذن الله والقدر

(اگر آپ کی ذات اقدس میں نمایاں علامات نبوت نہ ہوتیں تب بھی آپ کی پہلی زیارت خوابیدہ حقیقت عدل پر شاہد عدل ہوتی، اللہ تعالیٰ نے آپ کے حسن وجمال کو لازوال بنایا ہے، آپ اللہ کے حکم وفیصلہ کے مطابق حضرت عیسیٰ کی فرمودہ نشانیوں کے مصداق ہیں)۔

کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ نے اپنے مشہور قصیدۂ بردہ میں حضور ﷺ کی منقبت بیان کرتے ہوئے یہ کہا کہ۔

ان الرسول لنور يستضاء به

مهند من سيوف الله مسلول

(رسول اللہ ﷺ کی مثال ایک نور کی ہے، جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے، اسی طرح وہ اللہ کی تلوار ہیں جو نیام سے باہر ہے اور ''ماہر صنعت ہند'' کی تلواروں کی مثال ہے)

یہی وجہ ہے کہ نعتیہ شاعری دراصل جزء ایمان ہے، اور جذبۂ محبت کی پاکیزگی کا نشان ہے، یہ دولت ہر شاعر کے حصے میں نہیں آتی، رسول پاک ﷺ کی مبارک ہستی سے عشق کے چشمے اسی وقت اُبلتے ہیں جب دل کی گہرائیوں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت پیوست ہو جاتی ہے اور اس کی وسعتوں کے سامنے عشق ومحبت کی تمام شکلیں بے قیمت بن کر رہ جاتی ہیں، لیکن اس کے اثرات اس قدر پختہ اور اس کے نقوش اتنے گہرے ہوتے

ہیں کہ زندگی کی تمام سرگرمیاں اسی کی رہین منت ہوجاتی ہیں اور جادۂ محبت کے حسین حصار سے کسی حال میں نکلنا نہ صرف یہ کہ ناممکن ہوجاتا ہے، بلکہ اس میں مزید طاقت اور پختگی فکر ونظر کا ظہور ہوتا ہے اور پورا عالم محبت کی لذت وچاشنی کے لطف سے بہرہ اندوز ہوکر منارۂ عشق ومحبت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

اردو کے اساطین شعراء عصر کا شمار مکتب شاعری کے معتبر اساتذہ میں ہوتا ہے، وہ دیگر اصناف سخن میں اپنی امتیازی حیثیت کے ساتھ فن نعت گوئی میں بھی بہت اونچا مقام رکھتے ہیں، مرزا غالبؔ ہوں یا مومنؔ، امیر مینائی ہوں یا داغؔ دہلوی، شبلیؔ ہوں یا حالیؔ اور بعد کے شعراء میں اقبال، جگرؔ، فانیؔ، حفیظؔ، ماہر القادری، اقبالؔ سہیل اور اخترؔ شیرانی مثال کے طور پر نعت گوئی میں ایک قابل ذکر حیثیت کے مالک تھے، انہیں کے نقش قدم پر چلنے والے معاصرین شعراء میں کئی ایسے نمونے ملتے ہیں جن کو نعت گوئی کی صنف سے گہرا لگاؤ تھا اور وہ دیگر اصناف سخن میں نعت کہنا اپنے لئے باعث سعادت تصور کرتے تھے اور نعت وحمد میں اپنا کلام کچھ اس انداز سے پیش کرتے تھے کہ دونوں صنفوں میں توازن برقرار رہے اور نعت گوئی میں ہر طرح کی بے اعتدالی سے محفوظ رہیں۔ مشاہدے میں اکثر یہ بات آتی ہے کہ باری تعالیٰ کی حمد بیان کرتے وقت جذبات محبت کی عکاسی میں صفات ربانیہ کی روشنی کا ظہور شان جلالت کے مطابق نہیں ہو پاتا اور حمد پاک کی ندرت کو ٹھیس لگتی ہے اور ایک مومن بندے سے خالق کائنات کے ساتھ جس ایمانی تعلق اور اخلاص کی امید کی جاتی ہے وہ رسمیات کا شکار ہوکر رہ جاتی ہے، اس کے برعکس جب وہی شاعر اپنی تمام شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ نعت کے میدان میں اترتا ہے تو اس کا شہپ شوق اپنی بلند پروازی کے جوہر دکھانے میں اکثر حد سے تجاوز کر جاتا ہے اور اللہ کے حبیب ﷺ کی ذات گرامی کو صفات ربانیہ کا لباس پہنا دیتا ہے، خلاقیت اور صناعیت کی اعلیٰ صفات کو رسول اکرم ﷺ کی ذات اقدس پر بلا تکلف منطبق کر دیتا ہے، اور تھوڑی دیر کے لئے وہ اس حقیقت کو فراموش کر جاتا ہے کہ رسول پاک علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، خود حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

لاتطرونی کما أطرت النصاری عیسی بن مریم، فانما أنا عبده، ورسوله، فقولوا عبدالله ورسوله (بخاری:کتاب أحادیث الأنبیاء باب قول الله تعالیٰ۔ واذکر فی الکتاب مریم.....حدیث۳۴۴۵)

''میری تعریف میں حد سے آگے نہ بڑھو، جیسے کہ نصاریٰ حضرت عیسیٰ کی تعریف وتوصیف میں حد سے آگے بڑھ گئے، میں اس کا بندہ اور رسول ہوں تو مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہو اور فرمایا: میں اس عرب عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھے گوشت پر گذارا کیا کرتی تھی۔''

اور فرمایا: میں کھانا اس طرح کھاتا ہوں جس طرح غلام کھانا کھاتا ہے۔

نعت گوئی کی صنف بہت زیادہ نازک ہونے کے ساتھ سنجیدگی کی طالب ہے، ایک ایک لفظ کو استعمال کرنے سے پہلے اسے تولنا اور ہر لفظ کے ہر حرف پر غور کرنا ایک سچے نعت گو شاعر کی ذمہ داری ہے، اردو میں نعتیہ شاعری کا ایک نمونہ نذر قارئین ہے:

ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں جب نعت نبیؐ عنوان کیا
دست کرم اعجاز پہ آئے بخشش کا سامان کیا
غار حرا کی پاک صدا نے سب دروازے کھول دیئے
دوزخ دوزخ اس دنیا میں جنت کا سامان کیا
دھوپ قیامت کی ہے لیکن سائے سائے رہنا
کالے کالے گیسو والے آقاؐ نے اعلان کیا (۱)

(۱) یہ کلمات ''کوثر'' (نعتیہ مجموعہ) مؤلفہ مولانا رئیس الشاکری ندوی پر بطور مقدمہ کے لکھے گئے۔

باب چہارم

اساطین ندوۃ العلماء

حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ اور ندوۃ العلماء

(ولادت ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء۔۔۔وفات ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء)

اگر ندوۃ العلماء کا تعارف مختصر ترین الفاظ میں کرایا جائے تو یہ کہنا بجا ہوگا:

۱- تحریک ندوۃ العلماء نام ہے مغربی تہذیب اور مادی نظامہائے حیات کے خلاف اعلان بغاوت کا۔

۲- ندوۃ العلماء عنوان ہے اسلامی زندگی میں جامعیت اور اعتدال پیدا کرنے کی ایک جرأتمندانہ کوشش کا۔

یہی دو شہ سرخیاں ہیں، جن پر ندوۃ العلماء کی فکر کی بنا ہے۔

ذرا چشم تصور میں تاریخ کے اس پرفتن دور کو لائیے، جس میں اسلامی تہذیب کے تمام نقوش مٹنے کے قریب تھے، اور مسلم معاشرہ کی حیثیت ایک لاشۂ بے جان کی تھی، مسلمانوں کے دلوں پر خوف و دہشت مستولی تھا، شکست خوردگی اور یاس و قنوطیت کی دبیز چادر ان پر تنی ہوئی تھی، دوسری طرف مغربی تہذیب اپنے پورے دم خم کے ساتھ میدان میں اتر چکی تھی۔ انیسویں صدی عیسوی کا یہ دور یورپ کی مادی ترقی اور مشرق کے بظاہر زوال کا تھا، اسلامیت و مغربیت کے درمیان کشمکش جاری تھی، یورپ مشرق کو اپنے سامنے جھکانے اور مادی تہذیب کو من و عن قبول کرانے پر مصر تھا، چنانچہ مشرق کے چند علماء نے اس صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا اور مغرب کے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیا، اور مسلمانوں کا رشتہ اسلامی تہذیب اور عقیدۂ توحید سے مضبوط سے مضبوط تر کیا، ان غیرت مند علماء اور قائدین میں سرفہرست حضرت مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء کی شخصیت

تھی، جنہوں نے شہر کانپور کے اندر ندوۃ العلماء کے تخیل کو علماء کرام کی موجودگی میں پیش کیا، اس مجلس میں جن علمائے کرام نے شرکت فرمائی ان میں حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ استاد مدرسہ جامع العلوم کانپور، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ استاد دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادیؒ، حضرت مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ، حضرت مولانا نور محمد پنجابیؒ، حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ، حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، حضرت مولانا ظہور الاسلام فتح پوریؒ، حضرت مولانا عبدالغنی مئو رشید آبادیؒ، حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ، مولانا شاہ تجمل حسین دسنویؒ۔ چنانچہ ان علمائے کرام نے ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں ندوۃ العلماء کے تخیل کو عملی شکل دیا، اس طرح سے ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا اور مغربی تہذیب کے خلاف ایک متحدہ محاذ، دین و دنیا کے درمیان تفریق کی خلیج کو پاٹنے والا، شک و تردد کے شکار مسلمانوں میں یقین و اعتماد بحال کرنے والا ادارہ قائم ہوا۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ نے یہ محسوس کیا کہ اس وقت مادی فلسفہ کے ہمہ گیر اثرات کی وجہ سے دین اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل خطرے میں ہے اور قریب ہے کہ لادینیت اور دین کا فرق لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے اور لوگ کم علمی اور بے بصیرتی کی وجہ سے آپسی اختلافات میں پڑ کر اصل دشمن کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے بتایا کہ مسلمانوں کی صفوں میں جو انتشار ہے اس کا بنیادی سبب مدارس، اسکولز، کالجز اور یونیورسٹیوں کے موجودہ نظام تعلیم کا نتیجہ ہے، اس لئے ایک ایسے نظام کی داغ بیل ڈالنا ضروری ہے جو قدیم و جدید کا جامع ہو، ایمان کی حلاوت اور علم جدید میں مہارت اس کا امتیاز ہو، چنانچہ انہوں نے مدارس و مکاتب اور یونیورسٹیوں کے ذمہ داران کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جس کا خاطر خواہ فائدہ برآمد ہوا۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ نے روداد سال اول ندوۃ العلماء میں مدارس سے فارغ ہونے والے علماء کی حالت زار پر افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے:

''افسوس صد افسوس! کوئی گروہ طلبہ کا ایسا نہیں نکلتا ہے جو ملحدوں اور جدید فلسفیوں کے اعتراضات کو اسلام سے دفع کرے جس کا زہریلا اثر بسبب شیوع بے دینی و آزادی کے عالمگیر ہوتا جاتا ہے، اس کا مٹانا ہمارے علماء کا فرض ہے جس طرح ہو سکے، غرض کہ نہ تو حالتِ تحصیل میں انہوں نے کسی علم دین اور بالخصوص ان علوم مذکورہ میں مہارت و مشق پیدا کی نہ اس کے بعد انہیں نوبت آئی، اب فرمائیے کہ دین کا کام کون کرے؟ زیادہ افسوس یہ ہے کہ زمانہ کی ضرورتوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے نہ تو کسی دینی امر کا انتظام کر سکتے ہیں، نہ اس میں رائے دے سکتے ہیں (شاذ و نادر کا اعتبار نہیں) حالانکہ اس وقت ایسے گروہ کی زیادہ ضرورت ہے۔''

حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ جو ندوۃ العلماء کے قیام کے تین سال بعد حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کے نائب مقرر کئے گئے، ایک جلسہ میں ندوۃ العلماء کے قیام کے مقاصد کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

''آج کل مختلف علوم میں مسلمانوں کی حالت جو تنزل اور ادبار کی انتہا درجہ پر پہنچ گئی ہے، اس کے چند سبب سمجھے جاتے ہیں، اولاً نفاق باہمی، دوسرے علماء کی کم توجہی اور درحقیقت عقل سلیم بھی اسی کی مقتضی ہے، ان دونوں باتوں کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے جس کو ہم فی زمانہ دیکھ رہے ہیں، لیکن علماء کی کم توجہی کا سب سے بڑا سبب یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ خود زمانہ کی ضرورتوں سے ناواقف ہیں، انہیں نقائص کو دفع کرنے کی غرض سے روشن خیال اور پاکیزہ نفس بزرگوں نے ندوۃ العلماء کی، خاص علمائے کرام کی سرپرستی سے ایک انجمن قائم کی ہے''۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ نے علماء کرام کی دنیاوی امور سے بیزاری کو ندوۃ العلماء کے قیام کا ایک بنیادی مقصد قرار دیا ہے، وہ فرماتے ہیں۔

''بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک جماعت علماء کی دنیا کے

حالات اور واقعات سے بھی باخبر ہو، اس کو معلوم ہو کہ جس سلطنت میں وہ زندگی بسر کرتی ہے اس کے اصول سلطنت کیا ہیں؟ اس کو سلطنت سے کس قسم کا تعلق ہے، مسلمانوں کی دنیوی حالت کیا ہے، ان کو کیا ضرورتیں درپیش ہیں، سلطنت کے انتظامات میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان سے مسلمانوں کی حالت پر کیا اثر پڑتا ہے، ملک میں علماء کا جو اثر کم ہوتا جارہا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ خیال عام طور پر پھیلتا جاتا ہے کہ علماء حجروں میں معتکف ہیں، اور ان کو دنیا کے حال سے بالکل خبر نہیں، اس لئے دنیاوی معاملات میں ان کی ہدایت اور ان کا ارشاد بالکل ناقابلِ التفات ہے، بلاشبہ جو علماء دنیا سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، اور ان کو کثرتِ عبادت اور ذکر و فکر کی وجہ سے اپنے فرزندوں کے ضروریات کی طرف بھی توجہ نہیں، اصحابِ صفہؓ سے ان کو تشبیہ دی جاسکتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ کل صحابۂ کرامؓ اصحاب صفہ نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے، بے شبہ اصحاب صفہؓ کے مشابہ ایک گروہ ہمیشہ قوم میں موجود رہنا چاہئے، لیکن اس کے ساتھ نہایت ضروری ہے کہ ایک جماعتِ کثیر ایسی بھی موجود ہو جو واقفیت و اطلاع، انتظام و تدبیر، حزم و مصلحت اندیشی میں حضرت عمرؓ، عمرو بن العاص، خالد بن الولیدؓ، ابوعبیدہؓ کے نقشِ قدم پر ہو "۔

جب ندوۃ العلماء کے مثبت اثرات مرتب ہوئے اور لوگوں کی توجہ کا وہ مرکز بنا تو حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ نے سوچا کہ ایک ایسا مدرسہ قائم ہونا چاہئے جس میں اس فکر کے نمائندہ علماء تیار ہوں، چنانچہ انہوں نے دارالعلوم کے قیام کا خاکہ ۱۳۱۳ھ کے جلسہ انتظامی میں پیش کیا، یہ تجویز منظور ہوئی، ایک جگہ مولانا محمد علی مونگیری قیام دارالعلوم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سب سے مقدم یہ ہے کہ قوم میں ایسے علماء کی ایک جماعت موجود ہو جو علوم مذہبی میں اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتی ہو، خصوصاً علم کلام میں،

تا کہ غیر مذہب والوں کے مقابلہ میں اسلام کی حقیت اور عمدگی ثابت ہو سکے، اور علم فقہ میں اس کو ملکہ تام حاصل ہو، تا کہ عبادات اور معاملات کے متعلق احکام اور فتاویٰ اس کے مستند اور واجب العمل سمجھے جائیں''۔

۱۴ر جمادی الاولی ۱۳۱۳ھ کو حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ نے تعلیم وتربیت کا مستقل نظام ممتاز علماء اکابرین اور اہل علم حضرات سے استصواب رائے کے بعد پیش کیا، جسے دارالعلوم کے نظام کے طور پر نافذ کیا گیا اور تعلیم وتربیت کی سرگرمیاں جاری ہوئیں، اس مشن میں مولانا مونگیریؒ کے دوش بدوش رہنے والے اور بھی حضرات تھے جن میں علامہ شبلی نعمانیؒ کی شخصیت نمایاں ہے، وہ ایک زمانہ تک ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم رہے، طلباء کی علمی اور ثقافتی تربیت میں اہم رول ادا کیا اور ایک ایسی نسل تیار کی جو ندوۃ العلماء کے بنیادی فکر کی حامل تھی۔ ان کے فکری تخیل کی وضاحت عبارت ذیل سے ہوگی، جس کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اپنی کتاب ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' میں نقل کیا ہے:

''نہ یونانی علوم رہے اور ان مسائل کی صحت کا یقین عقل کے مدعیوں کو رہا، اس لئے ان کا اثر خود بخود زائل ہو گیا، اور اب ان سے اسلام کو کسی گزند کا خوف نہیں رہا، اب اس کی جگہ نئے علوم ہیں، نئے مسائل ہیں، نئی تحقیقات ہیں، اب اس کی ضرورت ہے کہ ہمارے علماء ان چیزوں سے واقف ہو کر اسلام کی نئی مشکلات کا حل نکالیں اور نئے شبہات کا تحقیقی جواب دیں''۔

ندوۃ العلماء کی فکر کا ہر سمت سے استقبال ہوا عالم عربی تک اس کی شہرت پہنچی، عرب علماء نے اس کے مقاصد کو سن کر سراہا اور اس کی خدمات کا اعتراف کیا، ندوۃ العلماء صرف ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں ہے، بلکہ تصنیف وتالیف، صحافت ودعوت، تربیت وریاضت کا بھی ایک مقبول مرکز ہے، اس کی فکری، بلندی اور اصلاح نصاب کی کوششوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ لکھتے ہیں:

''ندوۃ العلماء کا قیام ایک مبارک قدم اور ایک نیا زاویۂ نگاہ تھا، ندوۃ العلماء کی تحریک محض اصلاح نصاب کی ایک تحریک نہ تھی، وہ مستقل ایک دبستان فکر بھی تھا، جس کی تقلید ہر اس ملک کو کرنی چاہئے تھی جو قدیم وجدید کے معرکہ میں مبتلا اور اس کشمکش کا شکار تھا، ندوۃ العلماء کا تخیل وہ معتدل ومتوازن تخیل ہے، جو اب بھی اس بات کی صلاحیت رکھتا ہے کہ دینی نظام تعلیم کو زندگی کی ایک نئی قسط عطا کرے، اور اس کے ذریعہ سے قدیم وجدید کی اس کشمکش اور دو برسر پیکار طبقوں کی آویزش سے نجات پائے۔ جس نے اکثر اسلامی ملکوں میں انتشار پیدا کر رکھا ہے، اور جس کی بنا پر بعض ممالک کا رُخ سیکولرازم کی طرف ہوتا جارہا ہے''

ندوۃ العلماء اس وقت بھی عالم اسلام کی ضرورت ہے جس طرح پہلے تھا، بلکہ اس مشن کی اہمیت اس وقت پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

علامہ سید عبدالحی حسنیؒ

(ولادت ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء۔۔۔وفات ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۳ء)

عالم، محقق اور ادیب

ہندوستان میں اسلامی نشأۃ ثانیہ کا دور دراصل شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی علمی کاوشوں، علوم اسلامیہ کے میدان میں ان کی فتوحات اور زبان وادب میں ان کی مہارت، اعلیٰ ذوق اور وسیع النظری سے شروع ہوتا ہے، بارہویں صدی ہجری میں ان کے ذریعہ اس ملک میں جو علمی اور فکری انقلاب آیا اور جس نے سوتے ہوئے عزائم کو بیدار کردیا۔ علم وعمل اور زبان وادب کی دنیا میں ایک نئی روح پیدا کی، اسی کا نتیجہ تھا کہ اس ملک نے نہ صرف علم حدیث بلکہ جملہ علوم اسلامیہ میں عالم اسلام کی قیادت کی، اور اسلامی نشأۃ ثانیہ کے میدان میں ایسے اصلاحی اور تجدیدی کارنامے انجام پائے جو ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے صفحات پر نقش زریں کی حیثیت سے ثبت ہیں، آپ نے اور آپ کے خانوادہ نے اہل علم وادب کے علم برداروں کی ایک عظیم نسل تیار کی اور سلسلہ ولی اللہی کے ایسے زبردست علمی اور تربیتی مراکز قائم ہوئے جو اس ملک کی علمی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ولی اللہی درسگاہوں کے نام سے معروف ہیں۔

ولی اللہی درسگاہوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے علماء، فضلاء، محققین اور ادباء نے اپنی تحقیقی، علمی اور ادبی کاوشوں کے ذریعہ اسلامی نشأۃ ثانیہ کے میدان میں قابل فخر کارنامے انجام دئے ہیں۔

انیسویں صدی عیسوی کے ایک قابل فخر مؤرخ، محقق، اور ادیب مولانا حکیم سید عبد

الحی حسنی ہیں جو نہ صرف ہندوستان کی علمی اور ادبی تاریخ میں بہت ممتاز اور بلند مقام رکھتے ہیں، بلکہ انہوں نے اپنی بے مثال عربی تصنیفات اور علمی کارناموں سے ہندوستان کا تعارف عالم اسلام میں کرایا ہے، اور وہاں کے علماء، ادباء اور محققین سے خراج تحسین حاصل کرکے اس ملک کے نام اور وقار میں زبردست اضافہ کیا ہے، اور اسلامی نشأۃ ثانیہ کو تقویت پہونچانے اور اس کے رقبے کو وسیع کرنے اور اس کی جڑوں کو مضبوط کرنے میں اپنے علم وادب سے انہوں نے بڑا حصہ لیا ہے۔

علامہ سید عبدالحی حسنی رائے بریلی سے باہر بمقام دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں میں ۱۸ رمضان ۱۲۸۶ھ مطابق ۲۲ دسمبر ۱۸۶۹ء پیدا ہوئے۔ آپ کی عالی نسبی، اور خاندانی عز وشرف ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اسی کے ساتھ قدرت نے آپ کو بلند حوصلگی، وسعت نظر، علمی تنوع اور ادبی ذوق سے مالا مال کیا تھا، قوت مطالعہ، علمی رواداری، ذوق تحقیق، سخن فہمی، آپ کا نمایاں وصف تھا، انیسوی صدی عیسوی کو اسلامی نشاۃ ثانیہ کا دور کہا جاتا ہے، اس دور کی جن باکمال ہستیوں نے علوم وفنون اور تاریخ وادب کے میدان میں بیش بہا یادگاریں چھوڑی ہیں، اور جنہوں نے روشنی کے ایک مینار کی حیثیت سے اپنا تعارف اپنے جوہر ذاتی سے کرایا ہے ان میں آپ کا نام سرفہرست ہے۔

علامہ سید عبدالحی حسنی ہند اور بیرون ہند کی علمی اور ادبی دنیا میں اپنی غیر معمولی ذہانت وفطانت، وسیع علمی اور عمیق معلومات اور اسلامی علوم وفنون پر گہری نظر کی وجہ سے بہت مشہور اور ممتاز ہیں، طبقات وتراجم رجال، اور ہندوستانی علماء وفضلاء کے حالات، حسب ونسب، ان کے علمی اسفار، اساتذہ وشیوخ، اور ان کے علمی کارناموں پر ان کی نظر بہت وسیع تھی۔

انہوں نے اپنی ذاتی محنت ومطالعہ، اور اپنے علمی ذوق وشغف اور ملک وملت کی خدمت کے جذبے سے ایک بیش قیمت کتب خانہ کو وجود بخشا، ہندوستان کی تہذیب وثقافت اور اس کے تاریخی آثار ورجال پر ان کے قلم گہربار نے ایک عظیم الشان دفتر تیار کردیا، ان کی

تاریخی تصنیفات ان کی نقادانہ صلاحیتوں اور شخصیات کے اوصاف وخصوصیات کی صحیح عکاسی پر ان کی بھرپور قدرت کا پتہ دیتی ہیں، مولانا ایک ممتاز دانشور اور ماہر تعلیم بھی تھے، اس سلسلہ میں ان کے بیش قیمت خیالات سے آج بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے، اسی طرح وہ مسلمانوں اور ملک کی اصلاح وترقی کے لئے وہ زندگی بھر کوشاں رہے، نصاب ونظام تعلیم وتربیت کو زمانے کے جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے اور ہندوستان کے مسلم معاشرہ میں زندگی کا خون دوڑانے میں ان کی عظیم الشان خدمات سنہرے حروف سے لکھی جائیں گی۔

مولانا کی ان صفات کا اندازہ کچھ ان کے اس خط سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے ۱۸۹۴ء میں سرسید جیسی عظیم شخصیت کو لکھا ہے، اس وقت آپ کی عمر صرف ۲۶ سال تھی اور بھوپال میں طالب علمی کا زمانہ گذار رہے تھے، اس طویل خط میں انہوں نے سرسید کی عظمت، بلند ہمتی، اسلامی درد اور مسلمانوں کی تعلیم وترقی کے لئے مخلصانہ جدوجہد کا اعتراف کرنے کے باوجود ان کو نہایت پرخلوص طریقے سے مشورہ دیا ہے کہ صرف دنیاوی ترقی ہی ایک مسلمان کا مطمح نظر نہ ہونا چاہئے اور نہ دین ودنیا کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے سے وہ ترقی کے مدارج طے کر سکتے ہیں، بلکہ ان کی ترقی کا راز دین ودنیا دونوں کو پورے توازن کے ساتھ جمع کرنے میں ہی مضمر ہے، ایک مختصر اقتباس اس خط کا پیش کیا جاتا ہے:

''اس میں شک نہیں کہ کسب معاش وخودداری کسی حد تک شرعاً محمود ہے، لیکن اس کو نہ بھولنا چاہئے کہ یہ سب وسائل ہیں اور مقصود خدا طلبی ہے، وسیلہ کو وسیلہ اور مقصود کو مقصود سمجھنا فرض ولازمۂ انسانیت ہے، اگر کوئی شخص وسیلہ کو مقصود پر ترجیح دے تو سب وہی کہیں گے جو ایک دیرینہ سال تجربہ کار فاضل ریفارمر کہہ گیا ہے

نباشد دل آن فرومایہ شاد
کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

دنیا اسی کا نام ہے، کسب معاش کا نام نہیں، صحابہ کرام کو دیکھئے کہ کس قدر دولت مند تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی دولت مندی

کی بدولت غنی کا لقب حاصل کیا، اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا جب انتقال ہوا تو پانچ کروڑ دو ہزار کی دولت چھوڑ گئے (ملاحظہ ہو صحیح بخاری) اسی کے قریب قریب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے چھوڑا، مگر یہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم دنیادار نہ تھے جس کی مذمت خدا نے جابجا اپنے کلام پاک میں ارشاد فرمائی ہے، دنیادار ہم ہیں جو دین کو ارزاں سمجھتے ہیں اور اسی کو قبلۂ ہمت بنائے ہوئے ہیں، "ومن کان یرید حرث الدنیا نؤته منها وماله فی الآخرة من نصیب"

سید صاحب! ''خاکستر اگر چہ نسب عالی دارد کہ آتش جوہر علویست مگر چوں در ذات خود ہنرے نہ دارد باخاب برابر است'' ان باتوں کو سرسری نگاہ سے نہ دیکھئے، خوب غور کر کے دیکھے، پھر تنہائی میں دیکھئے اور دل کو تمام وسوسوں سے خالی کر کے دیکھئے، یہ باتیں ایسی ہیں کہ ان کو سن کر باخدا لوگوں کو بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور دل کانپ اٹھتے ہیں، نورالاسلام بڑی عزیز الوجود چیز ہے، اور یہ سب نعمائے دنیاوی چندروزہ ہیں، آپ رئیس قوم ہیں تو اپنے خیالات کو درست کر کے قوم کے خیالات درست کیجئے ہمارے حضرت ﷺ کی حدیث ہے (روحی فداہ) "کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیته" آپ کے تابعین اور تبع تابعین کا مواخذہ بھی آپ ہی سے ہوگا'' (۱)

آپ کا سلسلہ نسب نواسۂ رسول حضرت حسن بن علی بن ابی طالب پر منتہی ہوتا ہے، آپ کے جدامجد شیخ الاسلام امیر قطب الدین جو شیخ عبدالقادر جیلانی کے بھانجے تھے ہجرت کر کے ہندوستان آئے، اور ظلمت کفر کو مٹانے کے لئے زندگی کا بیشتر حصہ جہاد میں گذارا، دہلی میں شیخ الاسلام کے منصب کو بھی عزت بخشی، امیر قطب الدین کی اولاد میں بڑے بڑے علماء، فضلاء، اہل قلم اولیاء، مشائخ اور مجاہدین پیدا ہوئے، جنہوں نے ہندوستان میں اصلاح وتجدید اور علم وادب کے میدان میں ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ ان میں ہندوستان

(۱) حیات عبدالحی بقلم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

میں پہلی اسلامی تحریک کے قائد و بانی حضرت سید احمد شہیدؒ بہت مشہور ہوئے، جنہوں نے ظالموں اور اسلام دشمن طاقتوں سے جہاد کیا، اگر بعض دوست نما دشمن جو آپ کی جماعت میں سازش کے تحت شامل ہو گئے تھے کی خیانت و غداری نہ ہوتی تو ہندوستان ایک صدی پہلے ہی آزاد ہو جاتا۔ عصر حاضر کے ممتاز عالم دین، عالم ربانی، عظیم مفکر، ادیب اور صاحب قلم جو ہر علم و عمل سے آراستہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سابق ناظم ندوۃ العلماء، علامہ عبدالحی حسنی کے فرزند ارجمند ہیں، ان کی شخصیت پورے عالم میں معروف ہے اور محتاج تعارف نہیں۔

مولانا سید عبدالحی حسنی کو بچپن ہی سے مطالعہ کا شوق تھا، ہندوستان کی علمی و سیاسی تاریخ سے واقف ہونے، طبقات و تراجم رجال، ان کی خصوصیات و امتیازات اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جاننے کا شوق تھا، اس موضوع سے انہیں عشق کی حد تک دلچسپی تھی، ان کی زندگی کا سب سے پر مسرت اور خوشگوار وقت وہ ہوتا تھا جب وہ سب کاموں سے فارغ ہو کر اس کام میں مشغول ہوتے تھے، اس لئے عمر بھر وہ اس کام کی طرف متوجہ رہے، اور کوئی سیاسی، گاہ بگاہ شخصی حوادث یا پیشہ طبابت کی مصروفیت جو ان کا ذریعہ معاش تھا ان کے لئے سدراہ نہیں ہوئے، ندوۃ العلماء جیسے ادارہ اور تحریک کی نظامت اور اس کے سالانہ جلسہ کا انتظام بھی اس کام میں مخل نہیں ہوا، ''نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر'' کی آٹھ ضخیم جلدیں انہیں موتیوں کا خوبصورت ہار ہے، نزہۃ الخواطر میں جن مطبوعہ مخطوطہ کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، ان کی تعداد تین سو ہے، اس میں تاریخ ہند پر مؤلف کی پوری زندگی کے مطالعہ کا نچوڑ آ گیا ہے، اس کی جامعیت اور مکانی و زمانی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں پہلی صدی ہجری میں ہندوستان آنے والے صحابہ و تابعین و مبلغین سے لے کر چودھویں صدی ہجری کے نصف تک کے ساڑھے چار ہزار سے زائد اہل فضل و کمال کا تذکرہ ہے، یہ دراصل ہندوستان کے اہل علم و فضل کے حالات اور ان کے کارناموں کے جاننے کا ایک ایسا قابل اعتماد انسائیکلو پیڈیا ہے جس کی نظیر تاریخ کے عصری کتب خانوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔

تاریخ وتاریخی شخصیتوں کی زندگی اوران کے کارناموں کے مطالعہ کا ذوق رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ متعدد اسباب کی بناپر ہندوستان ہندوستانی علماء، ادباء، مشائخ، شعراء، امراء اور سلاطین اوران کے کارنامے عرب مؤرخین کی نگاہوں سے اوجھل رہے، صرف چند شخصیات کا جو کسی وجہ سے بہت زیادہ نمایاں تھیں بعض عرب مؤرخین نے اپنی کتابوں میں تذکرہ کیا ہے۔

حافظ سخاویؒ نے اپنی مشہور کتاب ''الضوء اللامع'' میں جو بارہ جلدوں میں اور نویں صدی ہجری کے گیارہ ہزار چھ سو گیارہ علماء کے حالات پر مشتمل ہے، ہندوستان کے صرف ۸۸ر علماء کا تذکرہ لکھا ہے، علامہ شوکانی یمنی نے ہندوستان سے قریب ہوتے ہوئے بھی ''البدر الطالع'' میں ساتویں صدی ہجری سے لے کر بارہویں صدی کے ہندوستانی علماء میں صرف ۷ر کا تذکرہ کیا ہے، محبی نے ''خلاصۃ الأثر'' میں گیارہویں صدی کے علمائے ہند میں سے صرف ۱۴ر کا تذکرہ کیا ہے، حالانکہ ان کی کتاب میں جن شخصیات کا تذکرہ آیا ہے ان کی تعداد بارہ سو نوے ہے، اسی طرح مرادی نے ''سلک الدرر'' میں بارہویں صدی کے علماء ہند میں سے صرف سات کا تذکرہ لکھا ہے، طبقات وتراجم کی کتابوں میں نزہۃ الخواطر کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ یہ تمام طبقات اور پہلی صدی ہجری سے مصنف کی زندگی تک تمام صدیوں اور ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے تک کا احاطہ کرتی ہے، اگر یہ دیکھا جائے کہ مولانا سید عبدالحئی حسنی نے تنہا اپنی محنت ومطالعہ اپنے علمی شغف وذوق اور دین ووطن کی خدمت کے جذبہ سے یہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے تو ایک نکتہ شناس کا یہ مقولہ ان پر صادق آتا ہے کہ جو کام یورپ میں اکیڈمی کرتی ہے، مشرق وایشیا میں بعض اوقات تنہا ایک آدمی کر لیتا ہے، مولف رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ''حیات عبدالحی'' میں نزہۃ الخواطر کی وسعت وجامعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''ہندوستان جیسے وسیع ملک جسکو ایک تحتی براعظم کہنا زیادہ صحیح ہوگا کا احاطہ اوراس میں پیدا ہونے والے تمام اہل کمال اور ممتاز شخصیتوں کی

نشاندہی جن میں سے ایک بڑی تعداد گوشہ گمنامی میں پڑی رہی اور جن میں سے بہت سے اہل کمال کا تعلق قصبات وقریات سے ہے اور وہ ان مؤرخین کی نظر سے جو بالعموم حکومت کے مرکزوں اور نامی گرامی شہروں سے تعلق رکھتے تھے، اوجھل رہے، استیعاب واستقصاء کرنا انسانی طاقت سے تقریباً باہر ہے، خود مصنف نزہۃ الخواطر کو اس بات کا احساس وافسوس ہے لیکن ان ساری دقتوں اور ناقابل عبور مشکلات کے باوجود یہ کتاب اتنی جامع اور محیط بن گئی ہے کہ ہندوستان کے اسلامی عہد کا کوئی مصنف اور مورخ اب اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، کوئی انسانی کام نقائص، خامیوں، اور فروگذاشتوں سے پاک نہیں رہ سکتا اس لئے اس کے حرف آخر یا اس کے مصنف کے معصوم عن الخطأ ہونے کا دعوی ہرگز نہیں کیا جاسکتا، مگر ان آٹھ جلدوں میں جو کچھ مواد آگیا ہے اس نے بہت سے طالبین علم وتحقیق کا بہت قیمتی وقت بچالیا ہے، اس لحاظ سے مصنف کا یہ احسان ناقابل فراموش ہے۔''(۱)

علامہ سید سلیمان ندوی نزہۃ الخواطر کی اہمیت کا یوں اعتراف کرتے ہیں:

''اسلامی ہندوستان کے پورے ہزار سالہ عہد میں شعراء ومشائخ وسلاطین کے سینکڑوں تذکرے اور تاریخیں لکھی گئیں، لیکن آزاد بلگرامی کی تصانیف کو چھوڑ کر کوئی مختصر رسالہ بھی مستقل یہاں کے علماء وفضلاء کے حالات میں نہیں لکھا گیا، مولانا سید عبدالحی مرحوم نے اس نقص کو محسوس کیا اور پورے بیس برس اس کام پر صرف کئے، اس عرصہ میں ہندوستان کی اس سرحد سے اس سرحد تک کوئی کتب خانہ نہیں چھوڑا جہاں ان کو ذوق طلب کھینچ کر نہ لے گیا ہو، اور بالآخر آٹھ جلدوں میں علمائے ہند کی پوری سوانح عمریاں جمع کیں، اس کا مقدمہ لکھا جس میں ہندوستان کے اسلامی علوم وفنون کی تاریخیں مرتب کیں۔ (۲) عربی میں ہندوستان کی

---

(۱) حیات عبدالحی ص: ۲۷۷

(۲) اس سے مراد معارف العوارف ہے جو الثقافۃ الاسلامیہ في الہند کے نام سے دمشق سے اور اس کا ترجمہ ''اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں'' کے نام سے دارالمصنفین اعظم گڑھ اور لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

اسلامی تاریخ سلاطین اسلام، یہاں کے اسلامی تمدن، مساجد، مدارس، عمارات، شفاخانے اور دیگر خصوصیات پر پوری ایک کتاب (۱) تیار کی، (۲) علامہ مناظر احسن گیلانی جن کی نظر ہندوستان کی علمی تاریخ پر بڑی وسیع اور ناقدانہ تھی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''یہ واقعہ ہے کہ آپ کے والد مرحوم کی چیزوں سے یوں تو مجھے بچپن سے ہی خاص دلچسپی رہی ہے، لیکن نزہۃ الخواطر کی قدر و قیمت مجھ پر اپنی اس کتاب ''مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت'' کے لکھتے وقت جتنی ظاہر ہوئی اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی، اللہ کے مخلص بندہ نے کمال کر دیا ہے، سمندروں کو کھنگال گئے لیکن پتہ بھی چلنے نہیں دیا، خدا کرے کہ ان کی محنت سے استفادہ کا موقع دنیا کو مل جائے، ایک انقلابی کام ہے جسے وہ کر کے چلے گئے ہیں، اب یہ ہم لوگوں کی توفیق کی بات ہے کہ اس سے مستفید ہوں اور دوسروں کو مستفید ہونے کے مواقع پیدا کریں۔

یہ کتاب آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد پہلی صدی ہجری سے ساتویں صدی ہجری تک، دوسری جلد آٹھویں صدی ہجری پر، تیسری جلد نویں صدی ہجری، چوتھی دسویں صدی، پانچویں گیارہویں صدی ہجری، چھٹی بارہویں صدی ہجری، ساتویں تیرہویں صدی ہجری اور آٹھویں جلد چودہویں صدی ہجری کے اعیان و مشاہیر کے تراجم و تذکرے پر مشتمل ہے، کتاب کے مجموعی صفحات تین ہزار دو سو چالیس ہیں۔

نزہۃ الخواطر کا نیا ایڈیشن، نیا نام

مصنف علیہ الرحمہ نے اس کتاب کا نام ''نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر'' رکھا تھا، اور اسی نام سے دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے

(۱) اس سے مراد جنۃ المشرق ہے جو الہند فی العہد الاسلامی کے نام سے دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد اور اس کا اردو ترجمہ ''ہندوستان اسلامی عہد میں'' کے نام سے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام سے شائع ہوا۔

(۲) معارف، ۱۰۲۳ء

،دائرۃ المعارف کا یہ بہت بڑا کارنامہ اور اہل علم پر احسان عظیم ہے کہ اس نے نزہۃ الخواطر اور اس جیسی متعدد دوسری کتابوں کو جنہیں ایک نظر دیکھنے کے لئے اہل علم کی آنکھیں ترستی تھیں زیور طبع سے آراستہ کر کے وقف عام کر دیا۔

اس کا تازہ ایڈیشن بڑے اہتمام سے دار عرفات رائے بریلی نے " الاعلام بمن فی تاریخ الھند من الاعلام " کے نام سے ابھی حال ہی میں چھپا ہے۔

مصنف کی عربی میں دوسری اہم تصنیف ''ہندوستان اسلامی عہد میں'' ہے، یہ کتاب تین فنون پر مشتمل ہے، فن اول میں قدیم وجدید تاریخی، مذہبی، اور تمدنی حیثیتوں سے ہندوستان پر نظر ڈالی گئی ہے، جبکہ دوسرے فن میں مسلمانوں کے عہد کی تاریخ مجتہدانہ انداز میں لکھی گئی ہے، فن ثالث بالکل نئی چیز ہے، شاہان اسلام کے عہد کا تمدن وطرز معاشرت، اور ان کے ہر ہر عہد کے رسوم اور معاشرت کی تبدیلیاں ان کے محاصل وخراج اور طریقہ حکمرانی وغیرہ پر غایت استقصاء کے ساتھ بحث کی گئی ہے، بہت سے امور خیر مثلاً باغات، انہار ومدارس وجوامع وغیرہ جن پر ابتک پردہ پڑا ہوا تھا، بالتفصیل بیان کئے گئے ہیں۔

عربی میں ان کی تیسری اہم کتاب ۱۹۵۸ء میں المجمع العلمی العربی، دمشق نے "الثقافة الاسلامیه فی الھند" کے نام سے شائع کی۔ یہ اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے، اس میں ہندوستان میں تعلیم وتعلم کی تاریخ، نصاب درس کے ارتقاء اور اس کی عہد بعہد تبدیلیوں کی روداد اور ہندوستان کے ہزار سالہ اسلامی عہد کے ہر فن: صرف، نحو، لغت، بلاغت، فقہ اور اصول فقہ، تفسیر، حدیث، فرائض، اسماء الرجال، منطق وفلسفہ، ریاضی، ہئیت، ہندسہ، علم موسیقی وغیرہ پر تصنیفی کاموں کا مکمل ومفصل جائزہ لیا گیا ہے، پہلے اس علم کی تعریف اور اس کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے، پھر ہندوستان سے باہر اس علم کی بنیادی اور اہم تصنیفات کا تذکرہ کیا گیا ہے، پھر اس فن پر ہندوستانی مصنفین کی کتابوں کی فہرست پیش کی گئی ہے، یہ تینوں کتابیں ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں مصنف کے نقطۂ نظر ،اس میدان میں ان کی خدمات اور تاریخ ہند کے ان گوشوں کو جاننے اور اجاگر کرنے کے

جذبہ کو نمایاں کرتی ہیں، جو ابتک لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ومستور تھے، اور جن سے مؤرخین نے اپنی کتابوں میں غفلت برتی تھی۔

تحریک ندوۃ العلماء سے وابستگی

۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں ندوۃ العلماء کی تحریک اٹھی تو اسے امت اسلامیہ ہندیہ کے لئے بے حد نفع بخش پاکر علامہ عبدالحی حسنی نے اس میں بھرپور حصہ لیا اور اپنی تمام توانائیاں اس کے لئے وقف کردیں، ان کے اخلاص بے لوث محنت، حسن کارکردگی اور مختلف طبائع کو جوڑ کر رکھنے کی بے پناہ صلاحیت کی وجہ سے پہلے مددگار ناظم اور پھر ناظم مقرر کئے گئے، اس منصب پر اخیر وقت تک وہ فائز رہے، ان کے ذمہ جب بھی کوئی کام ڈالا گیا تو انہوں نے اسے للہ فی اللہ بحسن وخوبی انجام دیا۔

ان کی ایک کتاب ''تہذیب الاخلاق'' بھی ہے، جس میں اصلاح معاشرہ، اصلاح نفس اور تزکیہ قلب سے متعلق احادیث جمع کی گئی ہیں۔ اور دارالعلوم کے نصاب میں داخل ہے۔

علامہ عبدالحی حسنی کو جو زمانہ ملا، عربی زبان وادب کے انحطاط وزوال کا دور تھا۔ کوئی مصنف اس دور میں عربی کو تصنیف وتالیف کی زبان بنانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، لیکن مولانا عبدالحی حسنی نے باوجود اس کے کہ اردو کے صاحب اسلوب ادیب تھے۔ عربی کو نزہۃ الخواطر جیسی ضخیم تصنیف کے لئے ترجیح دی، ہندوستان میں عربی زبان کو ترقی دینے اور اسے ایک زندہ زبان کی حیثیت سے اپنانے کی دعوت دینے کے راستے میں یہ گویا پہلا عملی قدم تھا، ندوۃ العلماء جو اس دعوت وتحریک کا علمبردار تھا، کے سب سے بڑے ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے ان کا یہ فرض بھی تھا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ''حیات عبدالحی'' میں لکھتے ہیں'' یہ ان کی ذہانت اور دور بینی تھی کہ انہوں نے کتاب کی زبان کے لئے عربی زبان کو ترجیح دی جو ہندوستان میں ان کے زمانہ میں اپنے آخری نقطۂ زوال تک پہنچ چکی تھی، یہ ایک علمی مہم جوئی تھی کہ اس طالب علم نے جس کا ادبی نشو ونما

مقامات حریری اور اسی طرز کی دوسری کتاب کے ماحول میں ہوا تھا ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھانے کا فیصلہ کیا جس میں زبان و بیان کے تنوع کی سخت ضرورت تھی''۔

یہ جاننے کے لئے کہ نزہۃ الخواطر کے مصنف کا ذوق کتنا بلند، کتنا پاکیزہ، الفاظ کا مزاج اور ان کے درجۂ حرارت سے کس قدر واقف تھے، نزہۃ الخواطر اور ان کی دوسری عربی کتاب پر ایک نظر ڈال لینا کافی ہے، انہوں نے ہزاروں صفحات میں اہل علم وفضل کے تذکرے لکھے ہیں، ہر شخص کی وہی خصوصیات لکھی ہیں جو ان میں پائی جاتی تھیں، ایسا نہیں ہے کہ ایک ہی طرح کے الفاظ تھوڑے سے تصرف کے ساتھ ہر ایک کے لئے استعمال کئے ہوں۔ اور ہر ایک کے سر پر ایک ہی قسم کی ٹوپی رکھنے کی کوشش کی ہو، چاہے اس پر فٹ آئے یا نہ آئے، زبان ایسی شیریں سلیس اور رواں استعمال کی گئی ہے کہ قاری اکتانے کے بجائے لذت وفرحت محسوس کرتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب کا ذوق آپ کو فطری طور پر میں ملا تھا، اردو، فارسی، اور عربی تینوں زبانوں کے ادب میں بلند مقام کے مالک تھے، ہندوستان کی پوری ہزار سالہ علمی تاریخ میں ایسی سلیس وشگفتہ عربی زبان لکھنے والا نہیں گذرا، عربی زبان کے متعدد نامور مبصرین اور ناقد مثلاً علامہ ڈاکٹر محمد تقی الدین ہلالی جن کی جلالت شان اور عربی زبان وادب میں ان کے مقام ومرتبہ کا اندازہ لگانے کے لئے یہ کافی ہے کہ علامہ رشید رضا مصری اور امیر البیان شکیب ارسلان جیسے محققین اور عربی زبان کے روشناش صاحب اسلوب ادباء کے درمیان جب عربی کے کسی مسئلہ میں اختلاف ہوجاتا تو وہ ان سے رجوع کرتے تھے، اسی طرح ادیب شہیر علی طنطاوی، علامہ بہجۃ الاثری وغیرہم آپ کی انشاء اور تحریر کے بڑے قائل اور مداح ہیں، علامہ محمد تقی الدین ہلالی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی جوان کے شاگرد بھی ہیں کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: ''میں آپ کے والد مرحوم کے علم ومطالعہ، ان کی فصاحت وبلاغت، ان کے دلکش وخوبصورت اسلوب اور ان کے حسن تصنیف کا بہت قائل ہوں، یہ ایک حقیقت ہے کہ جس کا میں اظہار کرتا ہوں اس کا مقصد بے جا مدح سرائی نہیں ہے، جو لوگ ان کے علم وتحقیق پر شک کرتے ہیں اس کی وجہ دراصل عربی

زبان میں ان کی عدم مہارت ہے، علامہ بہجۃ الأثری جو عربی زبان وادب میں سند کا درجہ رکھتے ہیں، ادیب ومحقق ہیں، لکھتے ہیں کہ ان کی دو کتابیں اس وقت میرے پیش نظر ہیں: ''الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند'' اور ''الہند فی العہد الاسلامی'' ان میں سے تنہا ایک کتاب ہی مصنف کو علمی، تاریخی اور تحقیقی دنیا میں بلند مقام دلانے کے لئے کافی ہے، اس کے ذریعہ صاحب کتاب کا علم وفضل، گہرا وعمیق مطالعہ اور قلم کی شگفتگی وسلاست آشکارا ہو جاتی ہے، جب تک قرآن کی زبان باقی رہے گی لوگ ان کو یاد رکھیں گے۔

یہاں پر علامہ عبدالحی حسنیؒ کی نمونہ کے طور پر بعض عربی اور اردو تحریریں پیش کی جاتی ہیں جس سے ان کے قلم کی شگفتگی ودلآویزی، زبان کی سلاست، اسلوب کی پختگی، قدرت تحریر وانشاء کے بارے میں بہت کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ان کی تحریر مبالغہ آرائی، غلو پسندی، تصنع، اغراق، شاعرانہ انشاء پردازی، مشکل پسندی، تشبیہات کی کثرت اور صنائع وبدائع کی رعایت سے پاک ہوتی ہے۔

ہم یہاں نزہۃ الخواطر کی آٹھویں جلد سے فخر المتاخرین مولانا عبدالحی فرنگی محلی کا تذکرہ نقل کرتے ہیں جن کی مجلسوں میں مصنف کو بار بار حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی، ان کے مواعظ سنے اور ان کے انتقال کے وقت بھی وہ لکھنؤ میں موجود تھے اور جنازہ میں شریک ہوئے۔

''مولانا عبدالحی کا سلسلۂ نسب یہ ہے کہ عبدالحی بن فخر الدین بن عبدالعلی بن علی محمد بن اکبر شاہ بن محمد شاہ بن محمد تقی بن عبدالرحیم بن ہدایت اللہ بن محمد اسحاق بن محمد معظم بن قاضی احمد بن قاضی محمود بن قاضی علاؤالدین بن امیر قطب الدین محمد ثانی بن صدر الدین بن زین الدین بن احمد بن علی بن قیام الدین بن صدر الدین بن قاضی رکن الدین بن امیر نظام الدین بن شیخ الاسلام امیر قطب الدین محمد المدنی ۔

مجھے ان کی مجلس میں ایک سے زائد بار حاضری کا موقع ملا ہے، ان کا حلیہ اس طرح ہے: چہرہ صباحت لئے ہوئے، سیاہ چشم، نگاہ گہری، دور بیں، رخسار لطیف ونازک، بال

لانبے، بے حد ذہین وذکی، پاک نفس ونرم دل، سحر بیان مقرر، معقول ومنقول میں متبحر، شریعت کی حکمتوں اور رموز واسرار سے آگاہ وباخبر، احکام ومسائل میں بے حد محتاط، ان کی شخصیت علم افتاء میں پورے ملک میں منفرد تھی، اور ان کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا، اور ہر جگہ کے اہل علم اس فن میں ان کی جلالت شان کے مداح اور معترف تھے، اصول وفروع میں ان کو دستگاہ کامل اور فضیلت تامہ حاصل تھی، اور فن تعلیم میں وہ اس مقام پر فائز تھے جہاں دوسروں کی رسائی نہ تھی، جب اہل علم ان کی خدمت میں جمع ہوتے اور کسی علمی موضوع پر علمی مباحثہ ہوتا تو خود خاموش رہتے اور دوسروں کی گفتگو سنتے رہتے، آخر میں سب ان کی طرف رجوع ہوتے اور ایک ہی جواب میں ان سب کی تشفی ہوجاتی، خلاصہ یہ کہ ان کی ہستی صحیح معنی میں نادرۂ روزگار اور ہندوستان کے لئے باعث افتخار تھی، ان کے فضل وکمال پر سب کا اجماع ہے۔

علامہ شبلی کا تذکرہ جو مصنف کے معاصر تھے دیکھئے کس شان سے لکھا ہے:

الشیخ الفاضل العلامة شبلي بن حبیب الله البندوي فرید هذاالزمان المتفق علی جلالته فی العلم والشان، آگے ان کی خصوصیات وکمالات کا یوں مرقع کھینچتے ہیں، حافظہ بڑا قوی تھا، بہت سریع الادراک تھے، دل کی بات پالینے اور متکلم کا مدعا سمجھ لینے میں کمال تھا۔ نظر باریک، استدلال قوی، ہم نشینوں اور اہل صحبت پر اس کا بڑا اثر پڑتا تھا۔ جس موضوع پر تبادلہ خیال کرتے، مخاطب ان کا ہم خیال بن جاتا، اگرچہ بعض اوقات اس مقصد کے لئے ان کے پاس قوی دلائل نہ ہوتے، تاریخ اسلام اور تمدن اسلامی پر ان کی نظر بڑی وسیع تھی، شعر وادب کا بڑا حصہ ان کو یاد اور نوک زبان تھا۔ مطالعہ بہت وسیع تھا۔ آداب اقوام وملل وفلسفۂ اخلاق کے موضوع پر کوئی کتاب مشکل سے ان کی نظر سے بچی ہوگی۔ حاضر جوابی، نکتہ سنجی، اور فارسی واردو اشعار کے برمحل پڑھنے میں ان کی نظیر مشکل سے ملے گی، معلومات میں وسعت پیدا کرنے اور مذاکرہ علمی وتصنیف وتالیف کا بے پایاں ذوق رکھتے تھے، اور تقریر وخطابت میں بھی مہارت تھی۔

دہلی اور اس کے اطراف: مصنفؒ کی نوجوانی کا سفرنامہ ہے، دہلی سے رخصت ہوتے وقت ان کا دردمند اور رواں قلم دل کھول کر روتا ہے، اس وقت ان کا زورِ قلم اور جوشِ تحریر اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ جاتا ہے وہ لکھتے ہیں:

اے دلی! اب ہم تجھ سے رخصت ہوتے ہیں، اے مرقعہ عبرت! اے تازیانہ غیرت، اے افسانہ حسرت، اے آئینہ حیرت، اے مسلمانوں کی گذشتہ اقبال مندیوں کے نمونے! اے لق ودق صحراء! اے مسلمانوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندے ہوئے میدان! اے درحقیقت مسلمانوں کی خاک پا، تیرا وہ پرانا جاہ وجلال کہاں، تیرے وہ دلاور کہاں ہیں جو راجپوت اور راٹھور بہادروں کی صفیں درہم برہم کردیتے تھے، تیرے وہ بزرگان دین کہاں ہیں جن سے روحانیت اور ملائکہ مصافحہ کرتے تھے، وہ اہل کمال کہاں ہیں جن سے استفادہ کرنے کو سارے جہاں سے لوگ آتے تھے، ہائے دلی، ہائے مردہ قوم کی یادگار، دلی تو ہی ہے جس میں قطب الدین ایبک کا تہور، شمس الدین التمش کی اولوالعزمی، غیاث الدین بلبن کی تدبیر مسلمانوں کے ظفر واقبال کا نمونہ تھی، تو وہی دلی ہے جس کے لعل وگوہر دربار اکبری کے زیب وزینت تھے، تو وہی دلی ہے جس کے خلجی وتغلق فرمارواؤں کی سطوت تمام عالم میں ضرب المثل تھی۔ اے خاک پاک دلی! تجھ میں سینکڑوں خانقاہیں اور مدرسے تھے۔ ان بزرگوں کو تو ہی نے اپنے آغوش تربیت میں پالا تھا، جن کی جوتیوں کی خاک ہماری آنکھوں کا سرمہ ہے، ہائے دہلی! یہ تیرا مرثیہ نہیں ہے، قوم کا مرثیہ ہے، اے ہماری شامت اعمال کی برباد شدہ دلی، کیا ہم پھر تیرا پچھلا جاہ وجلال دیکھ سکتے ہیں، ہم میں وہ فاروقی جلادت، خالدی جرأت، قومی اتفاق، اسلامی جوش، انسانی ہمدردی اب کہاں آسکتی ہے۔

افسوس کہ گل رخان کفن پوش شدند وز خاطر یک دگر فراموش شدند

آنانکہ بصد تاریخن می گفتند آیا کہ شنیدند کہ خاموش شدند

ان میں تہور (لاپروائی) تھا، ہم میں جبن ہے، ان میں جرأت تھی ہم میں نام مردی ہے، ان میں قومی اتفاق تھا، ہم میں نفاق، وہ پرجوش تھے ہم خاموش، ان میں انسانی ہمدردی تھی ہم میں بے دردی، وہ دین ودنیا کو توأم سمجھتے تھے ہم برہم، وہ غیور تھے ہم بے غیرت، ان میں فخر نہ تھا، ہم میں کبر ہے۔

فریب حسن سے کبر و مسلمان کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہمن بگڑا

رودادیں عام طور پر خشک و بے مزہ ہوتی ہیں اور جلسوں کے پروگرام کا یہ حصہ سب سے زیادہ بے لطفی اور گرانی کے ساتھ سنا جاتا ہے، لیکن مولانا سید عبدالحی صاحب ندوہ کے سالانہ جلسوں میں ناظم کی حیثیت سے جو روداد پیش کرتے تھے اس میں بہت سے ایسے جلسے ہوتے تھے جو اہل علم وادب کے ذائقہ شناسوں کے لئے بہت اہم ہوتے تھے، ندوۃ العلماء کے پونہ اجلاس منعقد ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۶ء کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

''یہ وہ سرزمین ہے جو تقریباً چار سو برس تک علوم وفنون اسلامیہ کا گہوارہ رہ چکی ہے اور اس سرزمین میں ایسے ایسے علماء کرام پیدا ہوئے ہیں جن کے علوم وفنون کی روشنی گجرات ودکن تک محدود نہیں رہی، بلکہ ان سے وسط ہندوستان تک پھیل کر ملک کے ایک ایک گوشے کو منور کر دیا ہے۔

حضرات! انقلاب زمانہ سے صورت حال متغیر ہوگئی ہے، مدرسے اور خانقاہیں دست برد زمانہ سے تباہ ہوگئی ہیں، وہ نفوس قدسیہ جنکے واسطے شاہان روئے زمین آنکھیں بچھائے تھے جنت نصیب ہو چکے، ان کی تصنیفات غذائے کرم بن چکی ہیں، ان کی اولاد علم وہنر سے بے بہرہ ہو چکی۔ خلاصہ یہ کہ علوم اسلامیہ کے منور چہرہ پر جہالت کا پردہ پڑ گیا، اور اس تاریکی میں مذہب سے بھی لوگ بے گانہ ہونے لگے۔''(۱)

---

(۱) حیات عبدالحی ص ۱۹۷

بلاشبہ علامہ سید عبدالحی حسنیؒ فخر الہند تھے۔ ایسی شخصیت پر ملک کو ناز ہوتا ہے۔ انہوں نے تنہا صرف ۵۴ سال کی عمر میں جو کام کئے بہت سی اکیڈمیاں نہیں کر پاتی ہیں، ملک پر ان کا احسان عظیم ہے کہ انہوں نے اپنی تصنیفات سے ہندوستان کے ایک ہزار سالہ کارناموں کو طاق نسیاں ہونے سے بچالیا۔

علامہ شبلی اور ندوۃ العلماء

(ولادت ۱۸۵۷ء وفات ۱۹۱۴ء)

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کسی حال میں محتاج تعارف نہیں ہے، ان کی ہمہ جہت، روشن اور شاندار زندگی کا ہر پہلو نہایت معروف ومشہور ہے، وہ روشن خیالی کے ساتھ روشن ضمیر بھی تھے، وہ اپنی تابناک زندگی میں یکتائے روزگار تھے، وہ وسیع الخیال، دوراندیش اور ایک شاداب اسلامی فکر کے نمائندہ تھے، وہ قدیم وجدید کے تقاضوں سے پوری طرح آشنا تھے، وہ اپنے عصر کے ممتاز عالم ومورخ اور ادیب تھے، وہ جس موضوع پر خامہ فرسائی کرتے اس کا حق ادا کردیتے اور ایسے نت نئے گوشوں کو عالم آشکارا کرتے کہ بڑے بڑے مورخین، اہل علم ودانش اور سنجیدہ فکر کے حامل حضرات بھی ششدر رہ جاتے، اور ان کا علمی لوہا ماننے اور ان کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوتے۔

انیسویں صدی میں اٹھارہ سو ستاون عیسوی اس ملک کی تاریخ آزادی کا ایک یادگار اور مشہور سال ہے، یہ اس ملک کی آزادی کی جدوجہد میں ایک نہایت تاریخی اہمیت کا زمانہ تصور کیا جاتا ہے، یہی زمانہ تھا جب انگریزی سامراج کے خلاف پورے ملک نے اور ملک کے ہر طبقہ نے بغاوت کا بگل بجایا تھا، اور ملک کو آزاد اور بااختیار بنانے میں ایک عظیم متحدہ کوشش ہوئی تھی، لیکن چند اسباب کی بنا پر یہ بغاوت ناکام ہوگئی، اور اہالیان ہند کو اور بغاوت کی قیادت کرنے والے علماء اور لیڈروں کو تختۂ دار پر چڑھا کر زبردست انتقامی کارروائی روبہ عمل لائی گئی، کہتے ہیں کہ اسی اٹھارہ سو ستاون عیسوی میں ۳؍جون ضلع اعظم گڑھ کے موضع بندول میں ایک خوشحال اور تعلیم یافتہ خاندان میں ایک بچہ کی ولادت ہوئی، والدین

نے ان کا نام شبلی رکھا، وہ اس خاندان کے ایک ہونہار فرزند تھے اور مستقبل میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر مرجع خلائق بنے، اور دنیا نے ان کو ''علامہ شبلی نعمانی'' کے نام سے پہچانا، اور وہ اپنے اس عہد میں ایک جامع اور باکمال شخصیت کی حیثیت سے ابھرے، اور مختلف جہات سے مسلمانوں کی قیادت کا فریضہ انجام دیا، اور جدوجہد آزادی میں ناکامی کی بنا پر یہاں کے مسلمانوں پر مایوسی اور افسردگی کی کیفیت کو مٹانے اور ان کو جوہر علم سے آراستہ کرنے میں اپنی تمام تر توانائیوں کو صرف کرنے میں مشغول ہوئے، انھوں نے عالم اسلام کو اپنے قلم کی جولانی اور اپنی فکر کی شادابی سے بہت کچھ عطا کیا۔ انھوں نے اپنی بیش قیمت اور یگانۂ روزگار تصنیفات کے ذریعہ تحقیق وادب کی دنیا میں انقلاب برپا کیا، اور ''سیرت نبوی'' کو سمجھنے اور اس کی گہرائیوں کا جائزہ لینے کے لئے انھوں نے علم وتحقیق کا ایک نیا باب کھولا، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور سیرت مبارکہ سے مستفید ہونے اور منہج اسلامی کا خوبصورت اور چمکدار چہرہ دیکھنے اور اس پاکیزہ اور بلند سراپا کو اسلام کے نام لیواؤں اور اسلامی زندگی کی نمائندگی کرنے والوں کو کس طرح اپنے اندر سمولینا چاہئے؟! اس کے لئے انھوں نے نہایت پختہ اور مؤثر اسلوب کو اپنی کتاب سیرت النبی کی دونوں جلدوں میں پیش کیا، اور علم وتحقیق کے میدان میں ایک نئی دریافت کا اضافہ کیا۔

علامہ شبلی نے اپنی زندگی کے آخری بتیس سال از ۱۸۸۲ء تا ۱۹۱۴ء کے درمیان علم وتحقیق کی دنیا میں ایک ایسا زندۂ جاوید نمونہ پیش کیا، جس کی مثال تاریخ کے اوراق میں شاذ ونادر پائی جاتی ہے، اور ہندوستان کی علمی تاریخ میں اس کو ایک درخشاں باب تصور کیا جاتا ہے، اور عہد جدید میں وہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، انھوں نے اسلامی معاشرہ کو اپنی خداداد صلاحیتوں سے ہر اعتبار سے باشعور بنانے کی کوشش کی، انہوں نے علی گڈھ اور ندوہ سے وابستہ رہ کر مقصدیت کی روح کو فروغ دینے میں ایک اہم کردار ادا کیا، جیسا کہ ان کے ہم عصر مؤرخ اور عالم وادیب علامہ سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۹۲۳ء (والد بزرگوار حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ) نے اسلامی

کتب خانہ کو اپنی تحقیقی اور تاریخی تصنیفات کے ذریعہ زینت بخشنے اور ہندوستان کے تاریخی اسلامی ورثہ سے اہل علم کو متعارف کرانے کا بے مثال کارنامہ انجام دیا۔

ان کی تصنیفات میں علم وتحقیق اور خالص اسلامی فکر وعقیدہ کا ایک دریا موجزن ہے، وہ اس ملک میں اسلامی ادب کے معمار اولین اور اس کے نمائندہ سمجھے جاتے ہیں، انہوں نے ادب وفلسفہ اور جدید علم کلام کے موضوع پر کتابیں لکھ کر اسلامی کتب خانے کو مالا مال کر دیا، صرف علامہ کی آخری عمر کی تصنیف سیرۃ النبی کو لے لیجئے، اس کی ترتیب وتالیف اور سیرت نبوی کی ہمہ گیریت کو ایک نئے انداز اور تحقیقی اسلوب میں پیش کرنے کے لئے انہوں نے کیا کیا جتن کئے، اس کا ایک ذرا سا خاکہ آپ ''حیات شبلی'' میں سید صاحب علیہ الرحمۃ کے قلم سے پڑھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ علامہ کو ذات نبی ﷺ سے کس قدر گہرا اور والہانہ تعلق تھا:

> ''۱۹۱۰ء سے جب وہ ہر طرف سے سمٹ کر سرکار رسالت اکے آستانہ پر حاضری کے لئے بے تاب ہو رہے تھے، ان کی ساری ذہنی توجہ دوسرے علمی وکلامی مباحث سے ہٹ کر صرف اسی ایک مرکز پر مجتمع ہوگئی تھی، ان کے پاس نہ اب ابن رشد وغزالی اور رازی وبوعلی سینا کا گذر ہے نہ تاریخ وکلام وفلسفہ کا نام ہے، شب وروز کتب احادیث وسیرت کا مطالعہ، تعلیمات نبوی کی ترتیب، اخلاق نبوی کی تحریر، سوانح نبوی کی تلاش اور سیرت نبوی کی نادر کتابوں کی جستجو، جہاں بیٹھتے کھری چارپائی ہو یا چٹائی ہو، ہر طرف حدیث کی کتابوں اور سیرت کے نسخوں کا ڈھیر ہوتا اور انہی درباریوں کی ہم نشینی میں ان کا سارا وقت گذر جاتا، اور خوش ہوتے کہ اب وہ ہیں اور دربار رسالت کا آستانہ (مکاتیب اول عبدالحکیم ۔۳) چنانچہ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، یہی ایک خیال ان پر چھا رہا تھا، یہی ان کی مجلس کی گفتگو تھی، اسی کے لئے خط وکتابت تھی، اس زمانہ سے لے کر اخیر عمر تک ان کے سارے خطوط ومکاتیب کو پڑھ ڈالئے ان میں تین باتیں آپ کو ملیں

گی، ندوہ کی اصلاح، اسلام کی اشاعت وحفاظت، اور سیرت نبوی، یہاں تک کہ دم نزاع بھی آخر لفظ جوان کی زبان سے نکلا وہ سیرت ہے، سیرت کی حیثیت ان کی نظر میں ایک کتاب کی نہ تھی، بلکہ وقت کے علم کلام کی سب سے بڑی ضرورت کا نام ان کی اصطلاح میں سیرت تھا، فرماتے ہیں:

''اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضینِ حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیر الٰہی تھا، اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے''۔(۱)

اس بنا پر ان کی اصطلاح میں سیرت کلمۂ اسلام کے دوسرے جز یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی پوری تفسیر وتشریح کا نام تھا، اور یہی ان کی اخیر زندگی کا کارنامہ تھا، اور اس کو وہ سرمایۂ سعادتِ دارین سمجھتے تھے۔(۲)

چودھویں صدی ہجری کے آغاز اور انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں جب اس ملک پر اسلامی علوم وفنون کے مراکز اور اسلامی عقیدہ کو مٹانے کے لئے انگریزی دورِ حکومت میں تعلیم کے دو الگ الگ نظریے کا فتنہ برپا ہوا، انگریز حکومت کے ذریعہ عیسائیت نے اپنا قدم جمایا، مشنریوں کے جال ہر طرف پھیل گئے، اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مناظروں کا سلسلہ شروع ہوا، علمائے اسلام عام طور سے اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف رہ کر اس فتنہ سے غافل تھے اور غیر اہم فقہی اختلافات میں الجھے ہوئے تھے اور بحث ومجادلہ کا بازار گرم تھا اور تکفیر وتفسیق کے فتوے جاری ہو رہے تھے، دین، عیسائیت کی تبلیغ اور اسلامی تعلیمات سے بے نیازی کے شکنجہ میں اپنی خوبصورتی اور ہمہ گیریت کے امتیاز کو کھو کر دیگر عام

---

(۱) مقدمہ سیرت

(۲) (حیات شبلی ص ۵۰۔۵۱) مکاتیب اول حصہ، اضافہ ۲

مذاہب کی طرح بے اثر اور زندگی سے محروم مذہب بن کر رہ گیا تھا کہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے فارغ التحصیل طلباء کی دستار بندی کی موقع پر چند نفوس قدسیہ مذکورہ صورت حال پر غور کر رہے تھے، ان میں سب سے محترم اور باکمال استاذ الاساتذہ حضرت مولانا نور محمد پنجابی، مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا سید محمد علی مونگیری، مولانا محمود الحسن شیخ الہند، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا حکیم سید محمد ظہور الاسلام فتحپوری، مولانا عبدالغنی خاں صاحب مئورشید آبادی، مولانا حکیم فخر الحسن صاحب گنگوہی، مولانا شاہ تجمل حسین دسنوی کے نام نامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ان منتخب علماء کے جلسہ میں طے پایا کہ باہمی مشورہ سے علماء کی ایک مجلس قائم کی جائے، چنانچہ وہ مجلس ندوۃ العلماء کے نام سے قائم ہوئی، جس کا بڑے پیمانہ پر ملک گیر اعلان کیا گیا، اور عوام وخواص ہر حلقہ میں اس کا زبردست استقبال ہوا، اس اعلان پر لبیک کہنے والوں میں ہندوستان کے زبردست عالم ومحقق، مدبر ومفکر علامہ شبلی نعمانی تھے، ان کو ندۃ العلماء کے مقاصد میں اپنا گوہر مقصود ہاتھ آ گیا، اور دل وجان سے مسلمانوں کے اندر اسلامی روح پیدا کرنے اور ان کی اصلاح میں لگ گئے، اور اپنی دیرینہ تمنا کو ندوۃ العلماء کے مقاصد میں برآتے ہوئے دیکھ کر اس قافلہ میں شریک ہو گئے، چنانچہ ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۴/اپریل ۱۸۹۴ء میں کانپور کے مدرسہ فیض عام میں منعقد ہوا، تو جلسہ کے تیسرے دن ۱۷/شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۷/اپریل ۱۸۹۴ء میں شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی نے چند تجاویز پیش کیں، اور ان پر غور وبحث ہونا قرار پایا، اس کی مختصر تفصیل حضرت سید صاحبؒ کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

> ''تیسرا جلسہ ۱۷/شوال مطابق ۲۷/اپریل کو صبح کو ہوا، مولانا لطف اللہ صاحب صدارت کی کرسی پر تھے، شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نعمانی نے اٹھ کر کہا کہ آج کے جلسہ میں حسب ذیل تجویزوں کا پیش اور ان پر غور وبحث ہونا قرار پایا ہے:
>
> پہلی تجویز: موجودہ طریقۂ تعلیم قابلِ اصلاح ہے۔
>
> دوسری تجویز: اس امر کی کوشش کی جائے کہ مدارس اسلامیہ کے

مہتمم ہر سال ندوۃ العلماء کے اجلاس میں شریک ہوں یا اپنے کسی مدرس یا وکیل کو بھیجیں۔

تیسری تجویز: اس امر میں سعی کی جائے کہ مدارس اسلامیہ جو کثرت سے جابجا قائم ہیں، ان کو ایک سلسلہ میں مربوط کرنے کے لئے دو تین بڑے بڑے مدرسے مثل مدرسہ دیوبند، مدرسہ فیض عام کانپور اور مدرسہ احمدیہ آرہ وغیرہ بطور دارالعلوم کے قرار دیئے جائیں، اور چھوٹے چھوٹے مدرسے ان کی شاخیں قرار دی جائیں، اور ان چھوٹے چھوٹے مدرسوں کی تمام کارروائی ان دارالعلوموں کی نگرانی میں رہے۔

چوتھی تجویز: مدرسہ فیض عام کانپور چونکہ باعتبار تعلیم نہایت اعلیٰ مرتبہ کا مدرسہ ہے اور بہ تعداد کثیر عربی پڑھنے والے طلباء اس میں موجود ہیں، لیکن مدرسہ کا مکان نہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف تعلیم میں حرج ہوتا ہے، بلکہ ان کی آسائش اور آرام کا کافی انتظام نہیں ہوسکتا، لہذا کل ہندوستان کے مسلمانوں کو بلحاظ محبت و ہمدردی ضروری ہے کہ مدرسہ فیض عام کے ایسے مکان بنانے کے واسطہ جس میں دوسو پردیسی طلباء رہ سکیں، حسب حیثیت چندہ دیں، اور مستحق ثواب ہوں۔"(۱)

علامہ شبلی کی دلچسپی اور ندوۃ العلماء کے تمام پروگراموں میں حصہ لینے کا سلسلہ برابر جاری رہا، ان کے مشورے اور ان کے خیالات سے مجلس ندوۃ العلماء کو برابر فائدہ پہونچتا رہا، اور تعلیم کے میدان میں ترقی اور نصاب تعلیم میں خاصی اصلاحات ہوئیں، انہوں نے اپنی دیگر مصروفیات سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنے آپ کو سراپا ندوہ کی خدمت اور اس کے پروگراموں میں مقصدیت کی روح پھونکنے کے لئے تیار کرلیا۔

ندوۃ العلماء کے ایک اہم ترین تعلیمی شعبہ کو بروئے کار لانے کے لئے اور مروجہ نصاب تعلیم میں اصلاح اور تبدیلی کا عمل شروع کرنے کے لئے دارالعلوم کا قیام ایک ناگزیر

---

(۱) حیات شبلی ۳۰۷۔۳۰۹

ضرورت تھی، اس کا اصل مقصد صرف یہ تھا کہ زمانہ کے تقاضوں اور رجحانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسا نصاب تعلیم تیار کیا جائے جس کے ذریعہ دعوت اور اسلام کی صحیح ترجمانی اور مغربی تہذیب کے اس دور میں اسلامی تہذیب کی بالادستی قائم رکھنے کی صلاحیت علماء کے اندر زیادہ اچھے موثر انداز سے پیدا ہو سکے، علامہ کے نزدیک یہ ایک بہت بڑا انقلابی عمل تھا، اور اس کو جاری کرنے کے لئے دارالعلوم کا قیام از حد ضروری قرار دیا گیا، چنانچہ ندوۃ العلماء کا تیسرا اجلاس منعقدہ شہر بریلی بصدارت مولانا محمد لطف اللہ صاحب منعقد ہوا، یہ ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۶ء کا زمانہ ہے، اجلاس کے دوسرے دن ۲۷ر شوال ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۲ر اپریل ۱۸۹۶ء کو مولانا عبدالحق حقانی نے دارالعلوم قائم کرنے کی تجویز پیش کی، اور علامہ شبلی نے اس کی تائید میں اور دارالعلوم کی ضرورت کے موضوع پر تقریر فرمائی، اس میں نئے تعلیم یافتہ اور پرانے علماء دونوں کو مخاطب فرمایا، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اور دیگر علمائے ندوہ نے اس تجویز سے متعلق تقریریں کیں اور طے ہوا کہ ''مجلس دارالعلوم'' کے نام سے ایک الگ مجلس قائم کی جائے، اس کے قواعد وضوابط تیار کرنے کے لئے علامہ شبلی کو مکلّف بنایا گیا، تاکہ وہ تمام ارکان کے پاس بھیج کر منظور کرائے جاسکیں، اور ندوۃ العلماء کے چوتھے اجلاس میں جو میرٹھ میں شوال ۱۳۱۴ھ مطابق مارچ ۱۸۹۸ء میں منعقد ہوا، اس میں ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم قائم کرنے کے لئے لکھنؤ شہر کا انتخاب کیا، اور ایک وفد ترتیب دیا گیا تاکہ وہ لکھنؤ جاکر دارالعلوم قائم کرنے کے لئے کوئی مناسب زمین دیکھ کر اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے، چنانچہ اس پر عمل ہوا، اور دارالعلوم کے قیام کا خواب حقیقت بن کر رہا۔

علامہ شبلی بحیثیت معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء

دارالعلوم قائم ہونے کے بعد اس کے معتمد تعلیم کی حیثیت سے علامہ شبلی کا انتخاب عمل میں آیا، اور وہ ۱۵ر صفر ۱۳۲۳ھ مطابق اپریل ۱۹۰۵ء کو باقاعدہ معتمد تعلیم منتخب ہوئے، اس اہم عہدہ کے لئے علامہ کا نام مولانا غلام محمد فاضل ہوشیار پوری نے جلسۂ انتظامیہ میں

پیش کیا تھا، اور جملہ ارکان نے بالاتفاق اسے منظور کیا، اور طے پایا کہ مولانا سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنا بیشتر وقت لکھنو میں گذاریں، چنانچہ باقاعدہ انتخاب کے بعد وہ ۱۹۰۵ء کے شروع ہی میں لکھنؤ آ گئے اور قدیم دارالعلوم کی عمارت جو گولہ گنج میں تھی اور خاتون منزل کے نام سے مشہور تھی اس کی بالائی منزل پر ایک کمرہ میں قیام فرمایا اور جدید نصاب مرتب کرنے کے لئے قدیم عربی نصاب کے نقائص کو پیش کر کے نئے نصاب تعلیم کو مرتب کیا، ندوۃ العلماء کے تخیل کے مطابق اصلاح نصاب کے سلسلہ میں ملک کے مشہور علماء سے استصواب کیا گیا تھا اور رجب ۱۳۲۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۰۲ء میں امرتسر میں اصلاح نصاب کے موضوع پر اکابر علماء کا ایک جلسہ ہوا، سب نے اصلاح نصاب کی ضرورت کا اعتراف کیا، اس کے بعد ۱۳۲۱ھ مطابق جنوری ۱۹۰۴ء میں شہر مدراس میں دوسرا جلسہ منعقد ہوا، جس میں اصلاح نصاب کی ترتیب کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے ارکان مولانا عبدالقیوم حیدرآبادی، مولانا سید عبدالحی حسنی اور مولانا شبلی نعمانی تھے، اس کمیٹی نے مولانا شبلی نعمانی کی ترمیمات کو پیش نظر رکھ کر نصاب تیار کیا، وہ حسب ذیل خصوصیات پر مشتمل تھا:

''(۱) ادب اور فن بلاغت کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا گیا، مختصر المعانی کے علاوہ دلائل الاعجاز، اعجاز القرآن باقلانی اور نقد الشعر درس میں داخل کی گئی۔

(۲) تفسیر بیضاوی کے ۱۵/ پارے درس میں داخل کئے گئے، مصر میں اس زمانہ میں ایک نہایت مفید کتاب تالیف کی گئی تھی، جس کا نام ''الصراط المستقیم'' ہے، اس میں قرآن مجید کی صرف آیتیں جمع کر کے ان کی مختصر تفسیر لکھی ہے جو فقہ، کلام اور اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں، اس سے خاص قرآن مجید کی منصوص فقہ، کلام اور اخلاق کے مسائل معلوم ہو جاتے ہیں۔ یہ کتاب بھی درس میں داخل کی گئی۔

(۳) عقائد میں پہلے ابن رشد کی ''کشف الأدلۃ'' اور اقتصاد امام غزالی داخل کی گئی تھیں، لیکن اب اس کے بجائے امام رازی کی ''معالم فی أصول الدین'' رکھی گئی۔

(۴)فلسفہ میں "هديه سعيديه"، "شرح حكمة العين" اور "شرح حكمة الاشراق" داخل کی گئی، اس اخیر کتاب میں اشراقیوں کا فلسفہ ہے جس کے متعلق درس قدیم میں کوئی کتاب داخل نہ تھی۔

(۵)اسرارِ شریعت میں "حجة الله البالغة" نصاب میں رکھی گئی۔

(۶)فلسفۂ جدیدہ میں "درس الأولية" رکھی گئی، اس میں سائنس کے جدید مسائل ہیں، اور بیروت سے چھپی ہے۔

(۷)انگریزی زبان ضروری قرار دی گئی۔

نصاب قدیم میں کسی تغیر اور اصلاح کا گوارا کرنا لوگوں کو اس وقت شاق تھا کہ گو یہ نصاب ۱۹۰۴ء میں منظور ہو چکا تھا، لیکن اس پر عمل نہیں ہوا تھا، مدرسین وہی قدیم کتابیں پڑھاتے تھے، یہاں تک کہ مولانا نے حیدرآباد سے آکر ندوہ میں قیام کیا اور جبریہ حکم دیا، جب جا کر اس کی تعلیم جاری ہوئی، اس پر بھی بعض مدرسین خارج شدہ کتابیں پڑھایا کرتے جس کو بڑی سختی سے روکا گیا۔

ایسے علماء جو موجودہ زمانہ میں اپنے علمی وقار کو قائم رکھ سکیں، غیر ملکوں میں بلکہ خود اپنے ملک میں بھی اسلام کی تبلیغ کے فرض ادا کر سکیں، معترضینِ اسلام کے جوابات دے سکیں، اور نئے تعلیم یافتوں کی تشفی کر سکیں، بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ انگریزی زبان سے تھوڑی واقفیت رکھیں، اس خیال کی بنا پر مولانا نے دارالعلوم کے نصاب میں انگریزی کے داخل کئے جانے پر بہت زور دیا"۔(۱)

علامہ شبلی نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنی دوراندیشی سے آنے والے زمانے کے تقاضوں کا ادراک کر کے ہندی اور سنسکرت کی تعلیم کو بھی نصاب تعلیم میں داخل کیا، اور دارالعلوم میں باقاعدہ اس کا درجہ قائم کیا، اسی طرح مولانا نے مصر و شام کے سفر میں

(۱) حیات شبلی ۴۱۴۔۴۱۶

بول چال اور روزمرہ کی عام زندگی کے لئے جس عربی زبان کی ضرورت تھی اسکو سیکھنے اور پڑھانے کی ضرورت کو محسوس کیا، اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے عربی میں استعمال ہونے والے نئے الفاظ کی ایک فرہنگ تیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا، اور اپنے شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو مکلّف کیا کہ وہ ''لغات جدیدہ'' کے نام سے ایک ڈکشنری تیار کریں، اور ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کے اجلاس دہلی میں اس تجویز کو منظور کرا کے اس پر کام کرنے کی ہدایت کی گئی، چنانچہ انہوں نے ''لغات جدیدہ'' کے نام سے ایک کتاب تیار کی جو ہندوستان کے عربی مدارس کے حلقوں میں مقبول ہوئی۔

علامہ شبلی نے اپنی معتمدی کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے اور تعلیم و تربیت اور دعوت وفکر کے میدان میں ہونہار اور ذہین طلباء کو تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا، اور اس کے لئے جن وسائل کی ضرورت تھی ان کو فراہم کرنے میں اپنی طاقت کو صرف کیا، اور مختلف النوع شعبوں کا اضافہ کر کے ندوۃ العلماء کے ہمہ گیر تخیل کو فروغ دینے اور اسکو ایک حقیقت ثابت کرنے کی سعی بلیغ کی انہوں نے اپنی معتمدی کے پہلے ہی سال میں چند ممتاز طلبہ کی تربیت پر اپنی خاص توجہ صرف کی، ان میں مولانا ضیاء الحسن علوی (انسپکٹر مدارس عربیہ الہ آباد) مولانا عبدالسلام ندوی، اور مولانا جواد علی خان عالی، قابل ذکر ہیں۔

تحریر کے ساتھ تقریر کی مشق کی طرف بھی مولانا نے خاص توجہ مرکوز کی، اور بذات خود اس شعبہ کی نگرانی کر کے مقررین کی ایک جماعت تیار کر ڈالی، ان مقررین میں چند کے نام یہ ہیں۔

مولانا عبدالباری بہاری، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالسلام ثانی (ایم، اے، ایل، ایل بی اعظم گڑھ) مولانا سید نجم الہدی دسنوی، مولانا محمد حسن اعظمی، خواجہ عبدالواحد کانپوری۔

درس و تدریس میں لائق و فائق مدرسین کی ایک جماعت بھی تیار ہوئی، اس کے لئے درجۂ تکمیل بطور ایک مستقل شعبہ کے قائم کیا گیا، اور یکم مئی ۱۹۰۹ء کو منعقد جلسۂ انتظامیہ میں اس

درجہ کا نصابِ تعلیم تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی، اس کمیٹی کے تجویز کردہ نصاب کو علمائے ہند کی خدمت میں بھیج کر ان کی رائے معلوم کی گئی اور اس کی روشنی میں بروقت علم کلام اور علم ادب میں تکمیل کا نصاب مقرر ہوا، اور اس کو جلسۂ انتظامیہ منعقد ۳۰ر جون ۱۹۰۹ء میں پاس کر کے جاری کرایا گیا، یہ نصاب مندرجہ ذیل ہے اور ''حیات شبلی'' میں دیئے ہوئے اس نصاب کو یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نصاب علم کلام برائے تکمیل

شرح مقاصد علامہ تفتازانی، تھافت الفلاسفہ امام غزالی وابن رشد

کتاب الصفات امام بیہقی برائے مطالعہ، رسائل اربعہ امام غزالی برائے مطالعہ

بحث عصمت انبیاء ازملل ونحل علامہ ابن حزم برائے مطالعہ، کتب آریہ مثلاً ستیارتھ پرکاش

تلخیص المقال وکشف الأدلة ابن رشد، واظہار الحق از مولانا کیرانوی برائے مطالعہ

حدیقة فکریة برائے مطالعہ، کتاب الروح ابن القیم برائے مطالعہ

علم ادب

دیوان امرئ القیس ونابغة ذیبانی وعلقمة الفحل، موازنہ ابی تمام وبحتری

عروة بن الورد والفرزدق، عقد الفرید ابن عبدربہ برائے مطالعہ

کتاب الصناعتین، ابوہلال عسکری، مشق نظم ونثر

أسرار البلاغة عبدالقاہر جرجانی (حیات شبلی ۴۲۸_۴۲۹)

درجۂ تکمیل کی افادیت نمایاں طور پر محسوس ہوئی، اور علامہ شبلی کے ذہن میں دوسرے علوم وفنون کے لئے بھی نصاب تیار کرانے کا جذبہ پیدا ہوا، چنانچہ ۱۹۱۲ء میں علم تفسیر کا درجۂ تکمیل کھولا گیا، اور فقہ واصول فقہ میں تکمیل کے لئے بھی نصاب بنایا گیا، اور

اس کا خاطر خواہ فائدہ ظاہر ہوا، اس لئے کہ مولانا علوم قرآن پر توجہ مرکوز کرانے کے لئے بہت زیادہ سنجیدہ تھے اور جوں ہی امام باقلانی کی کتاب ''اعجاز القرآن'' مصر سے چھپ کر آئی تفسیر کے درجۂ تکمیل میں اس کو داخل کرادیا، اسی کے ساتھ قرآن کریم کا درس بھی نصاب میں داخل کیا گیا، اور خود بھی قرآن کریم کا درس دینا شروع کیا، اس درس میں اکثر طلباء وبعض مدرسین بھی شریک ہوتے تھے، اور ہر مسئلہ پر پوری بحث ہوتی تھی، اس موضوع پر انہوں نے خاصی توجہ مرکوز کی تھی، اور علوم قرآن میں مہارت رکھنے والے اساتذہ سے بھی قرآن کے درس کی درخواست کرتے تھے جیسے مولانا حفیظ اللہ صاحب بندولی، مولانا حمید الدین صاحب فراہی اور مولانا ضیاء الحسن علوی صاحب وغیرہ۔

کتب خانہ ندوۃ العلماء کی توسیع

علامہ کو مختلف موضوعات پر کتابوں کی فراہمی اور ان کے مطالعہ سے جو شغف تھا وہ اظہر من الشمس ہے اور کتب خانہ کو ہر موضوع پر وسیع کرنے اور زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کے سلسلہ میں اپنی توجہات کو مرکوز کیا، اور ہندوستان کے مشہور اہل علم کے کتب خانوں کو ندوہ کے کتب خانہ میں ضم کرانے کی کوشش کی اور بڑی حد تک کامیابی ہوئی اور جلد ہی کتب خانۂ ندوۃ العلماء ایک بڑا اور اپنے مراجع اور بنیادی کتابوں کی حیثیت سے مشہور ومعروف ہوگیا، اس کام کے لئے علامہ شبلی نے کتابوں کے ساتھ ساتھ عطیات بھی قبول کئے اور باہر سے ضروری اور مفید کتابیں جو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی تھیں منگوا کر کتب خانہ کو مزین کیا، اور اس کو وسعت عطا کی، یہی وجہ ہے کہ آج یہ کتب خانہ علامہ شبلی کے نام سے موسوم ہے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں اس کو ''کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی'' کے نام سے موسوم کیا گیا اور اس کی وسعت میں برابر اضافہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ آج مطبوعات اور مخطوطات کا ایک ذخیرہ موجود ہے اور کل کتابوں کی تعداد دو لاکھ (۲۰۰۰۰۰) سے بھی زائد ہے۔

ماہنامہ الندوہ کا اجراء

ندوۃ العلماء کے تخیل کو اپنانے اور اسکو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی راہ میں اردو زبان میں ایک علمی اور تحقیقی ماہنامہ شائع کرنے کا شدید تقاضہ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ذہن میں تھا، چنانچہ ۱۹۰۴ء مطابق ۱۳۲۲ھ میں ان کی تحریک سے الندوہ کے نام سے ایک رسالہ کا اجراء عمل میں آیا اور اگست ۱۹۰۴ء مطابق جمادی الاولی ۱۳۲۳ھ میں اس کا پہلا شمارہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی ادارت میں منظر عام پر آیا، علامہ شبلی کو اس وقت شریک ادارات نہیں کیا گیا اس کمی کو دوسرے ارکان نے محسوس کیا اور بالآخر ۱۹۰۴ کے آخر میں الندوہ کا مقام اشاعت شاہجہان پور طے ہوا، جہاں مولانا سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ مددگار ناظم کی حیثیت سے ناظم ندوۃ العلماء کے ساتھ قیام پذیر تھے، ناظم اور مددگار ناظم کے مشورہ سے رسالہ کے دو ایڈیٹر مقرر ہوئے، ایک مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی جو اُن دنوں علی گڑھ میں تھے دوسرے علامہ شبلی نعمانی جن کا قیام حیدرآباد میں تھا۔

اس رسالہ کی افادیت اور اس کے علمی دوررس اثرات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں جو مختصراً پیش کیا جارہا ہے:

> ''پرچے میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل ونقل کی تطبیق، معقول ومنقول اور قدیم وجدید علوم کے موازنہ اور عربی نصاب کی اصلاح پر بہت سے محققانہ مضمون شائع ہوئے، جو زیادہ تر مولانا شبلی مرحوم ہی کے قلم سے نکلے تھے، اس رسالہ نے شاید سیکڑوں برس کے بعد علماء کی سطح جامد میں حرکت پیدا کی تھی، اب تک علماء کے تحقیقاتی مسائل منطق، عقائد اور فقہ کے چند ایسے مسائل قرار پائے ہوئے تھے جن میں گو بہت لکھا جاچکا تھا پھر بھی جو آتا تھا وہ انہی کو دہرا دہرا کر اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتا تھا، وہ فلسفہ کی بعض درسی کتابوں کی شرحیں لکھنا، حاشیے لکھنا، تعلیقات لکھنا، مناظرانہ رسائل تالیف کرنا یہ علماء کے مشاغل تھے،

حالانکہ زمانہ کا رخ ادھر سے ادھر پھر چکا تھا اور حالات نے اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت میں کچھ اور ہی ضروریات پیدا کر دیئے تھے، الندوہ کا بڑا فیض یہ ہے کہ اس نے علمائے کرام کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا، اور ان کو کتنی ہی ناگواری ہوئی ہو اور ان کی پیشانی پر کتنے ہی بل پڑ گئے ہوں لیکن انہوں نے اس کو پڑھا اور پڑھنے پر مجبور ہوئے۔''

اس سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ علماء کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کھلا، اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے نئے طریقہ ان کو نظر آئے، زبان و بیان کے انداز اور پیرائے معلوم ہوئے اور جو اس کو پسند کرتے تھے وہ بھی اور جو نہیں پسند کرتے وہ بھی اسی کو پڑھ کر اس کے مطابق لکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

الندوہ کا اثر خصوصیت کے ساتھ نوجوان علماء اور قریب فارغ التحصیل طلبہ پر بیحد پڑا، اور نام نہیں لوں گا، مگر بتا سکتا ہوں کہ بڑے بڑے مقدس آستانوں اور درس گاہوں کے حاشیہ نشینوں نے اس کے طرز نگارش اور پیرایۂ بیان کی نقل اتاری اور اپنے اپنے دائرہ میں ناموری حاصل کی، اور ان سے دین وملت کو فائدہ پہونچا۔

خود دارالعلوم کے طالب علم کو اس سے بہت فائدہ پہنچا، اور کئی مستعد طالب علم کی جو اس وقت کے مشہور مصنف ہیں بسم اللہ اسی دبستان میں ہوئی، اور اس طرح اہل علم کی بھری محفل میں ان کو زبان کشائی کی جرأت ہوئی، چند ہی نمبروں کے بعد اہل نظر کی نگاہیں الندوہ کی اس افادی حیثیت پر پڑیں، الندوہ میں علم حدیث پر دارالعلوم کے ایک طالب علم (سید سلیمان بہاری) کا جو مضمون چھپا تھا اس کو پڑھ کر مولانا حالی نے مولانا کو لکھا: سب سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ دارالعلوم نے اپنے تعلیم کا نہایت عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا، فبارك

الله فیها وفی طلبتها وفی تعلیمها ، مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ عربی کی کامل تعلیم اور انگریزی کی بقدر ضرورت ہماری قوم میں ایسے لائق مضمون نگار اور مصنف پیدا کرے گی کہ محض انگریزی تعلیم آج تک ویسا ایک بھی نہیں پیدا کر سکی''۔(۱)

الندوہ کی اشاعت کے کچھ دنوں بعد مولانا ابوالکلام آزاد اس کے سب اڈیٹر مقرر ہوئے، اور چند مہینے اس کی ادارت میں حصہ لینے اور اس میں مضامین لکھنے کا اثر یہ ہوا کہ وہ تمام علمی اور صحافتی حلقوں میں روشناس ہو گئے، اور علامہ شبلی کی تربیت میں رہ کر وہ بام عروج تک پہونچے، اور الہلال کے اڈیٹر کی حیثیت سے ان کا طائر شہرت آسمان سے باتیں کرنے لگا، سید صاحب لکھتے ہیں:۔

''اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی الندوہ کے سب ایڈیٹر رہے، اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے، ۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی سے بمبئی میں ملے اور یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی کہ ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا، مولانا شبلی مرحوم ان کو اپنے ساتھ ندوہ لائے، اور ایک زمانہ تک ان کو اپنے پاس رکھا، وہ ان کی خلوت وجلوت کی علمی صحبتوں میں شریک رہتے اور اپنی مستثنیٰ فطری صلاحیتوں کی بدولت ہر روز آگے بڑھتے جاتے تھے، یہیں انہوں نے مولانا حمید الدین صاحب کے ساتھ کچھ دن بسر کیے، جن کو قرآن پاک کے ساتھ عشق کامل تھا، اور اس عشق کا اثر صحبت کی تاثیر سے مولانا ابوالکلام میں بھی سرایت کر گیا، اور یہی رنگ تھا جو نکھر کر الہلال میں نظر آیا''۔(۲)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''حیات عبدالحی''

---

(۱) حیات شبلی ۴۴۰۔۴۴۲

(۲) حیات شبلی ۴۴۳۔۴۴۴

میں علامہ شبلی کے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی معتمدی کے دور کی علمی اور ادبی ترقیوں کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ کیا ہے، اور عقیدت واعتراف کے اسلوب میں ان کے کارناموں کو شمار کرایا ہے، مولانا کے قلم گہربار سے ''حیات عبدالحی'' کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:۔

''عرصہ سے اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ایک ایسا شخص جو ندوۃ العلماء کے مقاصد سے ذہنی طور پر ہم آہنگ ہو، اور تعلیم وتدریس کا عملی تجربہ رکھتا ہو، اسی کے ساتھ طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کو ابھارنے، ان کو مناسب طریقہ پر نشوونما دینے اور ان میں صحیح علمی ذوق پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، دارالعلوم میں مستقل قیام کرے، اساتذہ وطلباء سے براہ راست ربط ہو اور وہ ان کے اور مجلس انتظامیہ کے درمیان رابطہ کا کام دے علامہ شبلی معتمد دارالعلوم منتخب ہوئے تھے، اپنے عہدہ کے لحاظ سے بھی اور اپنی یگانہ صلاحیتوں اور علمی امتیاز کی بنا پر بھی وہ اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھے، اس لئے انہیں سے یہ خواہش کی گئی کہ وہ اس ذمہ داری کو قبول کریں، وہ جب سے علی گڑھ سے یکسو اور حیدرآباد کے تعلق سے بددل ہوئے تھے اور ندوۃ العلماء اور اس کے دارالعلوم کو انہوں نے اپنی تمناؤں کی تکمیل کا سب سے موزوں میدان سمجھا تھا خود ان کی بھی خواہش تھی کہ وہ یہیں آکر بیٹھ جائیں اور اپنی ساری صلاحیتیں اسی مقصد کی تکمیل کے لئے صرف کردیں، جو ان کے فکر ونظر کے بھی مطابق تھا، اور ان کی تعلیم وتربیت اور ذوق ورجحان کے بھی، ان کو اپنے کو کلی طور پر یکسو کرنے کے لئے کچھ وقت لگا، لیکن بالآخر صفر ۱۳۲۳ھ اپریل ۱۹۰۵ء میں وہ باقاعدہ معتمدِ تعلیم کی حیثیت سے دارالعلوم کی عمارت (خاتون منزل گولہ گنج) میں منتقل ہوگئے، اور باقاعدہ قیام شروع فرمادیا۔

علامہ شبلی کے دارالعلوم میں مستقل طور پر آجانے سے طلباء میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی، ان کی طاقتور اور دلآویز شخصیت طلباء کے سامنے خضر راہ

بن کر آئی، ان میں مطالعہ، مضمون نگاری اور تقریر کا ذوق پیدا ہونے لگا، مطالعہ میں تنوع اور معلومات میں وسعت پیدا ہوئی، ان کی مجلسیں جو علمی مسائل، کتابوں اور مصنفین کے تذکرے، کلامی و تاریخی مباحث اور شعر وسخن اور ادبی چاشنی سے کبھی خالی نہیں ہوتی تھیں، ہونہار طلباء کے لئے بڑی کشش رکھتی تھیں، اس کا نتیجہ تھا کہ ذہین اور حوصلہ مند طلباء جو یوپی اور بہار کے پرانے علمی خاندانوں اور آسودہ حال گھرانوں سے ندوہ کو قدیم وجدید علوم کی ایک جامع درسگاہ سمجھ کر آئے یا بھیجے گئے تھے، ان کے گرویدہ اور عقیدت مند ہونے لگے، اور مولانا کی بھی ان نوجوانوں پر جن کو وہ جوہر قابل سمجھتے تھے تربیت وعنایت کی خاص نظر رہتی اور وہ ان کی اندرونی صلاحیتوں کو ابھارنے اور پروان چڑھانے میں مصروف رہتے، کسی سے مضمون لکھواتے، کسی کو تقریر کے لئے تیار کرتے، کسی کو مطالعہ کا مشورہ دیتے، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا بعد السلام ندوی، مولوی ضیاء الحسن علوی ندوی (ایم۔اے علیگ وانسپکٹر مدارس عربیہ) مولانا عبدالباری ندوی، مولانا مسعود علی ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد (جو ندوہ کے طالب علم کبھی نہیں رہے، لیکن الندوہ کے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے دارالعلوم کی اسی عمارت میں مقیم اور مولانا کی علمی اور ادبی مجلسوں کے مستقل شریک وحاضر باش تھے) مولوی اکرام اللہ خاں ندوی، حاجی معین الدین ندوی وغیرہ اسی دور کی یادگار ہیں، جو اپنی اپنی فطری صلاحیتوں اور ذوق کے مطابق نمایاں و نامور ہوئے۔

ندوۃ العلماء کے دائرہ کار، اس کے جلسوں کی رونق اور اس کے دارالعلوم کی توسیع وترقی میں بھی نمایاں اضافہ ہوا، رسالہ ''الندوہ'' کے وقار واعتبار سے (جو اس دور کا سب سے بلند پایہ علمی و دینی رسالہ سمجھا جانے لگا تھا) اور دارالعلوم کی شہرت میں بھی ترقی ہوئی، اشاعت اسلام کی تحریک

(جو شروع سے ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد میں شامل تھی) میں بھی کچھ جان پیدا ہوئی، کچھ ایسی تجویزیں بھی ندوۃ العلماء کے جلسوں اور اس کے اسٹیج پر آئیں جن سے لوگوں کو محسوس ہوا کہ ندوہ کی تحریک صرف ایک درسگاہ کے حدود میں محدود نہیں، بلکہ اس کا مسلمانوں کی پوری ملی زندگی سے تعلق ہے، مثلاً وقف علی الاولاد کے قانون کی ترتیب اور اس کے منظور کرانے کی کوشش، قرآن مجید کے تراجم پر اصلاحی و علمی و نظر، انگریزی کے ایک مستند ترجمۂ قرآن کی تکمیل، سرکاری مدارس میں دینیات کی تعلیم کا ندوۃ العلماء کی نگرانی میں انتظام، نماز جمعہ کے لئے مسلمان ملازموں کی چھٹی دیئے جانے کی تجویز وغیرہ وغیرہ جس کے تخیل میں بلاشبہ علامہ شبلی کا وسیع اور بلند حوصلہ ذہن پیش پیش تھا''۔(۱)

ندوۃ العلماء سے علامہ شبلی کے بے لوث اور وسیع تعلق کا ایک سرسری خاکہ اس چھوٹے سے مضمون کے ذریعہ پیش کیا گیا، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر لکھنے کے لئے ایک دفتر بھی کافی نہ ہوگا۔ع

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

علامہ شبلی نے ندوۃ العلماء کی توسیع و ترقی اور اس کے دارالعلوم کو ہمہ جہت علمی اور دعوتی مرکز بنانے کی راہ میں اپنا بیش قیمت وقت صرف کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اسلام کی شرح و ترجمانی کرنے کے لئے علماء کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتے تھے جو جامعیت اور اسلامی فکر کی صحیح نمائندگی کر کے اسلام کو انسانی زندگی کا دائمی دستور العمل ثابت کر سکے اور یہ ثابت کرے کہ وہ عالم انسانیت کے لئے زندگی کا پیغام ہے اور اس کے تمام مسائل موجودہ یا آنے والے کا حل بھرپور طریقہ سے اس میں موجود ہے، اور اسی کی اتباع میں صراطِ مستقیم کا راز مضمر ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد عالی ''وأن هذا صراطي مستقيماً فاتبعوه ولاتتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله'' کی مکمل تفسیر اس میں موجود ہے۔

(۱) حیات عبدالحی ۱۶۰۔۱۶۲

علامہ سید سلیمان ندویؒ

تحریک ندوۃ العلماء کے اہم ترین رکن اور تحریک خلافت کے علمبردار

(ولادت ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۲ء وفات ۱۹۵۳ء)

علامہ سید سلیمان ندویؒ گذشتہ صدی کے نہایت بلند پایہ عالم دین، محقق اور سیرت نگار تھے، وہ دین و دنیا کی فکر کے جامع تھے، ان کا شمار اس عصر کی نادرۂ روزگار شخصیتوں میں ہوتا ہے، وہ ایک طرف زبردست عالم دین، اسلام کے داعی، مفکر اور محقق و ادیب تھے تو دوسری طرف سیاسی بصیرت میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے، مسلمانوں کے مسائل سے متعلق ملی غیرت، حالات حاضرہ پر مبصرانہ اور گہری نظر ان کا طرۂ امتیاز تھا، وہ داعیانہ صفات کے ساتھ قائدانہ صلاحیتوں کے پوری طرح جامع تھے، اور ان تمام خصوصیات میں متوازن فکر اور طریقۂ عمل ان کا خاص وصف سمجھا جاتا تھا، وہ تحریک ندوۃ العلماء کے روح رواں، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے قلب و زبان، اور دارالقضاء بھوپال کے رئیس القضاۃ تھے، علمی اور تحقیقی صحافت، زبان و بیان کی مہارت اور ادب و انشاء کی لطافت میں ان کا مقام بہت بلند تھا، علم کی پختگی، مطالعہ کی وسعت اور کتاب و سنت پر گہری نظر کے ساتھ ورع و تقوی، تواضع اور کسر نفسی اور تعلق باللہ کا ایک حسین امتزاج ان کی زندگی میں موجود تھا، سید صاحب کی زندگی کا سب سے نمایاں اور قابل ذکر وصف ان کی یہی جامعیت ہے، جیسا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سید صاحب پر اپنے تأثرات کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''سید صاحب کی زندگی کا سب سے نمایاں اور ممتاز پہلو طبقۂ علماء

میں ان کی جامعیت ہے اور ان کے علوم ومضامین کا تنوع ہے، ان کی ذات اور ان کی علمی زندگی میں قدیم وجدید کی واقفیت، علمی تبحر اور ادبی ذوق، نقاد و مورخ کی حقیقت پسندی اور سنجیدگی، ادباء وانشاء پردازوں کی شگفتگی اور حلاوت اور فکر ونظر کا لوچ اور مطالعہ کی وسعت اس طرح جمع ہوگئی تھی جو شاذ و نادر جمع ہوتی ہے۔''

پرانے چراغ حصہ اول میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سید صاحبؒ کے حلیہ ولباس کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''قد میانہ مائل بہ پستی، چہرہ سے معصومیت اور شرافت نمایاں، لباس نہایت صاف ستھرا، ہر چیز نفاست اور نستعلیقی پر دال، شیروانی کسی قدر لانبی، عمامہ سر پر نہایت سفید اور صاف، اور اس کے پیچ نہایت خوبصورتی سے دئے ہوئے۔''

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ۱۹۰۱ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا، اور پانچ سال احاطۂ دارالعلوم میں رہ کر سند فراغت حاصل کی، ندوہ میں آپ کے اساتذہ میں مفتی عبداللطیف سنبھلی، سید علی زینبی، مولانا شبلی فقیہ جیراجپوری، مولانا حفیظ اللہ اعظمی، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی اور مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ قابل ذکر ہیں، ۱۹۰۷ء میں ندوہ العلماء سے فارغ ہونے والے طلباء کی دستار بندی کا پہلا جلسہ رفاہِ عام کلب لکھنؤ میں منعقد ہوا، اس میں سید صاحب نے ''علوم قدیم وجدید کے موازنہ'' پر اردو میں تقریر کی، پھر حاضرین کے مطالبہ پر عربی میں بھی برجستہ تقریر کی، جس سے لوگوں پر خاص اثر ہوا، خواجہ غلام الثقلین جلسہ میں موجود تھے، انہوں نے امتحاناً سید صاحب کے لئے ایک موضوع: ''ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہو؟'' منتخب کیا، سید صاحب نے بلا کسی توقف کے عربی میں ایسی مؤثر تقریر کی کہ اُحسنت اور آفریں کی صدائیں بلند ہونے لگیں، ۱۹۰۶ء میں فارغ ہوتے ہی علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریض پر ''الندوہ'' کی سب ایڈیٹری ان کے سپرد کی گئی، اور متعدد علمی وتحقیقی موضوعات پر مضامین لکھا، سید صاحب نے ۱۹۰۵ میں ''علم حدیث'' کے موضوع پر ایک

ایسا مؤثر مضمون لکھا جو بہت مقبول ہوا، ۱۹۰۸ء میں حضرت سید صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء میں استاد مقرر ہوئے، اور ضرورت کے پیش نظر "دروس الأدب" کے نام سے عربی کی دو ریڈریں مرتب کیں، جو بیشتر مدارس کے نصاب تعلیم کا جزء ہیں، ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ منعقدہ دہلی میں طے ہوا کہ عربی کے نئے الفاظ کی ڈکشنری تیار کی جائے، چنانچہ سید صاحب نے دو برس کی جہد مسلسل کے بعد "لغات جدیدہ" کے نام سے ایک ڈکشنری تیار کی، اور وہ بھی مقبول خاص وعام ہوئی۔

سید سلیمان ندویؒ کا تعلق اگر چہ ۱۹۱۲ء میں ندوۃ العلماء سے ضابطہ کا نہیں رہا لیکن انہیں کلکتہ، پونا، اعظم گڑھ، بھوپال اور پاکستان کے دوران قیام اس کی سرگرمیوں سے غیر معمولی دلچسپی رہی، اور برابر ندوۃ العلماء کے احوال وکوائف سے واقف ہو کر مفید مشوروں سے نوازتے رہے، مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد جب نواب علی حسن خاں صاحب کو ۲ر فروری ۱۹۲۳ء میں بحیثیت ناظم منتخب کیا گیا تو سید صاحب کو معتمد تعلیم کا عہدہ ملا، اور تاحین وفات ۱۹۵۳ء اسی عہدہ پر قائم رہ کر ندوۃ العلماء کی خدمت انجام دیتے رہے۔

ت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"۱۹۳۱ء میں دار العلوم سے ایک عربی رسالہ کے اجراء کا فیصلہ ہوا، جس کے نگراں وسرپرست سید صاحب اور ہلالی صاحب اور ایڈیٹر ہمارے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی منتخب ہوئے، یہ سید صاحب کے پرانے علمی وادبی ذوق کی تجدید اور ایک عربی رسالہ نکالنے کے دیرینہ خواب کی تعبیر تھی، اس رسالہ کا پہلا شمارہ محرم ۱۳۵۱ھ مئی ۱۹۳۲ء کو نکلا، اس کا افتتاحیہ سید صاحب نے لکھا، اور خوب لکھا، یہ ان کی عربی انشاء پردازی کا بہترین نمونہ ہے، کہیں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی عربی لکھنے کی مشق چھوٹی ہوئی ہے اور قلم کے مسافر کو ایک نئی وادی درپیش ہے، سید صاحب نے اس مضمون میں ہندوستان کی عربی صحافت کا مختصر جائزہ بھی لیا ہے، اور اس کی ضرورت بھی بیان کی ہے، اس مضمون میں کہیں کہیں عبارت کی بے ساختگی،

بے تکلف مسجع اور استعارات وتشبیہات کی ندرت ان کے پرانے عہد کی یاد تازہ کرتی تھی۔" (۱)

سید صاحب کو ندوہ سے نہایت گہرا اور روحانی تعلق تھا، وہ دل و جان سے ندوہ کی خدمت اور اس کی فکر کو عام کرنے اور دنیا کے گوشے گوشے میں پہونچانے کی سعی پیہم میں مشغول تھے، وہ دار العلوم کے طلباء کو جس علمی اور فکری بلندی پر لے جانا چاہتے تھے، اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے، اور وہ نہ صرف اپنے شاگردوں بلکہ اس وقت کے تمام علمی حلقوں سے بھی وابستہ تھے، وہ دار العلوم میں عربی زبان وادب کو اہل زبان کی طرح رواج دینے کے لئے اپنی توانائیاں صرف کرتے تھے، وہ اس بات کے قائل نہ تھے کہ ندوہ صرف زبان ہوشمند ہے، بلکہ وہ ندوہ کو ایک عظیم المرتبت اور نمونہ کی علمی اور فکری تحریک سمجھتے تھے، جہاں سے عربی زبان وادب کے سوتے پھوٹیں اور ندوہ میں عربی زبان وادب کے ماہرین علماء پیدا ہوں، تاکہ وہ براہ راست کتاب وسنت کی زبان اور اس کے معانی کے نکتہ داں ہوں، اور وہ عربی زبان کو ایک زندہ اور متحرک اور تعبیری صلاحیتوں سے بھرپور زبان سمجھ کر علوم اسلامیہ کے ماہرین علماء، ادباء، دعاۃ ومفکرین کی حیثیت سے سارے عالم میں متعارف ہوں۔

اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے ندوہ کو اپنی تمناؤں کی اصل آماجگاہ بنایا اور زیادہ سے زیادہ قیام کیا، وہ علم وعمل کی جامع علماء کی ایک فوج تیار کرنا چاہتے تھے، انہوں نے اپنے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے معتمد تعلیم کا عہدہ قبول فرمایا، اور فکر وعقیدہ کی گہرائی اور علم وعمل کی جامعیت، زبان وادب کے امتزاج سے ندوہ کو ایک صحیح اور بامقصد سمت عطا کی، اور ندوہ کے بارے میں اہل علم کے طبقہ میں حسن ظن پیدا کرنے کے نقطہ پر اپنی توجہات کو مرکوز کیا، اور علماء ودانشوران قوم کے طبقہ میں ندوہ کی ضرورت اور اس کی افادیت کا یقین پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی، اور تاسیس ندوہ کے ابتدائی

---

(۱) پرانے چراغ ج ۱ ص ۲۰

سالوں میں اس کو متہم کرنے اور اس کے فضلاء کو ملحد و بے دین قرار دینے کا جو فیشن چل پڑا تھا، اس میں بہت حد تک کمی آئی۔

سید صاحب اپنے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد بھی ندوہ سے اسی طرح منسلک اور اس کو شجر پھل دار بنانے کی کوششوں میں مصروف رہے، وہاں کے علماء اور عامۃ المسلمین کو ندوہ کی حقیقت سے آگاہ کیا، اور اپنی عظیم شخصیت کے بہترین علمی اور فکری نقوش چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو کر آخرت کی راہ لی، اور تاحیات معتمد تعلیم کے عہدہ پر فائز رہے، اپنی وفات سے کچھ ہی دن پہلے مشرقی پاکستان سے واپس ہوتے ہوئے ندوہ تشریف لائے اور کئی دن تک ندوہ میں قیام فرمایا، افسوس کہ اس زمانہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ پاکستان تشریف لے گئے تھے، سید صاحب کو افسوس رہا کہ ملاقات نہ ہو سکی، اور یہ مصرعہ دہرایا: ع

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا

اس وقت کے ندوہ کے ذمہ دار حضرات نے خاص طور سے حضرت مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری علیہ الرحمہ مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء نے سید صاحب کے استقبال میں ایک جلسہ مسجد دارالعلوم میں منعقد کیا، اس میں سید صاحب نے طلباء اور اساتذہ سبھی حضرات کو حال و مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ہمیں اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی میں تعمق پیدا کریں، اور اس کے ترجمان بننے کی کوشش کریں، تاکہ ہم اللہ کی شریعت کا جیتا جاگتا نمونہ اپنی زندگیوں میں لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ سید صاحب نہ صرف حصول علم پر اکتفا کرنے یا زبان و ادب پر اعتماد کرنے کی غلطی سے ہم کو متنبہ کیا تھا، بلکہ وہ چاہتے تھے کہ ہم اسلامی شریعت کا بھرپور نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں، اور اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں، ان کو اپنے عمل سے دور کر سکیں، اور اسلام نے انسانوں کے لئے جو دائمی

طریقۂ زندگی مقرر کیا ہے، اس کا عملی نمونہ دنیا کو دکھا سکیں، حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سید صاحب کے بارے میں لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''رجحان اور ذوق کی تبدیلی اور عمر کی ترقی کے ساتھ ساتھ سید صاحب کا دارالعلوم کے بارے میں ذوق ورجحان بھی خاصہ بدل گیا تھا، اب وہ اس کو محض ایک علمی ادارہ اور پڑھنے پڑھانے اور علوم جدیدہ سے بقدر ضرورت واقفیت کا مرکز سمجھنے پر قانع نہ تھے، وہ ندوہ کو قلب دردمند، ذہن ارجمند اور زبان ہوشمند تینوں کا مجموعہ دیکھنا چاہتے تھے، اور اسی ترتیب کے ساتھ کہ پہلا مقام قلب دردمند کا ہو، دوسرا ذہن ارجمند کا، اور اس کے بعد ان کی ترجمانی کے لئے زبان ہوشمند ہو، ندوہ میں دینی شخصیتوں اور دینی مرکزوں سے جو بیگانگی عرصہ سے چلی آرہی تھی، اس میں کچھ کمی تو خود سید صاحب کے اس جدید تعلق اور رجحان سے پیدا ہوئی، اور کچھ کمی مولانا الیاس صاحبؒ کے اس ہفت روزہ قیام سے جو ندوہ ہی کے مہمان خانہ میں تھا، اور جس میں انہوں نے اس ماحول کو پورے طور پر اپنے سوز دروں اور اپنی روح اور اپنے جسم کی بے تابی سے، بے چین اور متحرک رکھا، لیکن سید صاحب اس سے زیادہ چاہتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ اب ندوہ کے فرزند اور دارالعلوم کے طلباء ادب اور تاریخ ہی کو اپنی کوششوں اور فتوحات کا نشانہ اور اپنے سفر کی آخری منزل نہ سمجھیں، وہ دوبارہ اقبال کی زبان میں گویا تھے۔

خودی کی یہ ہے منزل اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

وہ چاہتے تھے کہ فرزندان ندوہ کے سامنے وہی شخصیتیں قابل تقلید اور منتہائے کمال نہ ہوں جو علم وادب اور تاریخ کے لئے ایک رمز وعلامت بن گئی ہیں، بلکہ وہ اپنی تحریک کے داعیوں اور اپنی

درسگاہ کے بانیوں میں سے ان لوگوں کو بھی مثالی نمونہ کے طور پر سامنے رکھیں، اوران کی پیروی کی کوشش کریں، جو اپنی دینداری اور صلاح اور اپنی دینی ودنیوی اور علمی وادبی جامعیت میں بھی امتیاز خاص کے مالک تھے۔(۱)

سید صاحب کے بارے میں ان کے صاحبزادہ مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی صدر شعبہ اسلامیات ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ مولانا ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی صاحب کی کتاب ''علامہ سید سلیمان ندوی: شخصیت وادبی خدمات'' کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

''سید صاحبؒ کو جاننے والے اوران سے ملنے والے یہ جانتے ہیں کہ ان کا علمی مقام بہت بلند تھا، اوران کی جامعیت تو اس دور میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔''

سید صاحبؒ کے انتقال کے بعد مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں سید صاحبؒ کی جامعیت کے بارے میں لکھا تھا:

''میری نگاہ میں اس دور کے تمام اہل علم واہل نظر ہیں، صرف ہندوستان کے نہیں، بلکہ دوسرے مسلمان ملکوں کے بھی، مگر یہ واقعہ ہے کہ کوئی شخصیت علم وفن کے گوناگوں شعبوں کی ایسی جامع نظر نہیں آتی (جیسی سید صاحبؒ کی تھی)۔

اس جامعیت وتنوع کے ساتھ سید صاحب کی ایک نمایاں علمی خصوصیت، ان کی تحقیق اور آزادانہ علمی رائے قائم کرنے کی تھی، علمی تحقیق وآزادانہ علمی رائے قائم کرنے کی عادت ان کو طالب علمی کے زمانہ سے ہی تھی، عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ اس شوق تحقیق نے ایک مستقل طرز فکر اختیار کرلیا، معروف اصطلاح میں وہ تقلید کے قائل کبھی

---

(۱) پرانے چراغ ج ۱/۳۱-۳۲

بھی نہ رہے، یہ علمی طرز فکر وحریت ان کی زندگی کے آخری سانس تک ان کے ساتھ رہی، چنانچہ اس طرز فکر نے سید صاحبؒ کو طبعاً ابن تیمیہ وابن قیم اور شاہ ولی اللہ کی طرف کھینچا، سید صاحبؒ کو اس کا اعتراف تھا کہ وہ ان تینوں بزرگوں سے بہت متاثر تھے، فقہی مسالک کے لحاظ سے اگر چہ وہ حنفی تھے، مگر فقہ میں بھی انہوں نے اس طرز فکر کو آخر تک قائم رکھا، خود میں اس سلسلہ میں ذاتی طور پر بہت سے واقعات کا شاہد ہوں، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے بھی بیعت کے وقت اپنی اس طرز فکر اور فقہی توسع کا ذکر کیا تھا اور مولانا تھانویؒ نے بھی جواباً اس فکر کی تصویب فرمائی تھی''۔

جیسا کہ جانے والے جانتے ہیں کہ سید صاحبؒ کا اصل علمی ذوق قرآن وحدیث وعلم کلام کا تھا، خود سید صاحبؒ کے بقول کہ تاریخ تو علمی دسترخوان کی چٹنی ہے جو صرف منہ کا مزہ بدلنے کے لئے ہے، سید صاحبؒ نے اگر چہ قرآن پر یا حدیث پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی، پھر بھی ان کے تفسیری نکات اور حدیث کی تشریحات سیرت النبی ﷺ، سیرت عائشہؓ اور ارض القرآن وغیرہ میں تفصیل سے موجود ہیں، اگر کوئی سید صاحبؒ کی ان تفسیری نکات وحدیث کی تشریحات کو ان کی علمی تصنیفات سے علیحدہ جمع کر کے ان پر کام کرے اور پھر ان کو شائع کرے تو یہ خود ایک مستقل اور قیمتی کام ہے''۔(۱)

سید صاحبؒ نے نہ صرف دارلعلوم ندوۃ العلماء کی بے مثال خدمت کرنے کا تمغہ حاصل کیا، بلکہ انہوں نے دارالمصنفین کو علامہ شبلی کی وفات کے بعد ایک عظیم علمی

(۱) علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت وادبی خدمات: ۱۱

اور تحقیقی ادارہ کی حیثیت سے پروان چڑھایا اور سیرت النبی کی تکمیل کر کے اپنے استاد ومربی علامہ شبلی کی روح کو سرشار کیا، اسی طرح وہ بھوپال میں رئیس القضاۃ (چیف جسٹس) کی حیثیت سے اہم عہدہ پر فائز رہے۔

سید صاحبؒ نہ صرف ایک عالمانہ شان رکھتے تھے، بلکہ اسی کے ساتھ وہ عالمی سیاست پر نہایت گہری نظر اور مبصرانہ رائے کے مالک تھے، ان کی پوری زندگی جامعیت کا ایک ایسا نشان ہے جو ان کے ہم عصر علماء کے طبقہ میں مفقود تھا، اسی جامعیت کا نتیجہ تھا کہ سید صاحبؒ ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں انتہائی فکرمند ہوتے، وہ اس ملک کو انگریزوں کے چنگل میں آزاد کرانے کے لئے اپنی دینی اور ملی ذمہ داری کی بنا پر بے چین تھے، پوری دنیا میں اس وقت ایک سیاسی کشمکش اور ایک طوفان برپا تھا، خلافت عثمانیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا، طرابلس الغرب پر اٹلی کے حملہ نے عالم اسلام کو مضطرب کر دیا تھا، جنگ بلقان کے شعلے ہندوستانی مسلمانوں کے خرمن صبر کو خاکستر کر رہے تھے، اس وقت کے حالات سے سید صاحب کس قدر آگاہ تھے اور عالمی سیاست میں تیز رفتاری کے ساتھ جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ان پر سید صاحب کی نظر کتنی گہری اور مبصرانہ تھی، آپ مجھے اجازت دیں تاکہ میں سید صاحب کی ژرف نگاہی، وسعت نظر اور عالمی سیاست پر ان کی مبصرانہ رائے، نیز عالم اسلام کے حالات پر ان کی بے چینی اور ہندوستانی عوام اور مسلمانوں کی آزادی اور ملک کو غیر ملکی سامراج سے نجات دلانے کے لئے ان کی جدوجہد کی شہادت کے طور پر ان کے مضمون کا ایک اقتباس پیش کروں، وہ لکھتے ہیں۔

> ''حوادث اور اتفاقات ایسے پیش آئے کہ ۱۹۰۸ء میں خلافت عثمانیہ میں انقلاب پیش آیا، نوجوان ترکوں کی انجمن اتحاد وترقی کی خفیہ تدبیریں کامیاب ہوئیں اور انور بے، وغیرہ نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے دستوری حکومت کا اعلان کر دیا اور یہی وہ وقت تھا جب یورپ کی سلطنتوں نے مل کر یہ چاہا کہ ان نوجوان ترکوں کو سنبھلنے

کا موقع دیئے بغیر ترکی حکومت کے حصے بخرے کرلیں، اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ نوجوان ترکوں کے اعلان کے چند ہی روز بعد اٹلی نے دولت عثمانیہ کے آخری افریقی مقبوضہ طرابلس الغرب (ٹریپولی) پر حملہ کردیا، اس حملے نے سارے عالم اسلام میں آگ لگادی، خصوصیت کیساتھ ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے جوش وخروش سے اس میں حصہ لیا اور شبلی و اقبال جیسے شعراء باکمال نے اپنے ترانوں سے مسلمانوں کو گرمایا، اقبال کا یہ شعر اب تک زمانہ کو یاد ہوگا۔

جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

مسلمانوں میں جوش وخروش برپا ہی تھا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں بنگالیوں کے سیاسی زور کو توڑنے کے لئے جو اس وقت سیاست میں سب سے آگے تھے بنگال کو مشرقی ومغربی دو حصوں میں تقسیم کردیا، اس تقسیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کی حقیقت روز روشن کی طرح نمایاں ہوگئی اور مشرقی بنگال جو سب سے پیچھے تھا اس کو اپنی ترقی کا زریں موقع مل گیا اور مسلمانوں نے اپنے آپ کو اس نئے صوبہ میں اکثریت میں پاکر بڑی خوشی ظاہر کی، اور یہ پہلا دن تھا کہ مسلمانوں کو ملکی سیاست سے دلچسپی معلوم ہونے لگی، لیکن ابھی ان کی اس خوشی پر دو سال بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ ہندو بنگالیوں کے پرزور ایجی ٹیشن سے مجبور ہوکر انگریزوں نے ۱۹۱۰ء میں بنگال کی تقسیم کو منسوخ کردیا، مسلمانوں کو اس کا بڑا صدمہ ہوا اور یہی زمانہ تھا جب نواب وقار الملک نے انگریزوں کی حکومت کے خلاف اپنے جذبات کا

اظہار کیا، اور مولانا شبلی مرحوم نے پولٹیکل کروٹ کا سلسلہ شروع کیا جس نے مسلمانوں کے سیاسی رخ کو سرکار پرستی کی طرف سے پھیر کر صحیح سیاست کی طرف کر دیا۔

ابھی یہ صدمہ وہ بھولنے بھی نہ پائے تھے کہ اسی ۱۹۱۰ء میں بلقان کی ریاستوں نے یورپ کی سلطنتوں کی شہ پا کر ایک ساتھ مل کر دولت عثمانیہ کے یورپی حصوں میں بغاوت کر دی اور جنگ بلقان کا آغاز ہوا، یہ جنگ کے شعلے اگرچہ یورپ میں اٹھ رہے تھے، مگر ہندوستان کے مسلمانوں کا جوش وخروش دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ جنگ ہندوستان ہی میں لڑی جا رہی تھی، چند سال کے بعد یہ جنگ اس طرح ختم ہوئی کہ ترکوں کے ہاتھ سے یورپ کا بڑا حصہ نکل گیا''(۱)

اس اقتباس سے تحریک خلافت کے سلسلہ میں سید صاحب کی مخلصانہ اور تھکا دینے والی کوششوں کی پوری طرح عکاسی ہوتی ہے، سید صاحب نے تحریک خلافت کو دعوتی اور فکری روح عطا کی اور اس کو محض ایک سیاسی تحریک کے طور پر کسی حال میں بھی استعمال کرنے پر راضی نہیں ہوئے، انہوں نے اس تحریک میں بھرپور حصہ لے کر اور اس کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی جملہ توانائیوں کو صرف کر کے لذت فکر وعمل محسوس کی۔ اور اس کو ایک دینی اور دعوتی فریضہ سمجھ کر ملک کے اندر اور باہر جہاں بھی ضرورت سمجھی، اپنی کوششوں میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں ہونے دی۔

یہ تحریک ایک عظیم الشان مشن تھا، جس کا سہرا اس ملک کے علماء کے سر بندھتا ہے اور خاص طور سے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روشن ضمیری اور ژرف نگاہی نے اس کو زندگی اور توانائی عطا کی، اور بالآخر اس کے مفید نتائج اس ملک کی آزادی کی شکل میں برآمد ہوئے۔

---

(۱) برید فرنگ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

اپنی شخصیت کے آئینے میں

(ولادت: ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۳ء۔ وفات ۱۴۲۰ھ ۱۹۹۹ء)

مثالی انسان کی تعمیر میں اسلام کا کردار

یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ انسانی تاریخ کے کسی دور میں بھی مذہب اسلام کی طرح کوئی ایسا جامع نظریۂ حیات اور معتدل نظامِ زندگی وجود پذیر نہیں ہوا جس نے اپنی تمام تر توجہات کامل انسان کی سیرت سازی اور اسے اخلاق کریمانہ کا مجسم پیکر بنانے پر مرکوز کیا ہو، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلی جو وحی نازل ہوئی، اس میں خداوند تعالیٰ کے بابرکت نام سے حصول علم کی تلقین وترغیب ہے، اسی لئے اسلام نے ہر چیز سے پہلے انسان کی توجہ اس علم کی طرف مبذول کرائی، تاکہ وہ اپنے مرتبہ ومقام سے باخبر ہو کر آسمانی ہدایات کی روشنی میں اپنا سفر طے کرے، اور اپنی زندگی کا حقیقی ہدف متعین کر سکے، اللہ تعالیٰ نے خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں آخری نظام حیات دے کر مبعوث فرمایا، یہ نظام اپنی آفاقیت وجامعیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے، فطرت انسانی کے تمام تقاضوں کی تکمیل، اور انسانی زندگی کے جملہ مسائل کا بہترین حل اس میں موجود ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فطرة الله التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله، ذلك الدين القيم، ولكن أكثر الناس لا يعلمون. (سورۂ روم: ۳۰)

''اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو جس پر اس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے بدلنا نہ چاہئے، پس سیدھا دین یہی ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔'' (۱)

تاریخ انسانی کا عظیم انقلاب

اسلام کی آمد سے تاریخ انسانیت میں ایسا عظیم الشان انقلاب رونما ہوا جس نے لوگوں کو خواہشات نفسانی کے کج راستوں سے ہٹا کر صراط مستقیم پر ڈال دیا، اور اس کے نتیجہ میں ایک ایسا صالح معاشرہ وجود میں آیا جس میں ایمان ویقین، سچائی وراست بازی، تقویٰ وطہارت اور کردار وعمل کے دلچسپ ودلکش مظاہر کی کارفرمائی رہی، وہ معاشرہ ایسے پاک طینت افراد پر مشتمل تھا جو بجا طور پر انسانیت کے لئے بہترین نمونہ تھے، ان کی اس افضلیت وبرتری کی وجہ یہ تھی کہ ان کی ساخت وپرداخت شریعت اسلامیہ کی ہدایت کی روشنی میں کی گئی تھی اور یہ حقیقت ہے کہ اسلامی تربیت کی کرشمہ سازی اپنا جمال وجلال دکھائے بغیر نہیں رہتی، بلکہ اس کے زیر سایہ ایسے انسانوں کو سیرت کی تعمیر ہوتی ہے جو مستقبل میں امامت وقیادت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں، وہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی اعتدال ومیانہ روی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، وہ غلو وتقدیس سے پاک اور حق تلفی وناانصافی سے کوسوں دور ہوتے ہیں، اخلاص وتعلق مع اللہ ان کی زندگی کا نمایاں جوہر اور حقیقی مقصد ہوتا ہے۔

۱۴۱۹ھ کی سب سے بڑی اسلامی شخصیت

عالم اسلام کے لئے یہ ایک بہت ہی خوش آئند موقع تھا، جب حکومت دبئی نے عالمی جائزۃ القرآن کے جشن کے موقع پر حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کو ۱۴۱۹ھ کی عظیم اسلامی شخصیت قرار دیا اور آپ کو ایک وقیع ایوارڈ سے نوازا اور مشرق ومغرب کے تمام اسلامی حلقوں نے اس اقدام کا زبردست خیر مقدم کیا۔

(۱) ترجمہ حضرت تھانویؒ

اسلامی امتیازات وکمالات کا تاج زریں

یہاں یہ حقیقت بھی نظروں کے سامنے ہونی چاہئے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ کو اللہ تعالیٰ نے ایمان ویقین اور علم وحکمت کے جن گنجہائے گر انمایہ سے نوازا تھا اور امتیازات وکمالات کا جو تاج زریں آپ کے سر پر رکھا تھا اس کی موجودگی میں پورے عالم اسلام میں آپ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا شخص اس اعزاز کا اہل بھی نہ تھا، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ آپ کی ایمان افروز مثالی شخصیت اس ایوارڈ سے بالاتر تھی، چنانچہ آپ نے اس موقع پر جب آپ کو اس اعزاز سے نوازا گیا بھرے مجمع میں اس عظیم قیمتی ایوارڈ کو دینی تعلیم کے حق میں تقسیم کرنے کا اعلان کر دیا، یہ دراصل آپ کی مثالی شخصیت کا سب سے بڑا ثبوت تھا جو آج کی انسانی دنیا میں مفقود ہے۔

دنیا کے بارے میں آپ کا موقف

حضرت مولانا کا یہ خیال تھا کہ یہ دنیا دارالاسباب ہے، اس میں اصل تک رسائی حاصل کرنے کے لئے وسائل وذرائع اختیار کئے جاتے ہیں، اور ایک فرد مسلم آخرت کی فوز وفلاح کے لئے دنیاوی وسائل سے استفادہ کرتا ہے، چنانچہ آپ مرد مومن کے اصل مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''مومن کا دنیاوی موقف وہ ہے جس کی توضیح زبان نبوت نے بڑے اچھے ڈھنگ سے فرمائی ہے، اور ایسی لطافت ونزاکت اور دقیق تعیین کے ساتھ اس کو بیان فرمایا ہے کہ اس کے سامنے زبان وبیان اور لطافت وباریکی کے تمام طرز ادا ہیچ نظر آتے ہیں، فرمایا: "اِن الدنیا خُلقت لکم وانکم خُلقتم للآخرۃ۔" (دنیا کی تمام چیزیں تمہارے لئے مسخر کی گئی ہیں اور تم لوگ آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو) لہٰذا ایک مسلمان دنیا وآخرت کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ دنیا اور اس کے سارے وسائل وذرائع کی حیثیت محض ایک وسیلہ کی ہے، مقصد وغایت اور حقیقی مطمح نظر تو بس آخرت کی زندگی ہے،

لہذا اسے مقصد کے حصول کے لئے اس مادی دنیا کے تمام وسائل سے حتی الامکان استفادہ کرنا چاہیے، ایک دوسری حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی حقیقت کو یوں آشکارا کیا ہے۔" مالی وللدنیا و ماأنا والدنیا اِنما أنا کراکب استظل تحت شجرة ثم راح وترکھا۔ (مجھ کو دنیا سے کیا لینا دینا، میرا تعلق تو اس سے بس اتنا ہے جتنا ایک مسافر سوار کا کسی سایہ دار درخت سے ہوتا ہے کہ وہ اس کے نیچے سایہ حاصل کرتا ہے، پھر اٹھ کر چل دیتا ہے)۔

کتاب وسنت کا نظریۂ حیات

مذکورہ بالا قرآنی نظریہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور آپ کی تعلیمات وارشادات، احساسات ورجحانات، اوراُوراد واذکار، ادعیہ ومناجات اور خلوت وجلوت کی زندگی میں مکمل طور پر ظاہر ہوا، اسی طرح آپ ﷺ کی آغوش تربیت میں پرورش پانے والے صحابہ کرامؓ اور اس امت کے مومنین صالحین کی زندگیوں میں بھی یہ وصف پورے آب وتاب کے ساتھ پایا گیا، حتی کہ وہ ان کی زندگی کا جزء لاینفک بن گیا اور اس نے ثابت شدہ تاریخی حقائق کا درجہ اختیار کرلیا جس میں بحث ومباحثہ اور کسی کلام کو کوئی گنجائش نہیں۔

اسلامی شخصیت اور اسلامی تہذیب

بلاشبہ اسلامی شخصیت کی تعمیر وترقی سے اسلامی تہذیب کا عظیم محل تعمیر ہوتا ہے اور اسی کے ذریعہ خاکی صفت ظلوم وجہول انسان ملکوت اعلیٰ کی صف میں جا کھڑا ہوتا ہے، اور بسا اوقات ملأ اعلیٰ سے بھی بازی لے جاتا ہے، کیونکہ اس کی زندگی ایسے عظیم اخلاق وکردار سے عبارت ہوتی ہے جو اسے مطلوب مسلمان اور مثالی مومن کا درجہ عطا کرتے ہیں، حضرت مولانا نوراللہ مرقدہ اس عظیم پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

"یقیناً اسلامی شخصیت کی حفاظت ، اور دنیا میں امت اسلامیہ کے مرکز وقبلہ کی صیانت اور اسلام کے پیغام ومشن سے واقفیت اور اس

کی اہمیت وافادیت پر یقین اور حیات بعد الممات پر مکمل اعتماد، اور زندگی کے اخلاقی وروحانی پہلوؤں پر تاکید ہی دراصل دو تہذیبوں کے درمیان خط فاصل کا نشان لگاتی ہے، ایک تہذیب تو وہ ہے جس سے اسلام مکمل اتفاق کرتا ہے، اور اس کو پروان چڑھانے کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر ڈالتا ہے اور اس میں اسلامی شخصیت اور اختراعات وایجادات کا ظہور ہوتا ہے، دوسری تہذیب وہ ہے جس سے اسلام اپنی مکمل براءت کا اعلان کرتا ہے، کیونکہ وہ مسلمانوں کے حق میں خسارہ ونقصان کا باعث ہے اور اس میں غلامی وبندگی کی کارفرمائی ہے اور اس کی اتباع وتقلید، بندروں اور طوطوں کی تقلید سے کم نہیں''۔

حضرت مولانا کا منفرد نقطہ نظر

اس کرۂ ارضی اور اس پر بسنے والے انسانوں کے متعلق حضرت مولاناؒ کا نظریہ نہایت منفرد تھا، آپ کی شہرۂ آفاق تصنیف (ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین) ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' نے فکر ونظر کی دنیا میں عظیم انقلاب برپا کیا اور اسلامی ادباء ومفکرین کو سوچنے کا ایک نیا طرز عطا کیا، جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس کتاب کے منصۂ شہود پر آنے سے قبل ادباء ومفکرین کا زاویۂ فکر یہ نہیں تھا کہ مسلمانوں کے انحطاط سے مشرق ومغرب، شمال وجنوب ہر خطہ میں عالم انسانیت کو عظیم خسارہ اور ناقابل تلافی نقصانات سے دوچار ہونا پڑا، لیکن حضرت مولاناؒ نے بڑی بیدار مغزی، کامل اعتماد ویقین اور مسکت دلائل وبراہین سے اپنے موقف کی وضاحت کی، چنانچہ اس کتاب کے مقدمے میں معروف مصری فاضل عظیم مفکر وادیب ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ رقمطراز ہیں:

> ''اس کتاب میں جو خیر وطاقت ہے اور ہمارے مسائل ومشکلات کا جو بہترین حل ہے بخدا میری دانست میں قدیم وجدید کسی کتاب میں نہیں ہے اسکا مصنف اسلامی روح سے سرشار اور اپنے مقصد میں انتہائی مخلص ہے اس نے اپنی تمام طاقتوں کو دعوت الی اللہ کے لئے وقف

کر دیا ہے۔''

اس موقع سے معروف صاحب علم وقلم عظیم اسلامی اسکالر، مشہور مفکر وداعی سید قطب کی تحریر بھی ملاحظہ کرنے کے قابل ہے جوانہوں نے اس کتاب کے مقدمہ میں سپرد قرطاس کی ہے، لکھتے ہیں:

''اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اسلام کے اصول وکلیات کو ان کے وسیع دائرہ کے اندر اور اسلام کی صحیح روح کے مطابق سمجھا ہے، اس بنا پر نہ صرف یہ کہ یہ کتاب دینی واجتماعی تحقیق علمی کا نمونہ ہے، بلکہ اس کا بھی نمونہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے تاریخ کو کس انداز سے مرتب کرنا چاہئے۔''

امت اسلامیہ کے فرزند ارجمند

حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ اپنی ذات سے ایک انجمن، امت اسلامیہ کے عظیم وہونہار فرزند ارجمند، اور عالم انسانیت کے لئے بہترین نمونہ اور ایک مثالی انسان تھے، آپ کی اسلامی شخصیت کے تعارف کیلئے کسی دلیل وبرہان کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے لئے یہی کافی ہے کہ آپ کی جملہ تصنیفات سے جن کی تعداد تقریباً ۲۰۰ر سے زائد ہے پورا عالم باخبر ہے، حتی کہ مسلم نوجوانوں کے اندر ان کتابوں کو جمع کرنے اور ان سے خالص اسلامی فکر کی غذا حاصل کرنے میں مقابلہ اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا جذبہ پایا جارہا ہے، کیونکہ ان میں اسلامی فکر کا ایسا خلاصہ اور نچوڑ پیش کیا گیا ہے جس کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ اور ہر محاذ سے ہے، ان میں ایسی طاقت وصلاحیت ہے جو اسلام اور اس کے نظام پر لوگوں کا اعتماد بحال کرسکتی ہے، اور مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی عظمت رفتہ اور اس کے سطوت وغلبہ کی بازیابی کے لئے ایمان ویقین کی چنگاری روشن کرسکتی ہے اور انہیں عالمی قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھالنے اور عالم انسانی کو جدید جاہلیتوں خودساختہ نظریات حیات اور مادی تہذیبوں کے جہنم سے نکالنے پر آمادہ کرسکتی ہے، مولانا

مرحوم کی اسلامی شخصیت کو آپ کی روشن فکر، کائنات کے متعلق آپ کے بے مثال نظریۂ حیات اور مادی تہذیبوں کے متعلق آپ کی وسیع معلومات کے آئینہ میں دیکھا جاسکتا ہے، اس بنا پر مولاناؒ بجا طور پر اس بات کے سب سے زیادہ حق دار تھے کہ آپ کی محبت میں اکرام وتعظیم اور ادب واحترام کے گلہائے عقیدت پیش کئے جاتے رہیں۔

آپ کا وجود ابر رحمت تھا

مفکر اسلام حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ عالم اسلام کے لئے کسی ابر رحمت سے کم نہ تھے، آپ کا وجود مسلمانوں کے لئے بڑے خیر وبرکت کا باعث تھا، آپ ان کے لئے سرچشمہ ہدایت اور ایک مشفق ومربی کا درجہ رکھتے تھے، امت مسلمہ کے مسائل ومشکلات سے بخوبی واقف تھے، اس لئے ان مسائل میں دلچسپی لے کر ان کا بہترین حل پیش کرتے تھے، اطراف عالم کے مسلمان آپ سے دعوت وتبلیغ کے میدان میں حکمت وموعظت کا سبق سیکھتے تھے، حالات چاہے جیسے بھی ہوں ہمیشہ اسلامی موقف پر جمے رہنے کی تلقین فرماتے تھے۔

اصل مقصد دعوت الی اللہ اور اس کے لئے عالم کی سیاحت

الغرض آپ ہر ممکن طریقے سے اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے میں سرگرم عمل تھے، آپ کے لئے اگر ایک طرف تالیف وتصنیف کی بے پناہ مشغولیت تھی تو دوسری طرف اسفار وملاقات کا لامتناہی سلسلہ تھا، اعلاء کلمۃ اللہ آپ کی زندگی کا حقیقی ہدف اور اصل نصب العین تھا، چنانچہ آپ نے امت مسلمہ کی عظمت رفتہ کی بحالی، اسلامی تہذیب وتمدن کا پرچم پورے عالم میں لہرانے، دشمنان اسلام کے اعتراضات کا کافی وشافی جواب دینے، ان کے ناپاک عزائم اور ان کی سازشوں کا پردہ چاک کرنے کے لئے مصر وفلسطین کی خاک چھانی، امریکہ ویورپ کے شہروں اور وہاں کے تعلیم وتہذیب کے مراکز کی سیر کی، اسپین کے شکستہ در ودیوار کی عبرت ناک داستانیں سنا کر مسلمانوں کی حمیت دینی اور ان کی غیرت کو للکارا، خلافت عثمانیہ کے زوال کے اسباب بیان کر کے ان کے ذہن ودماغ کو

جھنجھوڑا، کتب تاریخ کے اوراقِ پارینہ کو کھنگھالا اور اسلامی تہذیب کے ایک ایک پہلو کو روشن و بے غبار ثابت کر کے دم لیا۔

اس کا ثمرہ پورے عالم اسلام میں اسلامی بیداری کی شکل میں نمودار ہوا، مگر افسوس کہ آپ ایسے نازک وقت میں راہیٔ دار بقا ہوئے جب کہ امت کو آپ جیسے قائد ومجاہد کی اشد ضرورت تھی، آج عالم اسلام کو عموماً اور امت اسلامیہ ہندیہ کو خصوصاً مسائل ومشکلات کے ایک سیلِ رواں کا سامنا ہے، عربی مثل میں ذرا تغیر کے ساتھ کہنا کتنا بجا معلوم ہوتا ہے "قضایا و لا أبا حسن لها"۔

آپ کا وصف امتیازی

مولانا مرحوم کا ایک امتیازی وصف یہ تھا کہ دنیا کے احوال وکوائف پر آپ گہری نظر رکھتے تھے، اسلام دشمن تنظیموں اور یہودی لابی کی زبردست سازشوں اور ان کی عظیم تیاریوں سے مکمل آگاہی رکھتے تھے، چنانچہ آپ امت مسلمہ کے ہر طبقہ کو اس خطرہ سے آگاہ کرتے تھے اور اس کے مقابلے کے لئے انہیں بھرپور تیاریوں کی دعوت دیتے تھے، آپ نے امت مسلمہ کے ہر ہر طبقہ میں جہد مسلسل، سعی پیہم، عزم محکم، غیرت وحمیت اور اخلاص وللّٰہیت کی روح پھونک دی، اور اس طرح مسلسل لگن وتڑپ کے ساتھ اپنے فریضہ کی انجام دہی میں مشغول رہے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا شمار امت کے عظیم داعیوں، اور اسلام کے ہونہار فرزندوں اور لائق سپوتوں میں ہوتا ہے، آپ اپنے آفاقی فکر، عالمگیر نظریہ اور اعتدال پسندانہ موقف کی وجہ سے علم وعمل، فکر ونظر، اور عقیدہ وایمان کے جلیل منصب پر فائز تھے، اخلاص وللّٰہیت، زہد واستغناء اور تعلق مع اللہ جیسے اعلیٰ اوصاف نے آپ کی زندگی میں مزید حسن ونکھار پیدا کر دیا تھا، اس لئے چشم فلک نے دیکھا کہ خدائے رحمان ورحیم نے آپ کو خلائق کے درمیان عام مقبولیت سے نوازا، اور ایک مثالی مؤمن اور آئیڈیل مسلم کا تاج آپ کے سر پر رکھا' ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء"۔ اقبال مرحوم نے سچ کہا تھا:

پر ے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِراہ ہوں وہ کارواں تو ہے

آپ کے کارناموں کا اعتراف

حضرت مولانا مرحوم کی جلیل القدر خدمات اور عظیم الشان کارناموں کو بہت سے اصحاب علم وارباب علم وقلم نے سراہا، اور انہیں اپنا موضوع سخن بنایا، لیکن سچ یہ ہے کہ مستقبل میں بھی پورا عالم آپ کی ان خدمات کا اعتراف کرتا رہے گا، سعودی عرب کے سابق وزیر اطلاعات جناب ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی نے اپنے تعزیتی مضمون میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

شیخ ندویؒ کی پوری زندگی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ۸۷ سال کا طویل عرصہ آپ نے جہد مسلسل، سعی پیہم اور عالم اسلام ودیگر ممالک کے اسفار وسیاحت میں گذار دیا، حکمت وموعظت اور بصیرت کے ساتھ لوگوں تک اللہ عزوجل کا پیغام پہنچاتے رہے، خیر خواہی ونصیحت کے جذبہ سے سرشار ہوکر لوگوں کو اپنے مفید مشوروں سے نوزاتے رہے اور علماء اسلام سے ہمیشہ تبادلہ خیالات کرتے رہے، مشرق ومغرب، شمال وجنوب کے تمام مسلمانوں کے مسائل میں دلچسپی لے کر ان کا تعاون کرنا اسلامی وعربی ممالک کی زیارت کر کے مسلمانوں کے احوال وکوائف کا سنجیدگی سے جائزہ لیتے رہنا اور انہیں اتحاد واتفاق کی دعوت دینا، الفت ومحبت کا سبق پڑھانا آپ کی امتیازی خصوصیات سے گہرا تعلق رکھتا ہے، نیز ارباب حل وعقد سے ملاقاتیں کر کے انہیں قرآنی ہدایات کی طرف برابر متوجہ کرتے رہنا ایک عظیم وصف تھا جس کی نظیر عصر حاضر کے داعیوں اور علماء میں نہیں ملتی، یہ بلند درجات اور یہ اوصاف آپ کے اخلاص وللّٰہیت کی بنا پر حاصل ہوئے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

پیام انسانیت دعوت اسلامی کا ایک اہم پہلو

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایمانی بصیرت اور روشن ضمیری سے اہل وطن کو اسلام سے قریب لانے اور ان تک اسلام کا پیغام پہونچانے کے لئے ''پیام انسانیت'' کے نام سے ایک دعوتی تحریک کی بنیاد ۱۹۵۵ء میں ڈالی تھی، اور اس کے حلقے کو حکمت وتدبر کے ساتھ برابر وسیع فرماتے رہے، ملک کے مختلف بڑے شہروں اور مرکزی مقامات پر اس کے جلسے کئے جاتے تھے اور اس میں غیر مسلم دانشوروں، اور تعلیم یافتہ طبقے کو خاص طور سے دعوت دی جاتی تھی اور عام جلسے کے علاوہ ان حضرات کی ایک خصوصی نشست بھی رکھی جاتی تھی جو حضرت مولانا خود خطاب فرماتے تھے اور دعوت کی حکمت کو پیش نظر رکھ کر ان کو بغیر کسی صراحت کے اسلام کی اعلیٰ اخلاقیات کی طرف متوجہ فرماتے تھے، جس کا بے حد گہرا اثر پورے مجمع پر پڑتا تھا اور لوگ حضرت والا کی وطن دوستی، اور خدمت خلق اور انسانیت کے احترام کا جذبہ جوان کے اندر موجزن تھا، اس کا لوہا ماننے پر مجبور ہوتے تھے۔

ان کا خیال یہ تھا کہ ہمارے ملک بلکہ تمام ممالک کے جملہ مسائل ومشکلات کا حل اسی بات میں مضمر ہے کہ ہم انسانیت کے اعلیٰ مقام کے سمجھنے کی کوشش کریں، اور انسان کی خدمت کے لئے اپنے دل میں زیادہ سے زیادہ گنجائش پیدا کریں اور عصبیت خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو اس سے پرہیز کریں، مقصد یہ ہے کہ معاشرہ کے اندر اخلاقی حس بیدار ہو اور اخلاقیات کی حکمرانی زندگی کے ہر شعبہ پر قائم ہو، یہی دراصل حل ہے ان تمام مسائل ومشکلات کا جس سے آج کی انسانی سوسائٹی دوچار ہے، اسی سے دلوں کے اندر جرائم سے نفرت پیدا ہوسکتی ہے اور کرپشن (Corruption) جو تمام شعبہ ہائے زندگی کے اندر پیدا ہوگیا ہے اس کی بیخ کنی ہوسکتی ہے۔

الحمد للہ حضرت مولاناؒ کی یہ تحریک قائم ہے اور مخلصین کے ہاتھوں اس کا کام جاری ہے اور مستقبل میں انشاء اللہ تعالیٰ یہ تحریک دعوت واصلاح کے میدان میں ایک عظیم کردار ادا کرے گی اور اس کی افادیت کا اندازہ صحیح طور پر کیا جاسکے گا۔

اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے بے چینی

رہا یہ کہ مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ کتنے علمی، ادبی اور دعوتی اداروں کے بانی اور روح رواں تھے تو اس کے بیان کے لئے ایک دفتر نہیں، بلکہ بہت سی ضخیم جلدیں درکار ہوں گی، اور حضرت مولانا کے اعلیٰ فکری اور دعوتی مقام کو واضح کرنے کی گنجائش پیدا ہو سکے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ ہمہ گیریت اور جامعیت، یہ بصیرت وفراست، اور حکمت وقابلیت، یہ روشن ضمیری اور رسوخ ایمانی اور علمی، یہ توفیق عمل ودل سوزی، اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے بے چینی اور تڑپ، اور عام مقبولیت اور پذیرائی محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جو کسی انسان کے بس کا کام نہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ہندوستان میں عربی زبان وادب اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

ہندوستان کی اسلامی تاریخ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی مختلف الجہات وہمہ گیر شخصیت سے درخشاں، وتاباں ہے، عمیق علم، وسیع فکر، حزم اور دور اندیشی، اصابت رائے، زندگی وانسان اور کائنات کے بارے میں جامع ترین نظریہ، اسلام کا صحیح ومعتدل فہم، مقبولیت عامہ اور اثر ورسوخ، دین کی راہ میں ایثار وقربانی اور فدائیت کا عجیب وغریب شوق، عقیدۂ حقہ کی ترسیخ، فکر سلیم کی ترویج، اسلام کے ابدی پیغام کی طرف انسانوں کی رہبری، اور پورے اخلاص ویقین کے ساتھ عملی زندگی میں اس کے نفاذ کی جدوجہد، یہ وہ اعلیٰ صفات ہیں جنہوں نے عالم اسلام کی جلیل القدر شخصیات کے درمیان آپ کو مرکزیت کا درجہ عطا کیا، اور میر کارواں کا تاج آپ کے سر پر رکھا، آپ بیک وقت مفکر ومدبر، داعی الی اللہ، مربی وسرپرست، دین ودنیا کی جامعیت کا مکمل نمونہ، قرطاس وقلم وزبان وادب کے ایک عظیم شہسوار تھے۔

اسی کے ساتھ آپ عالمی سطح پر اسلامی ادب کے علمبردار بھی تھے، محض آپ کی کاوشوں کی بدولت ''عالمی رابطۂ ادب اسلامی'' کا قیام عمل میں آیا، جس نے آفاقیت کو اپنا نصب العین بنا کر اسلامی ادب سے عالم کو روشناس کرایا، اور تمام ادبی حلقوں میں اس کا تعارف کرایا، پھر اسلام پسند ادباء کی ایک جماعت نے آگے بڑھ کر رابطہ کی اس آفاقی فکر کو قبول کیا، جس کے نتیجہ میں انہیں زبان و بیان، ادب وانشاء اور بامقصد تالیف وتصنیف کا ایک وسیع میدان ہاتھ آیا، اور وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اس ادبی فریضہ کی انجام دہی اور عقیدہ و ایمان کی ضیاء بار کرنوں سے زندگی کو منور کرنے میں لگ گئے۔

حضرت مولاناؒ کے نزدیک ادب، طاقت وقوت کا ایک عظیم سرچشمہ ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جو لوگوں کے دلوں اور ان کے عقلوں پر حکمرانی کرتی ہے، اسی وجہ سے آپ نے ادب کو اپنی تمام عملی سرگرمیوں کا ایک اہم ذریعہ بنایا، دعوت اسلامی کی خدمت، بامقصد انسانی زندگی، ایمانی شخصیت اور پاکیزہ سیرت وکردار کی تعمیر میں آپ نے اپنی ادبی طاقت کو استعمال کر کے انسانی سعادت کا وہ پل تعمیر کیا جس سے آج کا انسان محروم ہے، یعنی عبد ومعبود کے درمیان ایسا مضبوط تعلق پیدا کیا جس میں طاعت وبندگی اور الوہیت وربوبیت کی کامل تصویر نظر آتی ہے، اور اس عظیم مقصد کی تکمیل کی راہ میں آپ نے جو ہر ادب کو نکھارنے اور اس سے زندگی کو سنوارنے کا بے مثال فریضہ انجام دیا۔

آپ کا اسلوب بیان نہایت پاکیزہ ہے اس کے اندر اعلی ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ طاقت وقوت اور فصاحت وبلاغت کا حسن پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ جیسا کہ مشہور شامی نژاد ادیب اور معروف انشاء پرداز شیخ علی طنطاوی نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے: ''برادرم ابوالحسن! میرا اعتماد ادب کے اوپر متزلزل ہو گیا تھا کیونکہ ادباء کی تحریروں میں مجھے وہ آسمانی نغمہ نظر نہیں آیا جو اس کی روح ہے، لیکن میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے ادب پر میرا یہ اعتماد بحال کر دیا''۔ اسی طرح رابطہ ادب اسلامی کے اہم رکن ومعروف ادیب ڈاکٹر عبدالباسط بدر صاحب یوں رقم طراز ہیں:

''۱۴۰۱ھ میں رابطہ ادب اسلامی عالمی کے پہلے جلسہ میں جو شہر لکھنؤ میں منعقد کیا گیا مجھے حاضری کا شرف حاصل ہوا، اس موقع پر حضرت مولاناؒ کی خصوصی مجلسوں میں بھی شرکت کی سعادت نصیب ہوئی، اس وقت میں نے آپ کی ادبی شخصیت میں بہت سی نمایاں جھلکیاں دیکھیں، عربی ادب کے متعلق آپ کی فکر اور خیالات کو سننے کا موقع ملا، آپ کی بلند نگاہی اور مسائل ومشکلات سے واقفیت نے ہمیں حیران وششدر کردیا، اس وقت آپ کی گفتگو کا موضوع مغربیت زدہ عربی ادب تھا، جس نے ایک طویل مدت سے مشرق کے دیار میں اپنا پنجہ جمالیا ہے، اس دن مجھے اور سامعین کو معلوم ہوا کہ یہ وہ ادیب ہے جو اپنی تالیف وتصنیف اور بات چیت میں اسلامی ادب کا خاص رنگ بھر دیتا ہے، اور یہاں بیٹھ کر عربی زبان کے دور دراز نخلستانوں میں عربی سرمایہ کی حفاظت کر رہا ہے، اور ندوۃ العلماء جیسے عظیم ادارہ میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی بنیاد ڈال کر اس عظیم ادبی سرمایہ کی نشر واشاعت میں مصروف ہے۔

ڈاکٹر صاحب آگے چل کر مزید تحریر فرماتے ہیں:

''ان عظیم ذمہ داریوں کو وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو کلمۂ طیبہ کی قدر ومنزلت سے واقف ہو اور انسانی زندگیوں میں زبان وبیان کے رتبہ سے آگاہ ہو، اور عربی زبان وادب کی محبت اس کے رگ وریشے میں سرایت کر گئی ہو، بلاشبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے اندر ایک عالمی اسلامی ادیب کی تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں، عربی، اردو اور فارسی، تینوں زبانوں کے آپ ماہر ہیں، حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے اندر ان تمام خوبیوں کو اس لئے جمع کیا تا کہ آپ آگے چل کر اس قافلے کے میر کارواں بنیں جس کے لئے دنیا ہمہ تن انتظار تھی اور جس پر ادب اسلامی کو ناز

کرنے کا حق حاصل ہے، اور آپ ہی ادب کے محافظ و پاسباں بن کر اس وقت میدان عمل میں اترے، جب محدود قومیتوں کا نعرہ بلند کیا جارہا تھا، اور دین کو فکر وادب، سیاسیات واقتصادیات اور زندگی کے عملی شعبوں سے جدا کرنے کی ناپاک کوششیں ہورہی تھیں، چنانچہ آپ نے اپنی ایمانی فراست سے بلاتفریق رنگ ونسل اور زبان وادب، اسلامی ادباء کا پہلا کنونشن منعقد کیا جس میں ہندی، عربی، ترکی، اور انڈونیشیائی سارے ادباء ایک متحد ادبی پلیٹ فارم پر علمی اور ادبی مقصد کی تکمیل کے لئے جمع ہوئے، اسلامی اقوام کی تاریخ میں میرے نزدیک اپنی نوعیت کا یہ ایک منفرد کنونشن تھا، ادبی جمعیتوں کا قیام گرچہ پوری دنیا کے لئے ایک نئی شے تھی، لیکن رابطہ ادب اسلامی کے قیام سے پہلے اسلامی ادباء کے کسی کنونشن کا پتہ نہیں چلتا''۔

ملیشیا کی ''الجامعۃ الاسلامیۃ'' کے شعبۂ عربی کے استاذ ڈاکٹر منجد مصطفیٰ بہجہ، عربی زبان وادب کے سلسلہ میں حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے نظریات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ شیخ ندویؒ نے زبان وادب کے سلسلہ میں دو کامل نظریات پیش کئے، پھر تیسرا نظریہ پیش کیا جس کا تعلق زبان کی تدریس وتعلیم سے ہے، آپ نے ایسے اصول وآداب کا استنباط کیا جو ادب اور زندگی پر اس کے اثرات کو پوری طرح بے نقاب کرتے ہیں، اکثر محققین نے کہنا شروع کردیا تھا کہ تمام نظریات کے موجدین مغرب کے فلاسفہ اور اس کے ناقدین ہیں، لیکن حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے میدان عمل میں اتر کر اس تصور کو مسترد کردیا، اور عربی زبان وادب کے حسن وجمال کو آشکارا کرنے اور اس کی جڑوں کو مضبوط کرنے پر زور دیا، آپ کے اس عظیم کارنامہ پر ہمیں فخر ہے''۔

ہندوستان میں اسلامی عربی ادب کے ارتقاء کی تاریخ میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا حصہ'' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اگر ہم دارالعلوم ندوۃ العلماء کو مولانا کی زندگی اور سرگرمیوں سے جدا کردیں تو بات تشنہ رہ جائے گی، کیونکہ آپ کو اسی ادارہ سے یہ فکری رہنمائی ملی تھی، ندوۃ العلماء نے یہ صدا لگائی کہ عربی زبان کتاب وسنت کے خزانوں کی شاہ کلید ہے، اور ہندوستانی مسلمانوں کو ان دونوں سے واقفیت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ عربی زبان کو ایک زندہ جاوید زبان کی حیثیت سے نہ پڑھیں گے، اس احساس کی بنا پر حضرت مولاناؒ نے عربی زبان میں کتابوں کے لکھنے کا سلسلہ شروع کیا، اور ادب اطفال سے لے کر بہت سے ادبی وعلمی موضوعات پر خالص علمی، تحقیقی اور تاریخی مطالعہ کی روشنی میں ہزاروں صفحات سیاہ کرڈالے۔

چنانچہ آپ کی سرپرستی میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی جانب سے بہت سی ایسی گرانقدر کتابیں منصۂ شہود پر آئیں جو تعلیم وتربیت، اسلامی تہذیب وتمدن کی وضاحت، مقاصد دین اور اسلامی زندگی کی تشریح، بحث وتحقیق کے معیار کی تصحیح، اور شریعت اسلامیہ کی حقانیت کو آشکارا کرنے میں بنیادی کردار ادا کررہی ہیں۔ آپ نے اس راہ میں عربی ادب کو ایک مؤثر ترین ذریعہ کے طور پر استعمال کیا اور یہ کام ایسے نامساعد حالات میں انجام دیا جب لوگ عربی زبان کو از کار رفتہ شمار کررہے تھے، اور اسے ایک مردہ اور زندگی سے محروم زبان سمجھ کر صرف فقہی واصولی کتابوں کے تنگ دائرے میں محدود کرنے پر زور صرف کررہے تھے، مگر آپ نے محض توفیق ربانی اور اپنی بلند حوصلگی کے ذریعہ اس زبان کے دائرہ کو وسیع کیا، حتی کہ اس کو زندگی کے مسائل، بحث ونظر، وعلم وفکر، تاریخ وتذکیر، تہذیب وتمدن، سماج وسوسائٹی، سیاسیات واقتصادیات اور عالمی مجالس سے مربوط کرکے دکھایا، اس راہ میں آپ نے زبان وقلم دونوں کا سہارا لے کر سلیس عربی زبان اور واضح اور فصیح اسلوب میں کتابوں کی تصنیف فرمائی، چنانچہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، آپ کے مبارک دور میں اگر ایک طرف علم وادب، اور دین وشریعت کا بلند مینار تھا تو دوسری طرف قلب

وقلم، ریشم وفولاد، وسیع علم اور پختہ ایمان کی جامعیت کا یکتائے روزگار نمونہ تھا۔

اسی جامع ومعتدل تخیل کی بنا پر حضرت مولاناؒ نے فکر وادب اور تمدن وثقافت کے مراکز میں آئے دن تبدیلیوں، اور مادی افکار ونظریات والے ممالک کی جدید تہذیبوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نصاب درس میں قدیم صالح اور جدید نافع کے اصول کے مطابق تبدیلیاں کیں، تاکہ ایک عالم دین اپنے گردوپیش کی دنیا، اور آئے دن کی فکری وعلمی وتہذیبی تبدیلیوں اور چیلنجوں سے باخبر ہوکر اللہ کی شریعت کی جانب سے دفاع کا فریضہ انجام دے سکے، اور اس پر لوگوں کا مکمل اعتماد بحال کر سکے۔ اور اسے دنیا وآخرت کی سعادتوں کے درمیان ایک رابطہ بنا سکے، چنانچہ آپ نے اسلامی ممالک کی دیگر یونیورسٹیوں کے طرز پر عربی زبان وادب کی تعلیم کے لئے کتابوں کی تصنیف کے ذریعہ اپنا مستقل تربیتی کورس تیار کرایا۔ ''قصص النبیین''، القرأۃ الراشدۃ''، ''مختارات من أدب العرب''، منثورات من أدب العرب''، جیسی مایہ ناز کتابیں زبان وادب اور بہترین اسلوب بیان کی ایسی عدیم النظیر مثالیں ہیں جنہوں نے ہندوستان کے دو رآخر کے مصنفین کے لئے مشعل راہ کا کام دیا، اور عربی زبان کے زندہ جاوید زبان ہونے کا بین ثبوت دے کر ان کے ایمان ویقین میں اضافہ کا سامان فراہم کیا۔

آپ کے عظیم ادبی کارناموں میں یہ بھی ہے کہ آپ نے عربی ادب کو یاس وقنوطیت اور گمنامی کی فضا سے نکال کر زندگی کے متحرک شعبوں میں داخل کیا، اور ادب وانشاء کے بہترین نمونوں کو یکجا کر کے اس کے متعدد گلدستے پیش کئے، اور عربی ادب کی ہر صنف کے اصول وضوابط متعین فرما کر اس کی فنی وتعبیری خوبیوں سے لوگوں کو روشناس کرایا، جس کی وجہ سے ہندوستان میں عربی ادب کی دنیا میں ایک انقلاب آیا، کیونکہ کچھ عرصہ قبل یہ چیز یہاں کے علمی حلقوں کے لئے نامانوس شئی اور ان کے تصور سے باہر تھی، آپ کی بڑی خواہش تھی کہ لوگ ہندوستان میں عربی زبان وادب کو سیکھیں، اور یہاں کے اسلامی تعلیمی مدارس ومراکز، صرف اصول فقہ اور نحو وصرف وغیرہ کی محدود اور تنگ فضا اور خالص نصابی

کتابوں کی سطح سے بلند ہوکر کتابت وخطابت اور صحافت کے آفاقی حدود میں داخل ہوں اور عربی زبان کو ایک طاقتور ذریعہ بنا کر زندگی کے تمام حساس میدانوں میں نمایاں طور پر حصہ لیں، تاکہ اس کے ذریعہ قرآن مجید اور احادیث رسول اللہ ﷺ سے ان کا رابطہ مضبوط ہو، اور اس میں کوئی شک باقی نہ رہ جائے کہ یہ دونوں سرچشمے فصیح عربی زبان، ادب وانشاء فنی جمال، حسن تعبیر، بہترین اسلوب اور اعلیٰ طرز بیان کے شاہکار ہیں۔

اس احساس کی بنا پر آپ نے ادب اطفال سے لے کر درجات عالیہ وعلیا تک کے طلباء کے لئے نہایت مفید ادبی لٹریچر تیار کیا، جوئی نسل کے دلوں میں عربی زبان کی مقبولیت ومحبوبیت کا سامان فراہم کرنے میں بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں، چنانچہ آپ کی شہرۂ آفاق کتاب ''مختارات من ادب العرب'' (دوجلدوں میں) اعلیٰ ادبی ذوق پیدا کرنے میں قدیم وجدید ادبی کتابوں کے مابین اپنے موضوع کی بہت ہی معتمد علیہ کتاب ہے، جو فنی نثر اور ادبی سرمایہ کے اعلیٰ نمونوں سے پُر ہے۔

آپ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اسلامی عربی صحافت کی طرف بھی ایک کامیاب انقلابی قدم اٹھایا، چنانچہ اپنے بعض شاگردوں اور عزیزوں کو عربی زبان میں ایک اسلامی ادبی دعوتی مجلّہ شائع کرنے کی ترغیب دی، اللہ عزوجل نے اس اقدام کو توفیق سے نوازا، جس کے نتیجہ میں اکتوبر ۱۹۵۵ء میں ''البعث الاسلامی'' نامی ایک علمی، فکری ودعوتی مجلّہ ماہنامہ کی شکل میں عالم اسلام کے افق پر طلوع ہوا، اور پھر اس کے چار سال بعد جون ۱۹۵۹ء میں ''الرائد'' نامی ایک پندرہ روزہ جریدہ شائع ہوا، ان دونوں پرچوں نے خالص اسلامی، عربی صحافت کی بھرپور نمائندگی کی، چنانچہ ہندو بیرون ہند کے علماء وفضلاء، ادباء اومشاہیر نے اس اقدام کی بہت تعریف کی، ان دونوں پرچوں کے شائع ہونے سے قبل دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے ''الضیاء'' نام کا عربی اسلامی ماہنامہ مجلّہ منصۂ پر آیا تھا، اور اس نے ہندوستان میں عربی اسلامی صحافت کا بیج ڈال کر پوری دنیا کے علمی، ادبی صحافتی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کیا تھا۔

ہندوستان میں عربی زبان وادب کی ترویج کے لئے حضرت مولاناؒ کی یہ کوششیں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ مقصدیت کی روح سے معمور تھیں اور اگر یہ کہا جائے تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا کہ ہندوستان میں عربی زبان وادب کی جو بھی، جس شکل میں بھی، اور جہاں کہیں بھی کوئی متاع پائی جارہی ہے وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور اس کے مخلص مردانِ حق کا فیض اور انہیں کے آفتاب علم وعمل کا پرتو ہے۔

اس موقع پر ہم اس جانب بھی اشارہ کردینا مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرت مولاناؒ نے عربی ادب کا ایسا معتدل اور سنجیدہ اسلوب اختیار کیا جسے ''اسلوب الدعوۃ'' اور ''ادب الدعاۃ'' کا نام دینا بالکل مناسب ہے، اور عصر حاضر کا کوئی مؤرخ جدید عربی ادب کی تاریخ لکھتے وقت اس اعلیٰ اسلوب سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

بحیثیت ناظم ندوۃ العلماء

(ولادت ۱۹۲۹ء)

۲۲ رمضان ۱۴۲۱ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ تقریباً ۸۶ سال کی عمر میں رفیق اعلیٰ سے جا ملے، یہ جمعہ کا دن تھا، اور نماز جمعہ کا وقت بھی قریب تھا، حضرت مولانا نے حسب معمول نماز جمعہ کی تیاری میں، غسل کر کے، نئے کپڑے پہن کر اور خوشبو سے معطر ہو کر سورہ یٰسین کی تلاوت شروع کی تھی کہ اچانک آیت نمبر (۱۱) (انما تنذر من اتبع الذکر وخشی الرحمٰن بالغیب فبشرہ بمغفرۃ وأجر کریم" ادا ہوتے ہی روح ایمانی عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اور چند لمحے میں یہ خبر پورے عالم میں مختلف تیز رفتار الکٹرانک ذرائع سے پھیل گئی اور ایک عجیب وغریب عزا اور غم کی فضا پورے ماحول پر چھا گئی، تعزیت کرنے والے اور آخری دیدار کے لئے لوگ تکیہ کلاں پہونچنا شروع ہوئے اور شام ہوتے ہوتے انسانوں کا ایک سمندر وہاں پر موجزن تھا، تکیہ کی مسجد کے بعض خدام سے حضرت مولانا نے نماز جمعہ سے کچھ پہلے یہ بھی کہا تھا کہ آج نماز جمعہ کچھ مؤخر کی جاسکتی ہو تو کرالی جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حادثۂ وفات کی وجہ سے نماز جمعہ ذرا تاخیر سے ہوئی، شاید یہ ایک رجل مومن کی فراست تھی کہ ان کو اپنے آخری وقت کا ادراک ہو گیا تھا، اور شاید یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس جمعہ کو ہمیشہ سے زیادہ نماز کی تیاری میں اپنی معذوریوں کے باجود وقت صرف

کیا،عشاء اور تراویح کے بعد نماز جنازہ ہوئی،مولانا کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب نے نماز پڑھائی،مسجد اور تکیہ کے پورے میدان میں کوئی ایسی جگہ باقی نہ رہ گئی تھی، جہاں نماز جنازہ ادا کرنے کے لئے لوگ موجود نہ ہوں، بلکہ راستے،سڑک اور چھتوں پر بھی لوگوں نے نماز ادا کی،اور پوری رات دعا وتلاوت اور نوافل میں اکثر لوگوں نے گزار دی،اور بہت سے لوگ سحری کے وقت تک وہاں مقیم رہے،دوسرے ہی دن شام کو حضرت مولانا کے محبّ خاص اوران کے شاگرد عزیز حضرت مولانا سید عبداللہ عباس صاحب ندویؒ مکہ مکرمہ سے تشریف لائے اور تعزیت واظہار غم کے بعد انھوں نے اپنے منصب،معتمد تعلیم ندوۃ العلماء کی بناء پر مجلس نظامت کا جلسہ طلب فرمایا،جو ممبران ملک سے باہر تھے ان سے رابطہ قائم کر کے منصب نظامت ندوۃ العلماء اور اہتمام دارالعلوم کے لئے رائے حاصل کر لی،بقیہ ممبران نے مجلس نظامت منعقدہ قیام گاہ حضرت مولانا میں شرکت فرمائی، اور باتفاق رائے طے ہوا کہ ناظم ندوۃ العلماء کیلئے سب سے زیادہ موزوں شخصیت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی ہے،منصب اہتمام کے لئے جو نام مجلس نظامت میں حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی نے پیش کیا،اور اس پر جملہ ممبران مجلس نے اتفاق کیا وہ اس ناچیز کا تھا،اور معذرت بسیار کے بعد بھی حکماً اس فیصلہ کو قبول کرنا پڑا اور الحمدللہ بزرگوں کی دعاؤں سے ابتک یہ سلسلہ جاری ہے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب بچپن ہی سے مفکر اسلامؒ کے زیر تربیت رہے،اور بعد میں حضرت مولانا کے ذاتی سکریٹری کی حیثیت اختیار کر لی،اب حضرت مولانا ہر معاملہ میں آپ کو شریک رکھتے تھے،سفر وحضر ہر جگہ رفاقت حاصل تھی،ہندو بیرون ہند کے اسفار میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب صرف رفیق ہی نہیں ہوتے ،بلکہ جملہ امور اور معاملات کے ذمہ دار بھی ہوا کرتے تھے،بہت سے نازک مسائل میں صحیح مشورے عنایت فرماتے تھے اور حضرت مولانا نہایت انشراح کے ساتھ قبول فرمایا کرتے تھے،بعض دفعہ کسی طے شدہ معاملہ میں کوئی منفی پہلو نظر آتا تو فوراً ہی اس کی تلافی

کی کوشش فرماتے تھے، اور بعد میں معلوم ہوتا کہ اس سے صرف نظر کرنا بہت ضروری تھا۔

۱۹۵۰ء عیسوی میں ایک دعوتی اور تبلیغی دورہ میں پورے وفد کے ساتھ حضرت مولانا کی معیت میں حجاز مقدس تشریف لے گئے اور وفد کو مفید تر بنانے میں بڑا کارنامہ انجام دیا، اگرچہ حضرت مولاناؒ اپنے چند رفقاء کے ساتھ مصر وسوڈان اور شام وفلسطین کے دورے پر گئے اور ایک عرصہ کے بعد واپسی ہوئی، اس سفر میں بھی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی مدظلہ کا مفید مشورہ شامل تھا، حجاز کے دعوتی اور تبلیغی دورہ سے واپسی کے بعد آپ دارالعلوم میں استاذ ادب کی حیثیت سے مقرر ہوئے اور دوسرے سال سے ادب کی اونچی کتابیں بھی پڑھانا شروع کیا، تخصص ادب کے درجے میں آپ نے ادب وبلاغت اور انشاء کے استاذ کی حیثیت سے بہت مفید خدمات انجام دیں، اور طلبہ میں عربی زبان وادب کا ایک نیا جذبہ اور شوق پیدا ہوا، پھر ۱۹۵۴ء میں حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی ادیب اول دار العلوم سعودی عرب چلے گئے اور وہاں حکومت سعودیہ نے ان کو "الاذاعۃ السعودیۃ کے مشرقی شعبہ کے انچارج کے عہدہ پر مقرر کردیا، تو مجلس نظامت نے مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب کو ادیب اول کے منصب پر فائز کیا، اس کے بعد عربی زبان وادب کے شعبے میں برابر پیش رفت ہوتی رہی، نصاب میں بھی دور حاضر کے معروف ادباء کی کتابیں رکھیں گئیں، عربی دواوین کا اضافہ ہوا، اور ہر اعتبار سے نصاب تعلیم کو مفید سے مفید تر بنانے کا عمل مولانا کی کوششوں سے اور حضرت مولانا علی میاںؒ کی سرپرستی میں جاری رہا، حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی انتہائی انہماک اور دوراندیشی کے ساتھ حضرت مولاناؒ کے ساتھ جملہ تعلیمی اور انتظامی امور میں مشورہ عنایت فرماتے تھے اور حضرت مولانا کی منظوری سے ان پر عمل ہوا کرتا تھا، اس طرح آپ حضرت مولاناؒ کے خاص سکریٹری اور مشیر کا درجہ رکھتے تھے۔

ملک کے باہر اور اکثر اندرون ملک کے سفروں میں بھی حضرت مولاناؒ کے مرافق خاص کی حیثیت سے آپ ہمیشہ ساتھ رہتے تھے اور حضرت مولانا کو آپ سے بہت قیمتی مدد ملتی تھی اور سفر کے بہت سے اہم معاملات میں مشورہ بھی کیا کرتے تھے، خاص

طور سے عرب ممالک اور بعض دیگر ملکوں میں آپ ہی رفیق سفر ہوا کرتے تھے، سعودی عرب کا سفر ہو، یا مصر و شام کا، ترکی کا سفر ہو یا یورپ و امریکا کا، ہر جگہ آپ کی رہنمائی اور مشورے حضرت مولانا کے لئے انتہائی باعث اطمینان ہوا کرتے تھے۔

۱۹۷۷ء میں آنکھوں کی تکلیف کا علاج کرانے کے لئے جب حضرت مولانا کا سفر امریکہ ہوا تو آپ ہی رفیق خاص تھے، اور پوری مدت آپ حضرت مولانا کو اطمینان وخوشی عطا کرتے رہے، وہاں کے لوگوں سے ملاقاتوں اور دیگر شہروں میں جانے اور مسلم مراکز اور دینی ثقافتی تنظیموں سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے ملنے کا پروگرام بھی آپ ہی کے ذریعہ طے ہوا کرتا تھا، اور حضرت مولانا کی فکر ومزاج کے مطابق سارے امور پر غور فرماتے تھے، اس طرح حضرت مولانا کی اپنی دعوتی، علمی اور اجتماعی فکر کی پوری نمائندگی آپ نے ہمیشہ کی اور اب وہی فکر آپ کی امتیازی شان بن چکی ہے، اور اس کو حالات وزمانے کے مطابق مزید پختگی کے ساتھ نافذ فرماتے ہیں، اس موقع پر مجھے اس بات کو پوری ذمہ داری کے ساتھ بیان کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے سچے جانشین اور ان کی فکر دین ودنیا کے حامل، اور علمائے ندوۃ العلماء کی جامعیت کے مکمل نمائندے ہیں، اور حضرت مولانا کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے خلاء کو پر کرنے میں آپ کی شخصیت پوری طرح نمایاں ہے، اس عرصہ میں آپ نے تصنیف وتالیف اور تعلیم وتربیت، دعوت وتبلیغ کے میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں اور جن کا سلسلہ برابر جاری ہے، وہ فکر ابوالحسن کی مکمل نمائندگی کرتی ہیں، اور کچھ عرصہ سے مطالعہ قرآن وحدیث کے نتیجہ میں آپ کے قلم سے قرآن کریم اور سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر دو اہم کتابیں منصۂ شہود پر آئی ہیں اور مختلف زبانوں میں ان کا ترجمہ بھی ہوا ہے، اس موضوع پر آپ کی مجلس میں گفتگو کا ایک نمونہ پیش کر رہا ہوں:

''قرآن وسنت پر عمل کرنا ہی دعوت الحق کے اجتماعات، دین کی تصحیح، اور لوگوں کی اصلاح کرنے اور عوام الناس کو برائی سے بچانے کیلئے

بے حد مفید اور بہت موثر ہے، ان کی بڑی اہمیت ہے اس کے لئے مدارس اس لئے قائم کرائے جاتے ہیں، تاکہ دین پر صحیح طریقہ سے عمل کرنے والے پیدا ہو جائیں، یہی علمائے دین کی دعوت کا نتیجہ ہے، جو آج ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں، لہٰذا اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور اپنی کمزوری کو دور کرنا چاہئے، اگر ہم نے فکر نہ کی تو اس میں ہمارا نقصان ہے، لوگ ہم پر ہنسیں گے کہ ان کو دین پر صحیح طریقہ سے عمل کرنا بھی نہیں آتا، مثلاً کوئی شخص جسکو اردو نہیں آتی اور نہ اس نے کبھی اردو سیکھی ہے اگر بغیر سیکھے وہ اردو بولے گا تو صحیح نہیں بولے گا، اور لوگ اس پر ہنسیں گے، اسی طرح یہ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے، اس کو بغیر سیکھے کیسے پڑھ سکتے ہیں، کیسے اس کی ادائیگی کر سکتے ہیں، اگر ہم لوگ قرآن کریم کو صحیح ادائیگی کے ساتھ نہیں پڑھیں گے اور نماز کو بے توجہی سے پڑھیں گے تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں اور پھر وہ ہم کو سزا دیں، یہ بات الگ ہے کہ وہ ہم کو معاف کریں یہ تو اس کی مہربانی ہے، لیکن قرآن کریم کو غلط پڑھنا اور نمازوں کو غفلت کیساتھ پڑھنا، خدا کی ناراضگی کا سبب ہے، اگر کوئی شخص ہم کو ایک گلاس پانی پلا دیتا ہے تو ہم اس کے کتنے احسان مند ہوتے ہیں، اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں، لیکن جس اللہ نے ہم کو پانی دیا، کھانے کو دیا، گرمی اور سردی میں بچاؤ کا ہمارے لئے انتظام کیا، اس کے باوجود کیا ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں؟ کم سے کم زبان سے تو اسکا شکر ادا کر دینا چاہئے، اور نماز اور تلاوت کو صحیح طریقہ پر ادا کر کے اس کا احسان بجالانا چاہئے''۔

اس کے علاوہ دیگر علمی، ادبی، فکری، دعوتی اور اجتماعی موضوعات پر آپ کی کتابیں بڑی تعداد میں مقبول خاص و عام ہو چکی ہیں اور خراج تحسین واستفادہ حاصل کر چکی ہیں، اسی کے ساتھ حضرت مولانا علی میاںؒ کی قائم فرمودہ عالمی ادبی تنظیم ''رابطہ ادب اسلامی'' جس کا

قیام انتہائی عظیم مقصد سے، ۱۹۸۱ء میں مکہ مکرمہ میں ہوا تھا، ادب کو اس کے صحیح راستے پر لانے اور با مقصد بنانے کے لئے ایک اہم ترین ضرورت تھی، اس کے قیام کے اول دن سے آپ بانی رابطہ کے ساتھ اس کے ہر اجتماع، اس کی جملہ سرگرمیوں اور سیمیناروں میں شرکت کرنے اور ان کے ذریعہ ادب کا صحیح اسلامی پیغام حلقہائے ادب میں پہونچانے کا فریضہ انجام دیتے رہے، اور آج بھی عالمی رابطہ ادب اسلامی برائے ہندوپاک اور مشرقی ایشیاء کا دفتر ندوۃ العلماء کے ماتحت آپ کی سرپرستی میں پوری طرح سرگرم ہے، اور ندوۃ العلماء کے قیام کا ایک اہم مقصد اس سے پورا ہو رہا ہے، ایک موقع پر آپ نے ندوۃ العلماء کے قیام کے مقصد کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''ندوۃ العلماء کا مقصد یہ ہے کہ خود تو درست ہوں ہی، دوسروں کی اصلاح، ان کو راہ راست پر لانے کی بھی کوشش کریں، ندوہ صرف اس لئے نہیں قائم ہوا کہ صرف دین کا علم حاصل کریں، بلکہ ایسے افراد تیار کرنا ہے جو عصری و دینی علوم کے جامع بن کر دنیائے انسانیت کی قیادت و رہبری کا فریضہ انجام دے سکیں، تو واقعی سوچنے کی ضرورت ہے کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟ ایک نہ ایک دن حقیقت سامنے آ ہی جائے گی اور خالق کائنات تو ہر چیز سے واقف ہیں، ان سے چھپانے کا تو سوال ہی نہیں ہوتا۔

ندوہ اور اس کا دارالعلوم اس لئے قائم ہوا تھا کہ دین کا علم حاصل کیا جائے، اور دنیا کا بھی، اور حضور ﷺ کی نیابت کا فریضہ، زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات اور انقلابات کو سامنے رکھ کر انجام دیا جائے، اسلامی تاریخ میں ایسی شخصیتیں بار بار پیدا ہوتی رہی ہیں، جنہوں نے اس زمانہ کے لحاظ سے وسائل اختیار کئے اور دین کی خدمت کی، پورے کے پورے علاقے اور آبادیوں کو یکسر بدل ڈالا اور دنیا سعادت و فلاح سے ہمکنار ہوگئی، خدا ہمارے

نوجوانوں کو اخلاص عطا فرمائے، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور اس کے فرزندوں کو خالص اپنی رضا کیلئے قبول فرمائے اور تمام شرور وفتن اور نظر بد سے محفوظ رکھے۔'' (ملفوظات مرشد الامت ص/ ۱۲۹)

آپ نے دارالعلوم میں النادی کو زیادہ بامقصد بنایا اور مختلف النوع عربی زبان وادب کی مشق کے لئے پروگرام تیار کرائے، اور اساتذہ کرام کو النادی کے جلسوں کی سرپرستی کرنے کا مشورہ دیا، اور اب اس میں مزید توسیعی پروگرام، انعامی مسابقات اور حفظ اشعار اور اس کے انعامی جلسے منعقد کرنے میں دارالعلوم کے ذمہ داروں کو مشورہ عنایت فرمایا، اس کی وجہ سے النادی العربی ایک عربی مشق وتربیت کا ادارہ بن کر باعث تقویت ہوا، اسی غرض سے ۱۹۵۹ء میں الرائد نامی پندرہ روزہ عربی زبان میں جاری کیا اور اس کی نسبت النادی العربی کی طرف کی، آج الحمدللہ ندوہ کے ایک آرگن کی حیثیت سے معروف ہے، اور نہ صرف طلبہ بلکہ عربی سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کیلئے ایک معلم ومربی کی حیثیت رکھتا ہے، آپ ۱۹۹۳ء میں منصب اہتمام پر فائز ہوئے اور ۲۰۰۰ء شروع ہونے تک دارالعلوم کے مہتمم کی حیثیت سے اس منصب پر برقرار رہے، یہانتک کہ آپ حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ندوۃ العلماء کے ناظم اعلی مقرر ہوئے، اللہ تعالی اس مدت کو زیادہ سے زیادہ دراز فرمائیں۔

اسی کے ساتھ طلبائے دارالعلوم کی نہلی اور علمی ودینی ترقی کیلئے اور الاصلاح کے پروگراموں کی مزید حوصلہ افزائی فرمائی۔

۱۹۵۵ء میں جب حضرت مولاناؒ کی منظوری سے ماہنامہ عربی رسالہ البعث الاسلامی اس کے مدیر اعلیٰ مولانا سید محمد الحسنی صاحبؒ کی ادارت میں نکلا تو آپ نے اس کی پوری سرپرستی کی اور مفید مشوروں سے نوازا، اس وقت سے اب تک البعث الاسلامی میں آپ کے قیمتی مضامین شائع ہوتے ہیں، اور اسکے صحافتی معیار کو بلند کرتے ہیں۔

ندوۃ العلماء کے دارالعلوم کے ساتھ ملک اور بیرون ملک کے ڈھائی سو سے

زائد مدارس کا الحاق ہوا، اس کی پوری اسکیم آپ نے تیار کی اور اس کو مجلس انتظامیہ سے حضرت مولانا علی میاں رحمہ اللہ نے منظور کرائی، نیز معہد ثانوی دار العلوم آپ ہی کے دور اندیشانہ فیصلہ سے سکروری میں قائم ہوا، اور ثانویہ درجات کے درجہ سادسہ تک پورا کر کے وہاں سے طلبہ دار العلوم کے درجۂ عالیت کے سال اول عالیہ اولی میں داخل ہوتے ہیں، اور اپنی تعلیم مکمل کرتے ہیں۔۔

اس وقت ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے اپنی جملہ ذمہ داریوں کی ادائیگی اور ندوۃ العلماء کے مقاصد عالیہ میں مزید پیش رفت کیلئے اپنے بیش قیمت اوقات کو بتوفیق الٰہی صرف فرما رہے ہیں : اللهم أيده بروح من عندك ۔(آمین)۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ مسلم کمیونٹی کے شرعی اور جملہ دینی و دنیاوی مسائل پر غور وخوض کرنے اور ان کا حل شریعت اسلامیہ کی روشنی میں تلاش کرنے کے لئے ۱۹۷۲ء میں قائم ہوا، اس کے سب سے پہلے صدر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ منتخب ہوئے، ان کے بعد مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو بالاتفاق صدر منتخب کیا گیا، اور پھر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب رحمہ اللہ منصب صدارت پر جلوہ افروز ہوئے، قاضی صاحب کی وفات کے بعد بورڈ کے جملہ ارکان کے شدید اصرار پر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب منصب صدرات پر فائز ہوئے، اور آپ کے عہد میں بورڈ زیادہ فعال اور مستحکم ہوا، اور کئی بنیادی فیصلے صادر ہوئے، جن کا تعلق مسلمانان ہند کے اسلامی تشخص اور وجود کو برقرار رکھنے سے تھا، الحمد للہ آپ کی قیادت میں بورڈ کی سرگرمیاں مثبت انداز سے پوری طرح جاری ہیں۔

اختتامیہ

اب ہم غور کریں تو ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا کچھ دشوار نہیں ہوگا کہ اسلامی ثقافت کا ایک وسیع مفہوم ہے، ان تمام ضروری علوم وفنون اور آداب وافکار کا جو ایک عالم دین، ایک داعیٔ اسلام، ایک مربی، ایک استاذ، ایک شیخ اور ایک اسلام کے سچے نمائندے کے لئے ناگزیر ہے، ہماری ثقافت میں اپنے گردوپیش کے واقعات وحالات کا بھی دخل ہونا چاہئے، دنیا میں جو سیاسی، سماجی، تمدنی، اقتصادی اور نظریاتی حالات موجود ہیں، ان پر ایک حدتک ہماری نظر ہونا ضروری ہے، تاکہ ہم کو نتائج کے اخذ کرنے اور اپنی فکر کو پیش کرنے اور اپنے عمل کو بروئے کار لانے میں کسی خاص زحمت و پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے، اور ہم پوری طرح حالات وواقعات کو سامنے رکھ کر فکر وعمل کی راہیں متعین کرسکیں۔